خصوصی اشاعت

حکمت اقبال

ہی

نظریۂ پاکستان

ہے

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ

!اور ہم نے قرآن کو سمجھنے کے لیے آسان کر دیا ہے تو کوئی ہے کہ سوچے، سمجھے

جلد 9	شمارہ 11	محرم الحرام 1437ھ	نومبر 2015ء

ISSN 2305-6231

ماھنامہ

حکمتِ بالغہ

جھنگ

مدیر مسئول : انجینئر مختار فاروقی

مشاورت

ڈاکٹر محمد سعد صدیقی

حافظ مختار احمد گوندل

پروفیسر خلیل الرحمٰن

محمد فیاض عادل فاروقی

مدیر معاون ونگران طباعت: مفتی عطاء الرحمٰن

تزئین وگرافکس: جواد عمر

قانونی مشاورت:

محمد سلیم بٹ ایڈووکیٹ، چودھری خالد اختر ایڈووکیٹ

ترسیل زر بنام: انجمن خدام القرآن رجسٹرڈ جھنگ

اس شمارے کی قیمت 220 روپے

اہل ثروت حضرات کے لیے تاحیات زرِتعاون سترہ ہزار روپے یکمشت

سالانہ زرتعاون: اندورنِ ملک 400 روپے، قیمت فی شمارہ 40 روپے

قرآن اکیڈمی جھنگ

لالہ زار کالونی نمبر 2، ٹوبہ روڈ جھنگ صدر پاکستان پوسٹ کوڈ 35200

047-7630861-7630863

ای میل: hikmatbaalgha@yahoo.com

ویب سائٹ: www.hikmatbaalgha.com

www.hamditabligh.net

پبلشر: انجینئر مختار فاروقی طابع: محمد فیاض مطبع: سلطان باہو پریس، فوارہ چوک، جھنگ صدر

اَلْکَلِمَۃُ الْحِکْمَۃُ ضَآلَّۃُ الْمُؤْمِنِ فَحَیْثُ وَجَدَھَا فَھُوَ اَحَقُّ بِھَا (ترمذی)

حکمت کی بات بندۂ مومن کی گم شدہ متاع ہے جہاں کہیں بھی وہ اس کو پائے وہی اس کا زیادہ حق دار ہے

مشمولات

1	قرآن مجید کے ساتھ چند لمحات		3
2	حرفِ آرزو	انجینئر مختار فاروقی	7
3	باب1		13
4	باب2		51
5	باب3		95
6	باب4		121
7	باب5		143
8	باب6		175
9	باب7		189
	باب8		197
	باب9		205
	باب10		219
	ضمیمہ جات		229

یہ رسالہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو حوالہ ڈاک کر دیا جاتا ہے۔ نہ ملنے کی صورت میں 6 تاریخ تک دفتر رابطہ فرمائیں (ادارہ)

قرآن مجید

کے ساتھ

چند لمحات

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(سورۃ آلِ عمران :103-104)

وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا

اور سب مل کر اللہ کی (ہدایت کی) رسی کو مضبوط پکڑے رہنا اور متفرق نہ ہونا

وَ اذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً

اور اللہ کی اس مہربانی کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے

فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖ اِخْوَانًا

تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی

اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی ہو گئے

وَ کُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَۃٍ مِنَ النَّارِ فَاَنْقَذَکُمْ مِنْھَا

اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ چکے تھے تو اللہ نے تم کو اس سے بچا لیا

کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ اٰیٰتِہٖ لَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ O

اس طرح اللہ تم کو اپنی آیتیں کھول کھول کر سناتا ہے تاکہ تم ہدایت پاؤ

وَ لۡتَکُنۡ مِّنۡکُمۡ اُمَّۃٌ یَّدۡعُوۡنَ اِلَی الۡخَیۡرِ

اورتم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جولوگوں کوقرآن کی طرف بلائے

وَ یَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ یَنۡھَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ

اوراچھے کام کرنے کا حکم دےاوربُرے کاموں سے منع کرے

وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ o

یہی لوگ ہیں جونجات پانے والے ہیں

سورۃ الصف :8-9

یُرِیۡدُوۡنَ

یہ(یہودونصاریٰ ومشرکین)چاہتے ہیں

لِیُطۡفِـُٔوۡا نُوۡرَ اللّٰہِ بِاَفۡوَاھِھِمۡ

کہ اللہ(کے چراغ) کی روشنی کومنہ سے(پھونک مارکر)بجھادیں

وَ اللّٰہُ مُتِمُّ نُوۡرِہٖ وَ لَوۡ کَرِہَ الۡکٰفِرُوۡنَ o

حالانکہ اللہ اپنی روشنی کو پورا کرکے رہے گا خواہ کافرناخوش ہی ہوں

ھُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡھُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ

وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کوہدایت اوردین حق دے کربھیجا

لِیُظۡھِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ وَلَوۡ کَرِہَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ o

تاکہ اسےاورسب دینوں پرغالب کرے

خواہ مشرکوں کوبراہی لگے۔

(سورۃ النحل :43-44)

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِیۡۤ اِلَیۡھِمۡ

اورہم نے آپ سے پہلے مردوں ہی کوپیغمبر بنا کربھیجا تھا

جن کی طرف ہم وحی بھیجا کرتے تھے

فَسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ O

اگر تم لوگ نہیں جانتے تو یاد رکھنے والوں سے پوچھ لو

بِالْبَيِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ

(اور ان پیغمبروں کو) دلیلیں اور کتابیں دے کر (بھیجا تھا)

وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ

اور ہم نے تم پر بھی یہ کتاب نازل کی ہے تا کہ جو

(ارشادات) لوگوں پر نازل ہوئے ہیں وہ ان پر ظاہر کر دو

وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ O

اور تا کہ وہ غور کریں

سورة الكوثر 108

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ

(اے محمد) ہم نے آپ کو کوثر عطا فرمائی ہے

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ

تو آپ اپنے پروردگار کے لیے نماز پڑھا کرو اور قربانی کیا کرو

اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ

کچھ شک نہیں کہ تمہارا دشمن ہی بے نام ونشان رہے گا

صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْم

حضرت رِبعی بن عامر رضی اللہ عنہ نے رستم کے دربار میں اس کے اس سوال پر کہ تم یہاں کس لیے آئے ہو؟ جواب دیا تھا کہ

اَللّٰہُ ابْتَعَثَنَا لِنُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَی النُّوْرِ، وَ مَنْ شَاءَ مِنْ عِبَادَةِ الْعِبَادِ اِلٰی عِبَادَةِ اللّٰہِ وَحْدَہ، وَمِنْ ضِیْقِ الدُّنْیَا اِلٰی سَعَتِھَا، وَ مِنْ جَوْرِ الْاَدْیَانِ اِلٰی عَدْلِ الْاِسْلَامِ

اللہ نے ہمیں بھیجا ہے تا کہ ہم لوگوں کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئیں اور اس شخص کو جو چاہتا ہو بندوں کی بندگی سے نکال کر ایک اللہ تعالیٰ کی بندگی کی طرف لے آئیں، اور دنیا کی تنگی سے نکال کر اس کی وسعت کے طرف لے آئیں اور مذاہب (باطلہ) کے ظلم سے نکال کر دینِ اسلام کے عدل کے طرف لے آئیں۔

(السیرۃ النبویۃ منھجیۃ دراستھا واستعراض أحداثھا)

حرفِ آرزو

انجینئر مختار فاروقی

01۔ حکمت بالغہ کا یہ شمارہ، پاکستان کے اسلامی اور نظریاتی تشخص کی بحالی کے لئے ـــــ کرنے کے 'اصل کام' کی تلاش کی سعی کے بیان پر مشتمل ہے۔ اس ضمن میں اصولی طور پر تاریخی حوالے سے فلاحی ریاست کے تصوّر کے ارتقاء اور مدارج کا تذکرہ بھی آ گیا ہے اور تاریخ کے صفحات میں موجود عظیم حکمرانوں اور عظیم سلطنتوں کے تذکار بھی آ گئے ہیں اور ایسی 'دنیاوی چمک دمک والی حکمرانی' کی انسانی فلاح و بہبود کے حوالے سے حقیقی حیثیت کی نشاندہی بھی ہوگئی ہے۔

02۔ تاریخ کے اسی بہاؤ میں پندرہ صدیوں پہلے ایک آسمانی مثالی فلاحی عوامی ریاست کا جو نقشہ مُحسنِ انسانیت ﷺ (فداہ آباؤنا وامّھاتنا) نے دنیا کے سامنے رکھا تھا جس کا بجا طور پر عنوان 'فقیر حکمران' یا 'درویش بادشاہ' ہی دیا جا سکتا ہے۔ یاد رہے کہ فقیر ـــــ کون ہے؟ ایک فقیر مجبوری کا فقیر ہے جو گلیوں بازاروں میں کچھ نہ کر کے مانگتا پھرتا ہے اور دوسرا فقیر اور فقر ـــــ وہ ہے جو اختیاری فقر ہے کہ وہ فقیر ـــــ سب کچھ کرنے اور کر سکنے کے باوجود خود طے کردہ اپنے راستے پر ایک اختیاری فیصلے کی وجہ سے فقیر بنا بیٹھا ہے۔ یہ فقر مطلوب فقر ہے اور اس فقر کی کیا اونچی شان ہے کہ اس فقر کی نسبت سیّدنا حضرت محمد ﷺ کی طرف ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: الفقر فخری ـــــ یہ (اختیاری) فقر میرا سرمایہ اور فخر ہے۔ ایسا فقر اختیار کرنا ہر حکمران کے بس کی بات نہیں۔ ایسا فقر تو ابوبکر و عمر و عثمان و علی رضی اللہ عنہم جیسا کردار رکھنے والے اور حوصلہ مند افراد کے حصے ہی میں آتا ہے اور یہ فقر تو نظریۂ توحید کے درجہ کمال تک پہنچنے کا ثمر ہے اور روح کا اللہ تعالیٰ

سے قرب اور معرفت کا نتیجہ ہے۔

03۔ نظریۂ پاکستان ـــــ بجز 'لا الٰہ الا اللہ' کے کچھ نہیں اور اس مقصد کے حصول کا عملی ذریعہ محمد رسول اللہ ﷺ ہیں کہ آپ نے ہی انسانیت کو (اور ہمیں) اللہ تعالیٰ کی معرفت کا راستہ دکھایا ہے اور اللہ تعالیٰ کی حقیقی پہچان وہ نہیں ہے جو انسان اپنی عقل اور چند اِدھر اُدھر کی سنی سنائی باتوں سے اخذ کرے بلکہ صرف اور صرف حضرت محمد ﷺ کی بتائی ہوئی باتوں میں ہی خدا کی حقیقی معرفت اور شان مضمر ہے اور توحید حقیقی بھی وہی ہے جو حضرت محمد ﷺ نے سمجھا دی ہے۔ یہ عظیم معرفت انسان کے روحانی تشخص کے اِدراک کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتی۔

روح کی بیداری سے معرفت خداوندی پیدا ہو ـــــ اللہ تعالیٰ کے احکام کی فرمانبرداری کا جذبہ پیدا ہو ـــــ خدا سے ملانے والی ہستی حضرت محمد ﷺ کے احسانات کا احساس، شعور اور تذکرہ ہو ـــــ درود شریف لب پر ہو اور آپ ﷺ کا اُسوہ ہمارا لائف سٹائل ہو ـــــ آپ کا اختیار کردہ فقر ہمارا زیور اور سنگھار ہو ـــــ تو ایسے ہی مثالی انسان حکمران بننے کے اہل ہیں۔ حکومت کے اہل وہ نہیں ہیں کہ جنہیں دو اپنے بندے ہی تائید کنندہ کے کالم میں دستخط کر کے آگے کر دیں بلکہ اس کے لئے توحید کو مان کر فقر تک کے کٹھن مراحل ہیں۔ تبھی آدمی ـــــ انسانیت کی حقیقی خدمت کرسکتا ہے۔

04۔ تحریک پاکستان اور قیامِ پاکستان کے لئے حقیقتاً بے شمار لوگوں نے قربانیاں دی ہیں اور 1001ھ کے بعد سے اسلام کے لیے (جنوبی ایشیا کے کسی کونے میں) دی گئی ہر شخص کی قربانی مسلمانوں کے آئیڈیل اور فطری ایک اسلامی فلاحی ریاست کے دورِ حاضر میں قیام کے لئے ہے جس پاک سرزمین کے لئے انسانیت نے کن کن مراحل سے گزر کر ـــــ 'قیامِ پاکستان' کو ممکن بنایا ہے۔

قائداعظم محمد علی جناح کا یہ جملہ گزشتہ بارہ صدیوں کے مسلمانوں کی دِلی آرزو کی صحیح ترین ترجمانی تھی اور ایک حقیقت کا اظہار تھا کہ 'ہند' میں پاکستان اسی دن قائم ہوگیا تھا جس دن یہاں پہلا شخص مسلمان ہوا تھا۔ بلاشبہ تاریخ پاکستان اور تحریک پاکستان کا نقطۂ آغاز یہی واقعہ ہی ہوسکتا ہے۔

05۔ اس پاکستان کے قیام کے لئے بیسویں صدی میں کئی چھوٹی بڑی علاقائی تحریکیں اُٹھیں اور سینکڑوں شخصیات اُبھریں، جن میں سے بعض شخصیات بڑی بڑی قد آور بھی ہیں اور ان کی خدمات کا اپنی جگہ ہر ایک کو اعتراف بھی ہے۔ مگر 1910ء سے لے کر قیامِ پاکستان تک جو ایک شخصیت جنوبی ایشیا کے تمام مسلمانوں کی ملکی سطح کے ہر مسئلے اور معاملے میں رہنمائی کرتی رہی، عملاً ان کی حمایت میں ساتھ رہی، جلوسوں، جلسوں اور احتجاجوں میں نظر آتی رہی ـــــ تقاریر کے علاوہ تحریر ـــــ خطبات اور شاعری سے مسلمان خواص وعوام کو پاکستان کے حصول کے لئے دیوانہ بنا دیا، جس نے عوامی سطح پر لوگوں کو متأثر کیا اور اعلیٰ عالمی علمی سطح پر بھی اسلام کی تشریح وتوحید کا حق ادا کیا، جس نے مسلمانوں میں سے موزوں ترین آدمی کو ڈھونڈھ کر نکالا اور اس کی قیادت میں کام کیا، جنہوں نے پاکستان کے قیام کی فلسفیانہ توجیہ پیش کی اور مستقبل کی اس ریاست کے خدوخال کی وضاحت کی، جنہوں نے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے دلوں اور زبانوں پر راج کیا، قیامِ پاکستان سے پہلے ہی نہیں ـــــ جو ہستی آج بھی مخلص مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن ہے ـــــ وہ شخصیت صرف اور صرف علامہ اقبال کی ہے۔ برطانوی وزیراعظم کے اعتراف کے مطابق جس واحد شخص نے تقسیم ہند کو ممکن بنایا وہ علامہ اقبال ہی ہیں۔

06۔ مغرب کے اسی نکتہ کے ادراک کا نتیجہ یہ نکلا کہ مغرب نے سوچا کہ اگر علامہ اقبال کی شخصیت اور ان کے افکار کو مسلمانانِ ہند کے ذہنوں سے محو کر دیا جائے تو پھر مسلمان بے مقصدیّت کا شکار ہو جائیں گے اور پاکستان بے یار ومددگار رہ کر ایک ناکام ریاست بن جائے گا اور ہماری بدقسمتی کے عملاً یہی ہوا اور علامہ اقبال کو ہمارے تعلیمی نصاب سے پرائمری لیول سے لے کر یونیورسٹی لیول تک سب جگہ سے نکال دیا گیا۔ آج کی اصطلاح میں علامہ اقبال

؎ چین و عرب ہمارا ، ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

یہ کہہ کر دنیا کا امن خراب کرتے ہیں اور دہشت گرد ہیں۔

07۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بڑا خوبصورت اور معنی خیز قول مبارک ہے۔ سوال کیا گیا کہ 'حق' کی پہچان کیا ہے (غالباً کسی جنگ کے سفر میں تھے) فرمایا کہ دشمن کے تیروں کی بوچھاڑ کا رُخ

جدھر دیکھو، وہی جگہ دشمن کے لئے اہم ہوگی اور وہیں 'حق' ہوگا۔ عالمی استعماری اور استبدادی غیر مسلم قوتوں نے (جو دراصل صہیونیت کی آلہ کار ہیں) جس طرح برطانوی ہند کے مسلمانوں کے تذکروں، تعلیمی نصاب اور حکومتی ایوانوں سے علامہ اقبال اور ان کے افکار کو دیس نکالا دیا ہے وہ کوئی راز نہیں ہے۔ عوامی سطح پر میڈیا اور ٹی وی پر کبھی ان کا کلام پیش بھی کیا جاتا ہے تو سازوں کے ساتھ بالعموم عورتیں گا رہی ہوتی ہیں اور مغربی موسیقی کی دھنوں پر جس سے ناظرین و سامعین میں پاپ میوزک کے اثرات تو شاید جنم لیتے ہوں ـــــ اخلاقیات، روحانیات اور نظریۂ پاکستان کے احیاء کی طرف ذہن میں کوئی خیال آجانا بعید از قیاس ہے۔

ان طبقات کی تو بس یہی کوشش ہے کہ علامہ اقبال کے افکار اور تذکروں کو عوامی سطح پر بھی قصۂ ماضی بنا دیں۔ مگر علامہ اقبال کے کلام کی تاثیر اور حقانیت کا جادو ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے اور علامہ اقبال ہر مسلک کے علماء کے لئے ایک مثال ہے کہ ہر اہم نفسیاتی، انسانی، فقہی مسئلے پر علامہ اقبال کے اشعار ہی زبان پر آتے ہیں تو بلا تکلف لوگ بولتے چلے جاتے ہیں۔ اس پر بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔

08۔ ہمارے نزدیک پاکستان کے تاریخی جغرافیائی، مذہبی اور سیاسی پس منظر میں مسلمانانِ پاکستان کسی مذہبی تشریح و توضیح یا کسی اجتماعی مسئلے (فقہی نہیں) میں اگر کسی ایک شخصیت پر اعتبار کر سکتے ہیں تو وہ شخصیت بلاشبہ علامہ اقبال کی شخصیت ہی ہے۔

09۔ جب یہ کہا جائے کہ مسلمانانِ پاکستان کے لئے بلالحاظ مسلک و مذہب و مشرب، قدیم و جدید علوم کے ماہرین سب کے لئے قابل قبول شخصیت کوئی ہے تو وہ علامہ اقبال کی ہے۔ لہٰذا، نظریۂ پاکستان ـــــ فکرِ اقبال یا حکمت اقبال ہی کا دوسرا نام ہے تو اس سے ہماری مراد مجموعی عمرانی فکر کے سماجی، اقتصادی اور سیاسی میدانوں میں جدید رجحانات، مثلاً اقتصادیات میں بنکوں کا نظام، جواء، سٹہ، شیئرز کا کاروبار وغیرہ یا سیاسی میدان میں حاکمیّت اعلیٰ کا تصوّر، عدلیہ، مقنّنہ، قانون سازی، مباحات کا دائرہ، مجلس شوریٰ یا قومی اسمبلی کے اراکین کی تعلیمی قابلیت اور ان کی عمر کا تعین جیسے معاملات ہیں یا مغربی علوم میں ڈارون تھیوری، کارل مارکس کا فلسفہ، لبرل ازم وغیرہ کے بارے میں علامہ اقبال کی آراء ہیں۔

علامہ اقبال کی فکر اور حکمت کو پاکستان کی ریاست کے اصول ونظریات میں سرکاری حیثیت دینے کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ باقی سب اہل علم وفضل ودانشور حضرات اور علمائے کرام گھر بیٹھ جائیں بلکہ مراد یہ ہے کہ جیسے کسی بڑے ادارے میں مرکز کی تعمیر یا کسی جگہ کسی مسجد کی تعمیر کا مسئلہ آتا ہے تو سب متعلقہ افراد کے سامنے کھلی گفتگو نہیں ہوتی اور اگر ہو بھی تو (اہل علم جانتے ہیں) نتیجہ خیز نہیں ہوتی۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ بالفرض مسجد کی تعمیر کا مسئلہ ہے تو مسجد کا ایک 'مجوّزہ' نقشہ (PROPOSAL) بنوالیا جائے اور اس نقشہ کے فوائد اور کمزوریاں سامنے لائی جائیں پھر جس بات پر اتفاق کرلیا جائے اسے اختیار کر کے نقشے کو بدل دیا جائے۔

علامہ اقبال بھی یہی فرماتے ہیں کہ جب دورِ غلامی ہو یا مسلمانوں کے ہاتھوں میں اقتدار نہ ہو اور کسی نئی ریاست کی تشکیل عرصے بعد ہو رہی ہو تو مناسب یہ ہے کہ مروّجہ معاملات کا کوئی کم سے کم قابل قبول نقشہ نافذ کر دیا جائے اور پھر کوئی ایسا با اختیار فورم ہو جیسے آج کل شریعت بنچ (اس کی بھی خامیاں دور کر کے صحیح تشکیل ہو) ـــــ تو اس میں متنازعہ اُمور علماء کی حد تک زیر بحث لائے جائیں اور جس چیز پر اتفاق ہو جائے یا فیصلہ آجائے اس کے مطابق قومی اسمبلی میں بھیج کر قانون میں ترمیم کر لی جائے اور وہ ترمیم نافذ ہو جائے۔ آج انہیں اختلافات کی وجہ سے ہم قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک انگریزی قانون (جو مجموعی طور پر سب کے نزدیک شریعت اسلامی کے خلاف ہے) قبول کیے بیٹھے ہیں۔ اس کے برعکس اگر قیام کے جلدی بعد (1951ء میں ہی) ملک کی اکثریتی آبادی کی فقہ، فقہ حنفی نافذ کر دی جاتی اور علماء کے ذاتی فتاویٰ کی بنیاد پر نہیں ـــــ شریعت بنچ کی سطح پر قانون 'قرآن وسنت کے مطابق کرنے کا عمل' جاری کر لیتے تو ممکن ہے کہ آج ملکی قانون کا بیشتر حصہ قرآن وسنت کے مطابق ہو چکا ہوتا۔

اب بھی قابل عمل تجویز یہی ہے کہ علامہ اقبال کی شخصیت قیامِ پاکستان کے حوالے سے مصوّر پاکستان ہیں اور ان کا فکر ایک جامع اسلامی انقلابی فکر ہے اس کو ملکی سطح پر قبول کر لیا جائے اور پھر اس میں ترامیم کا راستہ صحت مند بحث کے بعد علماء کی طرف سے تجاویز (شریعت بنچ کے ذریعے فیصلے) کے بعد اسی طرح قانون سازی کر کے نافذ کی جائیں۔ اس طریقے کے علاوہ کوئی خوب صورت قابل عمل تجویز ممکن ہی نہیں ہے۔

10۔ ہم نے اپنی رائے (جو صحیح بھی ہوسکتی ہے اور غلط بھی) میں پاکستان کو موجودہ نظریاتی بے راہ روی اور صحیح سمت میں آگے بڑھنے کے عمل کے فقدان کی توضیح کر کے عصر حاضر میں ایک مثالی عوامی اسلامی فلاحی ریاست کی ضرورت کا احساس دلایا ہے جو خوش قسمتی سے قرآن و حدیث کے مضمرات کا بھی تقاضا اور شرعاً واجب بھی ہے اور ختم نبوت کے نتیجے میں ایسا ہونا اِتمامِ حجت کے لئے ضروری بھی ہے۔

مزید برآں اپنی ناقص دانست میں اس بات کا ممکنہ قابل عمل حل بھی بتا دیا ہے۔ ہمیں یہ یقین ہے کہ اگر اس نسخے پر عمل کیا جائے تو پاکستان کا نظریاتی تشخص بحال ہو جائے گا اور ملک ایک صحیح راستہ پر گامزن ہو جائے گا اور جلد یا بدیر ـــــ عالمی سطح پر ایک مثالی اسلامی عوامی فلاحی ریاست کا روپ دھار لے گا، جو اسلام کی 'درویش حکمرانوں' کی تعلیمات کا عصر حاضر میں رول ماڈل ہوگا۔ اگر ایسا ہو جائے (اور یقینی امر ہے کہ ایسا ہوگا) تو پاکستان میں رونما ہونے والا انقلاب پھیل کر عالمی ہو جائے گا اور کل انسانیت خواہی نخواہی اسلام کے دامن عافیت میں پناہ لے گی۔ وماذالك على الله بعزيز

11۔ اہل علم و دانش سے توقع ہے کہ اس محاضرۃ (PRESENTATION) کی خامیوں اور کوتاہیوں پر ادارہ کو مطلع فرمائیں گے اور اس کی بہتری کے لئے مزید قابل عمل تجاویز دیں گے۔ اس سلسلے میں اگر تائید ملی تو ایک سیمینار کا بھی اہتمام کیا جا سکتا ہے تا کہ زیادہ قریب آ کر اِفہام و تفہیم کی فضا میں ملک پاکستان کے نظریاتی تشخّص کو بحال کیا جا سکے۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے' تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

باب 1

☆ اسلام کا انقلابی فکر اور اس کا زوال 15

☆ فکرِ اسلامی کی تجدید ___ اور علامہ اقبال 22

☆ ایسے اوصاف تھے سیّدنا محمد ﷺ کے 39

☆ خلافت یعنی درویشی کی حکمرانی کا قیام 45

☆ مملکتوں کے استحکام کے بارے میں
علامہ اقبال کے تصورات 48

اسلام کا انقلابی فکر
اور اس کا زوال

ڈاکٹر اسرار احمد کی کتاب سے دو اہم اقتباسات
(برعظیم پاک و ہند میں اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید و تعمیل اور اس سے انحراف کی راہیں)

اسلام کے انقلابی فکر کو اگر ایک جملے میں بیان کیا جائے تو وہ یہ ہے کہ ـــــ دین اور دنیا اور مذہب و سیاست کو یکجا کر کے ان کے مجموعے پر اللہ کی حاکمیّت یعنی کتاب اللہ اور سنّت رسول ﷺ کی غیر مشروط اور بلا استثناء بالادستی قائم کرنے کی جدوجہد میں تن من دھن کے ساتھ حصہ لیا جائے تاکہ دین حق کے غلبے کی صورت میں وہ نظامِ عدلِ اجتماعی قائم ہو جائے جو انسانی حریّت، اخوّت اور مساوات کے معتدل اور متوازن مجموعے کی حیثیت سے خلق کے لیے خالق کی رحمت و ربوبیّت اور عدل و قسط کا جامع اور کامل مظہر بن جائے ـــــ اور علامہ اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار کے مطابق اس مقصد عظیم کے لیے تن من دھن لگا دینا، حتیٰ کہ ضرورت پڑنے پر جان دے دینا، دینِ حق کا لازمی تقاضا ہے ؎

مقامِ بندگی دیگر، مقامِ عاشقی دیگر
زنوری سجدہ می خواہی، ز خاکی بیش ازاں خواہی
چناں خود رانگہداری کہ با ایں بے نیازی ہا!
شہادت بر وجودِ خود ز خونِ دوستاں خواہی

اور صرف ان عظیم ہستیوں کو مستثنیٰ کرتے ہوئے جنہوں نے خواہ اس مقصد کے لیے کوئی عملی اقدام اور اجتماعی جدوجہد نہ کی ہو، لیکن اپنی پوری زندگی ایسی کسی جدوجہد کی تمہیدی اور ابتدائی مساعی میں صرف کر دی ہو، جیسے مثلاً شاہ ولی اللہ دہلوی اور علامہ اقبال مرحوم باقی جس مسلمان کی زندگی اس جہد و جہاد

سے خالی اور سینہ اس راہ میں جان دینے کی آرزو سے محروم ہو وہ سورۃ الحجرات کی آیات 14 اور 15 کی رُو سے ''قانونی مسلم'' تو ہوسکتا ہے ''حقیقی مؤمن'' ہرگز نہیں ہوسکتا اور ایک حدیث نبوی ﷺ کی رُو سے ایسے مسلمان کی موت ایک قسم کے نفاق پر واقع ہوتی ہے۔ (مسلم عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ)

رہے وہ لوگ جو کسی ایسی جدوجہد میں بالفعل شریک رہے ہوں، پھر خواہ (i) اپنی کسی ذاتی کمزوری اور خامی کی بنا پر یا (ii) کسی نوع کے تکبر اور انانیت کے باعث یا (iii) کسی داعی اور قائد کی کم ہمتی سے بددل ہوکر یا (iv) اس میں ''خوئے دلنوازی'' کی کمی کی شکایت کی بنا پر یا (v) اس کے کسی مرحلے پر غلط رُخ اختیار کر لینے اور پھر اس پر ضد اور اصرار کے باعث علیحدگی اختیار کر لیں ـــــ ان میں سے جو لوگ اس جدوجہد سے بالکل دستکش ہوکر بیٹھ رہیں اور عضو معطل بن کر رہ جائیں ان سے بھی اللہ کے یہاں سخت جواب طلبی ہوگی، لیکن وہ لوگ جو اپنی بزدلی اور کم ہمتی پر پردہ ڈالنے کے لیے اس فکر ہی کو مجروح کرنے کی کوشش شروع کر دیں وہ تو حدیث نبوی ﷺ کے الفاظ: ''شَرَّ النَّاسِ تَحْتَ اَدِیْمِ السَّمَآءِ'' کے مصداقِ کامل یعنی آسمان تلے کی بدترین مخلوق شمار کیے جانے کے لائق ہیں۔ تاہم اس اہم حقیقت کی وضاحت کے لیے ایک اجمالی تاریخی تجزیہ ضروری ہے۔

اس حقیقت کا اعتراف تو اپنے اور غیر اور دوست اور دشمن سب کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی بیس سالہ عظیم اور معجزانہ انقلابی جدوجہد کے ذریعے دین حق کے غلبے کی صورت میں متذکرہ بالا نظام عدل وقسط بالفعل قائم فرما دیا تھا ـــــ اور مزید یہ کہ یہ نظام اپنی کامل اور مکمل صورت میں آپ ﷺ کے انتقال کے بعد بھی کم از کم تیس برس تک قائم رہا۔ البتہ اس کے ضمن میں دو وَسوسے اغیار اور اعداء نے پیدا کر دیے ہیں جن کی جانب اجمالی اشارہ مناسب ہے۔ ان میں سے پہلا وسوسہ ایک ''طعنے'' کی صورت میں ہے یعنی: ''اللہ کا عطا کردہ دین، اور صرف تیس برس کی قلیل مدت؟'' جس کا مسکت جواب یہ ہے کہ نظام اسلام کے بارے میں تو آپ بھی مانتے ہیں کہ یہ کم از کم ایک بار اپنی کامل صورت میں قائم ہوا اور تیس برس تک قائم رہا، جبکہ جن نظاموں کا ڈھنڈورا آپ پیٹتے ہیں ان میں سے تو کوئی بھی آج تک اپنی اصل مجوزہ صورت میں کہیں ایک دن کے لیے بھی قائم نہیں ہوسکا۔ چنانچہ افلاطون کی ''ریپبلک'' تو خیر تھی ہی خیالی جنت، جس جمہوریت کا خواب والٹیئر اور روسو نے خود دیکھا اور دنیا کو دکھایا تھا اس کے بارے میں جمہوریت کے بڑے

بڑے علمبردار بھی صرف یہی کہتے ہیں کہ ع ’’چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی!‘‘ کے مصداق ابھی ہم اس کی جانب پیش قدمی کر رہے ہیں! رہا مارکس اور اینجلز کا ’’غیر طبقاتی اور غیر ریاستی معاشرہ‘‘ تو یہ خواب تو اپنی تعبیر کی ادنیٰ ترین جھلک دکھائے بغیر ہی طاقِ نسیاں کی زینت بن چکا ہے!

دوسرا وسوسہ اس ’’مغالطے‘‘ کی صورت میں ہے کہ تیس برس کے بعد اسلامی نظام بالکل ختم ہو گیا تھا، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے اختتام پر شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی اختیار کردہ تعبیر کے مطابق دین حق کے نظام عدل اجتماعی کی چھ منزلہ عمارت کی صرف چھٹی یعنی سب سے بلند منزل منہدم ہوئی تھی، بقیہ پانچوں منزلیں قائم رہیں جو بعد میں ایک ایک کر کے کہیں ایک ہزار سال میں منہدم ہوئیں اور اس کے بعد بھی لگ بھگ دو سو سال تک کیفیت یہ رہی کہ ع ’’کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت عظیم تھی!‘‘ ـــــ تیس برس بعد، یعنی خلافت راشدہ کے اختتام پر تو صرف یہ کمی واقع ہوئی تھی کہ حکومت کا نظام اسلام کے اعلیٰ ترین شورائی معیارات پر برقرار نہ رہا بلکہ اس میں قبائلی عصبیت کا عمل دخل ’’شروع‘‘ ہو گیا۔ تاہم اسے بھی پوری طرح ’’ملوکیت‘‘ کی صورت اختیار کرنے میں کم از کم ایک صدی کا عرصہ لگا۔ اور ملوکیت اپنی پوری شان اور جملہ لوازم کے ساتھ بالفعل دور عباسی میں جلوہ گر ہو سکی۔

پھر یہ تو ہماری تاریخ کا نہایت شاندار اور قابل فخر باب اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت کا عظیم مظہر ہے کہ خلافت کے ملوکیت میں تبدیل ہونے کے تدریجی عمل کے ہر مرحلے پر اصحاب ہمت و عزیمت اس زوال اور انحطاط کو روکنے کے لیے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے رہے۔ چنانچہ اوّلین مرحلے پر سیّدنا حسین بن علی اور سیّدنا عبداللہ ابن زبیر (رضی اللہ عنہم) اور درمیانی اور آخری مراحل میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے حضرت زید بن علی اور حضرت حسن کی اولاد میں سے محمد ابن عبداللہ المعروف بہ نفس زکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم ابن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس زوال کو اپنی جانوں کی قربانی کے ذریعے روکنے کی کوشش کی ـــــ اور اگر ان تمام حضرات کی مساعی دنیوی اور فوری اعتبار سے ناکام ہو گئیں تو اس سے ان پر ہرگز کوئی حرف نہیں آتا، اس لیے کہ دنیوی اور فوری اعتبار سے تو ان سے پہلے بے شمار انبیاء کرام علیہم السلام بھی دنیا سے ناکام ہی گذر گئے تھے!

افسوس ہے کہ آج کے دور میں بعض کم ظرف اور کم ہمت بلکہ بد باطن لوگ ان نفوس قدسیہ کا ذکر توہین آمیز انداز میں کر کے اور ان کے عظیم کارناموں کو خود ساختہ فقہی اور قانونی معیار پر پرکھنے کی کوشش کر کے اپنے خبثِ باطن کا اظہار کرتے ہیں۔ اور اپنی کور چشمی کے باعث اس تاریخی حقیقت کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں کہ فقہ اسلامی کے دونوں اوّلین ائمہ یعنی فقہاء اسلام کے سید الطائفہ اور ''امام اعظم'' حضرت ابوحنیفہ اور حدیث نبوی ﷺ کا پہلا مجموعہ مرتب کرنے والے امام دارالہجرت حضرت مالک بن انس رضی اللہ عنہ نے حضرت نفس زکیہ سے دامے، درمے سخنے تعاون کیا تھا، جس سے با آسانی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اگر ان حضرات کو حسین ابن علی رضی اللہ عنہما اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا زمانہ ملا ہوتا تو ان کا طرزِ عمل کیا ہوتا!

چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ جیسے ''ایمان'' کے لطیف اور ماورائی حقائق کو ارسطو کی منطق کی محدود میزان میں تولنا ناممکن ہے اسی طرح ان حضرات کی منوں ہی نہیں ٹنوں وزنی عزیمت کو ملوکیت کے ''نازک مزاجِ شاہاں تابِ سخن نہ دارد'' والے دور میں پروان چڑھنے والی ''فقہ'' کی سناروں والی نازک ترازو میں تولنے کی کوشش کرنا حماقت محض ہے!

بہرحال جب عالم اسلام میں حدیث نبوی ﷺ کے الفاظ میں ''کاٹ کھانے والی ملوکیت'' اور ''جابرانہ بادشاہت'' کا نظام مستحکم اور متمکن ہو گیا اور اس کی پہلوٹھی کی بیٹی بھی جوان ہو گئی یعنی جاگیرداری بھی پوری طرح رائج ہو گئی اور عوام کو اس ظالمانہ استبدادی نظام کو ایک امر واقعی کی حیثیت سے عملاً قبول کرنا پڑا تو اس کے لازمی اور منطقی نتیجے کے طور پر مسلمانوں کے دینی تصورات میں بھی تنزل کا عمل شروع ہو گیا۔ اور اسلام رفتہ رفتہ ''دین'' کی بجائے صرف ایک ''مذہب'' کی صورت اختیار کرتا چلا گیا جس کا اصل موضوع ''عبادات اور رسومات'' ہوتی ہیں نہ کہ ریاست و سیاست! اور ہوتے ہوتے یہ بات تقریباً اصول موضوعہ کی حیثیت سے تسلیم اور قبول کر لی گئی کہ حکومت کا معاملہ تو علامہ ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ کی اصطلاح کے مطابق صرف ''عصبیت'' ہی کی بنیاد پر چل سکتا ہے۔ اور اس میدان میں تو لامحالہ ''جس کی لاٹھی اس کا بھینس'' ہی کے اصول پر عمل ممکن ہے ـــــ رہے ''علماء دین'' تو ان کا کام اوّل تو ان امراء و سلاطین کی ''سول سروس'' میں خطیبوں، مفتیوں اور قاضیوں کی خدمات سرانجام دینا ہے۔ جو لوگ اس سے آگے بڑھ کر ''دین

کی خدمت'' کی ہمت اور حوصلہ رکھتے ہوں وہ علوم اسلامی یعنی تفسیر، حدیث، فقہ اور علم کلام کو اپنی جولانگاہ بنائیں یا اگر اس کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں تو عوام کو وعظ ونصیحت اور تعلیم وتلقین کے ذریعے محبت الٰہی، اتباعِ رسول ﷺ اور ترجیح آخرت کی ''دعوت'' دیں اور ''تذکیر'' کا فریضہ ادا کرتے رہیں ـــــ اور جو اس سے بھی زیادہ ہمت اور عزیمت کے مالک ہوں وہ تزکیۂ نفس اور سلوک کے مراحل خود بھی طے کریں اور دوسروں کو بھی کرائیں اور اس مقصد کے لیے خانقاہیں آباد کر کے بیٹھ رہیں۔ اللہ اللہ خیر سلا! رہی سیاست اور حکومت تو یہ ''دنیاداروں'' کا کام ہے، اور اس سے بھی بڑھ کر ''نظام'' بدلنے کی کوشش کریں تو ''خروج'' اور بغاوت ہے جو کفر اور ارتداد سے بس کچھ ہی کم تر ہے!

اس تصور کے تحت ایک جانب ؎

''ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری''

کے مطابق سلاطین وامراء اور منصب داروں اور سپہ سالاروں میں عیاشی وسفا کی اور ہوس ملک گیری بڑھتی چلی گئی اور دوسری جانب مذہب صرف ایک ''پیشہ'' بن کر رہ گیا اور اس کے ضمن میں معاصرانہ چشمک اور پیشہ ورانہ رقابت اور پھر مدرسہ وخانقاہ کی تقسیم اور ان کی باہمی منافرت کے باعث اخلاقی زوال کا عمل جس قدر جلد شروع ہوا اور جتنی تیزی سے بڑھا اس کا اندازہ طبقہ تبع تابعین سے تعلق رکھنے والے حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے اس شعر سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ

؎ و مـــا افسـد الـدّيـن الاّ الـمـلـوك
و اَحبـــارُ ســـوءٍ و رهبـــانهـــا

جس بہترین ترجمانی کی ہے ترجمانِ حقیقت علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں کہ

؎ باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتہ ملّائی و سلطانی و پیری!

اور یہ امر یقیناً بہت قابل غور ہے کہ اگر یہ مرض تبع تابعین کے دور ہی میں شروع ہو گیا تھا جس کا شمار ''خیر القرون'' میں ہوتا ہے تو ع ''قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا!'' کے مصداق بخوبی اندازہ

لگایا جاسکتا ہے کہ مزید ایک ہزار برس کا عرصہ گزر جانے کے بعد نوبت کہاں تک پہنچ گئی ہوگی!

الغرض اب سے لگ بھگ تین سو برس قبل ادھر عالم اسلام میں تو دینی و اخلاقی زوال اور قومی سیاسی اختلال کی تاریکیاں ع ''زینہ زینہ اتر رہی تھی رات'' کے مانند شدید سے شدید تر ہوتی چلی جارہی تھیں اور فی الجملہ وہ صورت پیدا ہوچکی تھی جس کا نقشہ علامہ اقبال نے ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ

؎ پیشِ ما یک عالمِ فرسودہ است
ملّت اندر خاکِ اُو آسودہ است!

___ لیکن ادھر وسطی یورپ میں ہسپانیہ کے ان مسلمانوں کے زیر اثر جو قرطبہ اور غرناطہ کی یونیورسٹیوں کے ذریعے یورپ کو بیدار کرکے خود خوابِ خرگوش کے مزے لوٹنے کے باعث ع ''تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں!'' کی عبرت ناک مثال بن چکے تھے، اصلاح مذہب اور احیاء العلوم کا غلغلہ بلند ہوا، جس کے نتیجے میں ایک جانب سائنس اور ٹیکنالوجی نے تیزی سے ترقی کرنی شروع کی اور دوسری جانب انسانی حقوق بالخصوص حریّت کا تصور اُجاگر ہونا شروع ہوا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی سے جو ''قوت کا دباؤ'' بڑھا اس نے مغربی استعمار کی صورت میں افریقہ اور ایشیا کا رخ کرلیا اور اب سے تقریباً ڈھائی سو برس قبل سوائے سلطنت عثمانیہ کے تقریباً پورا عالم اسلام اس کے زیر نگین آ گیا۔ لیکن عجیب اور دلچسپ تضاد یہ ہے کہ گھر سے باہر بدترین آبادیاتی نظام کے قیام کے ساتھ ساتھ اہل یورپ نے خود اپنے گھر کے اندر انسانی حقوق کی بازیافت اور ظلم و جبر اور استبداد و استحصال کے خاتمے کی بھرپور جدوجہد شروع کردی۔

اس انقلابی جدوجہد کا پہلا نتیجہ اب سے دوسو سال قبل انقلاب فرانس کی صورت میں ظاہر ہوا جس سے دنیا میں بادشاہت اور جاگیرداری کے خاتمے اور جمہوریت کی مختلف صورتوں کا آغاز ہوا۔ لیکن چونکہ اس کے ساتھ ہی سائنسی ترقی کے نتیجے میں ''صنعتی انقلاب'' بھی رونما ہوچکا تھا لہٰذا اس جمہوریت نے عملی اعتبار سے ''سرمایہ داروں کی آمریت'' اور ع ''دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب'' کی صورت اختیار کرلی، جس کا شدید ردّعمل اس صدی کے آغاز میں ''انقلاب روس'' کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اور یہ وہ وقت تھا جب برعظیم پاک و ہند کے اس منظر پر علامہ

اقبال فکر اسلامی کی تجدید اور ''الٰہیاتِ اسلامیہ کی تشکیل جدید'' کے دعوے اور اسلامی انقلاب کی زوردار دعوت کے ساتھ نمودار ہوئے، جس کے پس منظر میں تصوفِ اسلامی اور الف ثانی کے مجدد شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ علوم اسلامی کے مجدد اعظم شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور جہاد اسلامی کے مجدد سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تین سو سالہ تجدیدی مساعی کے اثرات موجود تھے۔

فکر کے میدان میں علامہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک جانب سائنس کو ''روحِ قرآن'' کا ظہور اور بروز اور دوسری جانب عدل اجتماعی کی ان تمام اعلیٰ اقدار کو جن کا شعور یورپ میں اُجاگر ہوا تھا ''نورِ مصطفیٰ'' (صلی اللہ علیہ وسلم) سے مستعار قرار دے کر دین اور دنیا کے فرق، مذہب اور سیاست کی علیحدگی اور مشرق و مغرب کے فاصلے کو آنِ واحد میں ختم کر کے رکھ دیا۔

ے ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا زنورِ مصطفیؐ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیؐ ست!

چنانچہ یہ اسی کا مظہر ہے کہ حضرت علامہ نے ''ری پبلکن طرزِ حکومت'' کو اسلام کی روح کے عین مطابق قرار دیا اور یہ تو ان کی جرأتِ رندانہ اور شانِ قلندری کا نمایاں ترین مظہر ہے کہ انہوں نے ''مارکسزم + خدا = اسلام'' کا فارمولا پیش کر دیا۔ اس لیے کہ اس میں کیا شک ہے کہ خدا کی حاکمیّت مطلقہ کی تابع جمہوریت اور اللہ کی ربوبیت عامہ کے تقاضوں کو پورا کرنے اور کفالت عامہ کی ضمانت دینے والے نظام کا نام ''نظام خلافت'' ہے جس کا قائم کرنا مسلمانوں کا فرضِ منصبی اور اسلامی انقلاب کا مقصود و مطلوب ہے!

مزید برآں علامہ اقبال نے ایک جانب ''ایمان'' کا رشتہ ارسطو کی منطق یا افلاطون کے عالم مثال کی بجائے اعلیٰ ریاضی اور جدید طبیعات، فلکیات، حیاتیات اور نفسیات کے ساتھ قائم کرنے کی سعی مشکور کا آغاز کیا جس سے ''الٰہیاتِ اسلامیہ کی تشکیل جدید'' کی راہ ہموار ہوئی ___ اور دوسری جانب ''اسلام کا انقلابی فکر'' بھی مرتب اور مدوّن کر دیا اور انقلاب کے طریق اور منہج کی بھی اجمالی نشاندہی کر دی۔ تاہم ان موضوعات پر قدرے تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے۔

یکم مارچ 1994ء

انسانی اجتماعیت میں خلافت راشدہ کے 'ماڈل' کی بازیافت کے لیے

فکرِ اسلامی کی تجدید ___ اور علامہ اقبال

علامہ اقبال نے یورپ کی علمی اور سائنسی ترقی کو روح قرآن کا ظہور اور بروز، اور عوام کے سیاسی اور معاشی حقوق کے تصور کو نورِ محمدی (ﷺ) سے ماخوذ اور مستعار قرار دینے، اور اسلام کے علم کلام کو افلاطونی تصورات کی دلدل اور ارسطو کی منطق کی بھول بھلیوں سے نکال کر جدید تجرباتی علوم کی اساس پر استوار کرنے کے ساتھ ساتھ ایک جانب مغرب کے دو جدید عمرانی نظریات اور بنیادی سیاسی تصورات پر کڑی تنقید کرتے ہوئے مغربی تہذیب کو پوری خود اعتمادی اور جرأت رندانہ کے ساتھ چیلنج کیا، اور دوسری جانب نہ صرف یہ کہ اسلام کے اصل انقلابی فکر کی پوری ''مجددانہ'' شان کے ساتھ از سر نو تدوین کا فریضہ سرانجام دیا اور اللہ اور رسولؐ کے عطا کردہ نظام عدل اجتماعی کو عہد حاضر کی اعلیٰ ترین فکری سطح پر اور حقوق انسانی کے بلند ترین تصورات کے ساتھ ہم آہنگ کر کے پیش کیا، بلکہ انقلاب کا زوردار نعرہ لگاتے ہوئے اس کے منہج اور منہاج کو بھی کمال اختصار لیکن حد درجہ جامعیت کے ساتھ پیش کر دیا۔

مغرب کے جن دو جدید عمرانی نظریات پر علامہ نے شدید تنقید کی وہ سیکولرزم اور نیشنلزم یعنی وطنی قومیت ہیں۔ اور ان کے ضمن میں علامہ کے خیالات اتنے واضح و بیّن اور معروف و مشہور ہیں کہ یہاں ان کی جانب صرف ایک اجمالی اشارہ کافی ہے۔ چنانچہ سیکولرزم علامہ کے نزدیک اس دور کا سب سے بڑا فتنہ اور دین اور سیاست کی علیحدگی، فساد کی اصل جڑ ہے۔ مزید برآں انسانی حاکمیت کا تصور علامہ کے نزدیک کفر اور شرک ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ شخصی اور انفرادی ہو

یا قومی اور عوامی۔ اس موضوع پر علامہ کے مشہور اور عام فہم اشعار میں سے یہ دو شعر تو سب سے زیادہ نمایاں ہیں:

؎ جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی!

اور ؎ ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری ' ہوس کی وزیری!

لیکن زیادہ لطیف انداز اور گہرے پیرائے میں یہ بات علامہ کی حیاتِ مستعار کے بالکل آخری دور کی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' کے اس شعر میں بیان ہوئی ہے کہ

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر!

گویا علامہ کے نزدیک یورپ میں احیاء العلوم اور اصلاح مذہب کی تحریکوں کے زیر اثر آدم میں جو ''خود شناسی'' اور ''خود نگری'' کا شعور پیدا ہوا وہ اصلاً تو درست تھا لیکن اسے ابلیس اور اس کے کارندوں نے ''عوامی حاکمیت'' کی صورت دے کر شیطنت کا سب سے بڑا مظہر اور ابلیس کا آلہ کار بنا دیا ہے۔ چنانچہ جو گندگی منوں اور ٹنوں کے حساب سے ماضی میں کسی فرعون اور کسی نمرود یا کسی قیصر اور کسی کسریٰ کے سر پر تاج کی صورت میں رکھی ہوتی تھی وہ آج تولہ تولہ یا ماشہ ماشہ ہر انسان کے سر پر لیپ دی گئی ہے، لیکن نجاست بہر حال نجاست ہے خواہ منوں اور ٹنوں کے حساب سے ہو، خواہ تولوں اور ماشوں کی مقدار میں!

رہا وطنی قومیّت کا جدید تصور تو اس کے ضمن میں تو واقعہ یہ ہے حضرت علامہ نے بارہ اشعار پر مشتمل جو نظم اُردو میں کہی اور تین اشعار پر مشتمل جو قطعہ فارسی میں کہا ان کے بارے میں میں پورے وثوق کے ساتھ وہی بات کہنے کو تیار ہوں جو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے سورۃ العصر کے بارے میں کہی ہے ـــــ اس موضوع پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا زیادہ مشہور قول تو یہ ہے کہ ''اگر لوگ صرف اس سورت پر تدبر کر لیں تو یہ ان (کی ہدایت) کے لئے کافی ہے!'' لیکن ان کا ایک دوسرا زیادہ فصیح اور بلیغ قول وہ ہے جو مفتی محمد عبدہٗ نے اپنی تفسیر پارہ عم میں نقل کیا ہے، یعنی: ''اگر قرآن

میں سوائے اس ایک سورت کے اور کچھ بھی نازل نہ ہوتا تب بھی یہ (لوگوں کی ہدایت کے لئے) کافی ہوتی!'' ـــــ علیٰ ہٰذا القیاس۔ مجھے یہ کہنے میں ہرگز کوئی باک نہیں ہے کہ اگر علامہ مرحوم نے ساری عمر میں صرف یہی اشعار کہے ہوتے تب بھی وہ خود اپنے ہی شعر ؎

''نظارہ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفویؐ خاک میں اس بُت کو ملا دے''

کے مصداق مغربی تمدن کے لئے سب سے بڑے ''بت شکن'' اور ''قومیتِ اسلام'' کے مجددِ اعظم قرار پانے کے مستحق ہوتے!

اس معاملے میں بھی یہ بات قابل غور ہے کہ حضرت علامہ نے اپنی اردو نظم (مشمولہ ''بانگ درا'' صفحات ۱۶۰۔۱۶۱) میں ایک ''سیاسی تصور'' کی حیثیت سے ''وطن'' کو ایک جانب عہد حاضر کے ''تازہ خداؤں'' میں سب سے بڑا خدا اور تہذیب جدید کے آزر کے تراشے ہوئے نئے اصنام میں سب سے بڑا ''صنم'' قرار دیا دیا' گویا ''وطنیت'' کو سب سے بڑے شرک سے تعبیر کیا جو اَز رُوئے قرآن نا قابل معافی جرم ہے (سورۃ النساء آیات ۴۸ اور ۱۱۶) اور دوسری جانب نوع انسانی کے لئے نہایت تباہ کن اور مہلک بیماری قرار دیا' جس کے بطن سے ''مخلوق خدا'' میں تفرقہ وعداوت اور ''اقوام جہاں'' میں باہمی ''رقابت'' جنم لیتی ہے' جس کے نتیجے میں سیاست اخلاق سے ''خالی'' اور ''تجارت'' ذریعہ ''تسخیر'' (یعنی امپریلزم کا آلہ) بن جاتی ہے ـــــ اور ان سب کا نتیجہ یہ کہ ''کمزور'' اقوام تباہ و برباد ہو کر رہ جاتی ہیں اور ان کا گھر ''غارت'' ہو جاتا ہے!

رہا فارسی قطعہ تو اس کے ضمن میں اگرچہ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ اعتراض تو بالکل بجا تھا ''میں نے ملت نہیں قوم کا لفظ استعمال کیا تھا!'' اور اس پر حضرت علامہ نے بھی نہایت وسعت قلبی اور عالی ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے معذرت کر لی تھی' لیکن مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کے بارے میں کہ ''میرا یہ کہنا کہ آج کل قومیں وطن سے بنتی ہیں محض خبریہ تھا' انشائیہ نہیں تھا'' ان کی تمام تر جلالت قدر' اور ان کے تقویٰ و تدین اور مجاہدانہ سیرت و کردار کے اعتراف کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ ایک بالکل مہمل بات تھی، اس لئے کہ مولانا ایک سیاسی اور مذہبی قائد تھے اور اس اعتبار سے ان کی ہر بات میں ''انشاء'' اور مشورہ کا رنگ ہونا بالکل فطری امر تھا۔ اور علامہ اقبال کی

تنقید بھی اصلاً مغرب کے اس نظریے ہی پر تھی کہ قوم وطن سے بنتی ہے! (ملت کا لفظ تو غالباً صرف ضرورت شعری کے تحت استعمال ہو گیا تھا۔) اور کفر اور شرک ایسے امراض ہر دور میں جو نئے لباس پہن کر اور نت نئے بھیس بدل کر اولاد آدم کی گمراہی کے درپے ہوتے ہیں ان کی ؎

''بہر رنگ کہ خواہی جامہ مے پوش
من اندازِ قدت را می شناسم!''

کے انداز میں صحیح پہچان کی صلاحیت اللہ تعالیٰ کا ایک خصوصی فضل ہوتا ہے جو اس دور میں مبداءِ فیض سے علامہ اقبال کو عطا ہوا تھا ـــــ بقول خود ان کے کہ ؎

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیلؑ!

قصہ مختصر، ایک جانب سیکولرزم اور عوامی حاکمیت اور دوسری جانب وطنی قومیت کی پرزور نفی کی اساس پر علامہ اقبال نے تہذیب جدید اور مغربی تمدن کو نہ صرف چیلنج کیا بلکہ ''خبردار'' بھی کیا کہ ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے وہ اب زر کم عیار ہوگا!

اور ؎

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا!

اس مقام پر آگے بڑھنے سے قبل یہ جملۂ معترضہ عرض کیے بغیر نہیں رہا جا رہا کہ 'مسلم قومیت' کی اساس پر وجود میں آنے والے ملک میں، جس کے لئے ساری سیاسی جنگ ''جداگانہ انتخابات'' کی بنیاد پر لڑی گئی تھی، پینتالیس سالہ تعطل کے نتیجے میں نظریاتی انحراف اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ ملک کی ایک بڑی سیاسی جماعت یعنی پاکستان پیپلز پارٹی تو برملا ''مخلوط انتخابات'' کا نعرہ لگا رہی ہے، زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ مسلم لیگ کے بھی بعض سیکولر مزاج کارکن اور رہنما کم از کم نظریاتی سطح پر اسی کے راگ میں اپنی راگنی شامل کر رہے ہیں، اور نوبت بایں جا رسید کہ

؎ ''اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ''

اور ؎ ''ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری!''

کی بنیاد پر وجود میں آنے والے ملک میں شناختی کارڈ میں ''مذہب'' کے خانے کے اندراج پر اس قدر شور اور ہنگامہ برپا ہوا ہے کہ مذہبی جماعتوں کو ایجی ٹیشن کی دھمکی دینی پڑ رہی ہے!—— رہا قائداعظم مرحوم کا ۱۱/اگست ۴۷ء والا جملہ تو اسے ایک وقتی مصلحت کے طور پر قبول کرنا تو بالکل دوسری بات ہے لیکن اگر مستقل فلسفے اور پاکستان کے دستور اور نظام کی مستقل اساس کے طور پر تسلیم کر لیا جائے تو یہ ''نظریہ پاکستان'' کی صریح نفی اور مفکر و مصور پاکستان کے افکار و نظریات سے کھلی بغاوت ہے! جو نظریاتی سطح پر پاکستان کے جواز کے خاتمے اور خاکم بدہن بالآخر عملی طور پر سوویت یونین کے مانند پاکستان کے بھی نیست و نابود ہونے پر منتج ہوگی جبکہ پاکستان کی اس نظریاتی اساس کا استحکام اور اسی کی بنیاد پر ملک کے پورے دستوری اور قانونی نظام کی تشکیل عالم انسانیت میں ایک نئی تہذیب کے رواج ایک نئے تمدن کے قیام و فروغ اور اس ''نیو ورلڈ آرڈر'' کی بجائے جو حقیقت کے اعتبار سے ''جیو ورلڈ آرڈر'' یعنی یہود کی بالادستی کا نظام ہے ایک حقیقی اور واقعی منصفانہ عالمی نظام (JUST WORLD ORDER) کے قیام کا نقطہ آغاز بن جائے گی۔ اور چونکہ یہی وہ چیز ہے جو ابلیس لعین اور اس کی تمام صلبی اور معنوی ذریت (اولاد) اور یہود اور ان کے آلہ کار ''وہائٹ اینگلو سیکسن پروٹسٹنٹس'' (WASP) کو ناپسند ہے، لہٰذا پاکستان میں اس منزل مقصود کی جانب کوئی چھوٹے سے چھوٹا اور حقیر سے حقیر اقدام بھی ابلیس اور اس کے ملکی اور غیر ملکی کارندوں کو سخت ناگوار ہوتا ہے!

''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' نامی نظم حضرت علامہ نے ۱۹۳۶ء میں اپنے انتقال سے زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو سال قبل کہی تھی اور ان کے اردو کلام میں شعریت کے اعتبار سے تو بعض دوسری نظمیں اس کے مقابلے میں بہت بلند مرتبہ و مقام کی حامل ہیں، لیکن ''امتِ مسلمہ کے نام پیغام'' کے اعتبار سے اس میں ہرگز کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اسی کو ان کے ''خاتمۂ کلام'' اور

''پیامِ آخریں'' کی حیثیت حاصل ہے۔اوراس کا ''حاصل کلام'' یا خلاصہ اورلب لباب یہ ہے کہ ابلیسیت کو کوئی خطرہ نہ جمہوریت سے ہے، نہ اشتراکیت سے بلکہ صرف اورصرف اسلام سے ہے۔اس لئے کہ جہاں تک مغرب کی نام نہاد جمہوریت کا تعلق ہے وہ محض ''ملوکیت کا اک پردہ'' ہےاوراس کی حقیقت۔ع

''چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر''

کےسوااور کچھ نہیں (اس لئے کہ وہ اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے ''سرمایہ داروں کی آمریت'' ہے۔) اسی طرح اشتراکیت بھی قدیم ''مزدکی منطق کی سوزن'' سے نوع انسانی کے گریبانوں کے چاک کورفو نہیں کرسکتی، بقول ابلیس۔

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روز گار، آشفتہ مغز، آشفتہ ہو!

لہٰذا ؎ ہے اگر کوئی خطر مجھ کو تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو!

اور ؎ جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے!

اسلام سے اس خوف اورخطرے کے مقابلے میں ابلیس کو اگرچہ یہ تسلی اور اطمینان حاصل ہے کہ ایک جانب تو مسلمانوں کی عمل کے اعتبار سے حقیقی اورواقعی صورت حال یہ ہے کہ ؎

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مؤمن کا دیں!

اور ؎ جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں!

اوردوسری جانب نام نہاد ''اہل ایمان'' کے ایمان کی واقعی کیفیت یہ ہے کہ وہ ''یقین'' کی بجائے محض ایک ''عقیدہ'' بن کررہ گیا ہے یعنی ۔ع

یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں!

اور ؎ زندہ قوت تھی زمانے میں یہ توحید کبھی
اور اب کیا ہے فقط اک مسئلہ علمِ کلام!

تاہم چونکہ تاریخ کے بہاؤ کا رخ لامحالہ ''تلاش مصطفیٰؐ'' کی جانب ہے لہٰذا ابلیس کو یہ اندیشہ بھی لاحق ہے کہ ؎

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ ہو جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں!

اور اس کے بعد کے چار اشعار تو نہ صرف یہ کہ اس طویل نظم کی اصل جان ہیں' بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اسلام کے نظام عدل اجتماعی یا نظام مصطفیٰ ﷺ کا جو فہم علامہ اقبال کو زندگی بھر کے مطالعے اور غور و فکر کے ذریعے حاصل ہوا تھا اس کی تعبیر کے ضمن میں ''سہل ممتنع'' کی بھی اعلیٰ ترین مثال ہیں اور ''جوامع الکلم'' کی بھی بہترین نظیر! چنانچہ:

؎ الحذر! آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر!
حافظِ ناموسِ زن' مرد آزما' مرد آفریں

کی رُو سے حضرت علامہ کے نزدیک اسلام کے سماجی اور معاشرتی نظام کی دو بنیادیں یہ ہیں کہ (i) اس میں عورتوں کی عصمت و عفت اور عزت و ناموس کی حفاظت کو اوّلین مقصد اور ہدف کی حیثیت حاصل ہے۔ اور (ii) اس میں مشکل اور مشقت طلب فرائض (جیسے طلبِ معاش اور دفاعِ ملک و ملت) کا بوجھ مرد پر ڈالا گیا ہے' عورت پر نہیں!

؎ موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں' نے گدائے رہ نشیں!

کے مطابق اسلام کا سیاسی نظام ''تمیز بندہ و آقا'' کے خاتمے کے اصول پر مبنی ہے' جس کی ایک ہی صورت ممکن ہے۔ یعنی یہ کہ حاکمیت صرف اللہ کے لئے تسلیم کی جائے' بقول اقبال ؎

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری!

اور تمام انسان حدیث نبویؐ میں وارد الفاظ ''کونوا عباد اللّٰہ اخوانا'' کے مطابق

ایک جانب اللہ کے بندے اور دوسری جانب آپس میں بھائی بھائی بن جائیں ـــــ اور صرف عقیدہ اور نظریہ کے علاوہ کوئی دوسری تمیز و تفریق اور اونچ نیچ انسانوں کے مابین باقی نہ رہے! بقول ؎

کُلُّ مُؤمِن اِخوَۃٌ اندر دلش
حریّت سرمایۂ آب و گلش

اور ؎

ناشکیبِ امتیازات آمدہ
در نہادِ اُو مساوات آمدہ!

جس کا منطقی نتیجہ ہے کہ اسلام روئے ارضی پر اللہ کی حاکمیت اور مسلمانوں کی خلافت کا نظام قائم کرنا چاہتا ہے گویا ؎

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر!

(۳) اقبال کی جامعیت کا نمایاں مظہر یہ بھی ہے کہ جہاں مابعد الطبیعات ان کا اصل موضوع تھا وہاں انہیں اقتصادیات سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ چنانچہ ان سے بڑھ کر کون اس حقیقت سے واقف ہوسکتا تھا کہ آج کی دنیا میں سب سے زیادہ اہمیت معاشیات کو حاصل ہے اور آج کا انسان بالفعل ''معاشی حیوان'' بن چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن چار اشعار پر اس وقت گفتگو ہو رہی ہے ان میں سے دو کا تعلق اسلام کے اقتصادی تصورات سے ہے۔ چنانچہ ایک جانب ''سرمایہ'' کے بارے میں فرمایا ؎

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں!

اور دوسری جانب ''زمینداری'' کی جڑ یہ کہہ کر کاٹ دی کہ ؎

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں' اللہ کی ہے یہ زمیں!

اس میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ اسلام کے سماجی انصاف کے نظام کے ضمن میں علامہ اقبال نے توحیدِ الٰہی کے تینوں منطقی نتائج کو خود بھی کما حقہ سمجھا اور اللہ کے فضل و کرم سے انہیں اپنے اشعار کے ذریعے سمجھانے اور عام کرنے کا حق بھی پوری طرح ادا کر دیا۔ یعنی (i) یہ کہ چونکہ تمام انسان ایک ہی خالق کے پیدا کردہ (مزید برآں ایک ہی انسانی جوڑے کی نسل سے ہیں) لہٰذا ان کے مابین پیدائشی طور پر نسل، رنگ یا صنف کی بنا پر کوئی اونچ نیچ نہیں ہے (ii) یہ کہ ''حاکمیت مطلقہ'' صرف اللہ ہی کے لیے ہے، اور انسان کیلئے محض ''خلافت'' ہے اور (iii) یہ کہ ''ملکیت تامہ'' بھی صرف اللہ ہی کے لیے ہے۔ اور انسان کے لئے زمین سمیت کل مال و دولت صرف ''امانت'' کے حکم میں ہے۔ بقول شیخ سعدی ؎

ایں امانت چند روزہ نزدِ ماست
در حقیقت مالکِ ہر شے خدا ست!

اور بقولِ اقبال ع

بندۂ مومن امیں، حق مالک است!

ان میں سے جہاں تک ''سیاست خلافت'' کا تعلق ہے اس پر کچھ ہی دنوں قبل ان کالموں میں بھی مفصل گفتگو ہو چکی ہے، مزید برآں متعدد سیمینار بھی منعقد کئے جا چکے ہیں، لہٰذا اس کے بارے میں کسی مزید وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ البتہ جہاں تک معاشی عدل و انصاف کے ضمن میں اسلام کی تعلیمات کا تعلق ہے اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ ان کی حقیقت اور اہمیت جس شدت وحدت اور گہرائی و گیرائی کے ساتھ علامہ اقبال پر منکشف ہوئی اس کی کوئی مثال کم از کم انیسویں اور بیسویں صدی کے مفکرین اسلام اور داعیانِ دین میں سے کسی کے یہاں نہیں ملتی۔

چنانچہ یہ شعور و ادراک تو بحمد للہ عام ہے کہ اسلام نے اپنے معاشی نظام میں ذاتی منفعت کے جبلی تقاضوں کو مناسب حد تک ملحوظ رکھ کر ''سرمایہ کاری'' کے لئے تو پوری فضا برقرار رکھی، لیکن ''سرمایہ داری'' کی لعنت کی جڑ سود کی حرمت کے ذریعے کاٹ کر رکھ دی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ''ربا'' کی خباثت و شناعت کے احساس و ادراک کے ضمن میں جس ''جوہر اندیشہ کی گرمی''

اقبال کے یہاں نظر آتی ہے وہ کم اَز کم راقم کی محدود معلومات کی حد تک کسی دوسرے مفکر یا عالم کے یہاں موجود نہیں ہے ذرا ملاحظہ فرمائیں ؎

از ربا آخر چہ می زاید؟ فتن!
کس نہ داند لذتِ قرضِ حسن

اور ؎

از ربا جاں تیرہ' دل چوں خشت و سنگ
آدمی درندہ بے دندان و چنگ!

(اس ضمن میں احساس کی شدت اور حدت کے اعتبار سے اگر کوئی دوسرا شخص اقبال کے آس پاس نظر آیا تو وہ بھی حسن اتفاق سے ایک کشمیری شیخ ہی تھا۔ یعنی شیخ محمود احمد مرحوم جن کی مختصر کتاب ''سود کی متبادل اساس'' تو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور سے شائع ہو چکی ہے لیکن اصل معرکۃ الآراء تصنیف ''انسان اور سرمایہ'' (MAN AND MONEY) ابھی زیر طباعت ہے۔ لیکن صرف انگریزی میں!)

تاہم سود کی حرمت کے مسئلے پر تو پھر بھی غنیمت ہے کہ علماء دین کا اجماع ہے (اگرچہ دور ملوکیت میں پروان چڑھنے والی فقہ نے ''بیع مؤجل'' اور ''بیع مرابحہ'' کی اساس پر شرعی حیلوں کے ذریعے سود خوروں کے اطمینان و تسکین کا سامان فراہم کر رکھا ہے) لیکن ''زمین کے سود'' یعنی غیر حاضر زمینداری اور مزارعت کو تو امام اعظم حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام دارالہجرت حضرت مالک رحمۃ اللہ علیہ کے فتووں کے علی الرغم تمام علمائے دین نے شیر مادر کی طرح حلال و طیب قرار دے رکھا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یہ علامہ اقبال کے ہاتھوں اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید کا نہایت اہم اور نمایاں مظہر ہے کہ اس مسئلے پر بھی انہوں نے نہایت واضح اور دوٹوک بات کی۔ چنانچہ ایک جانب فلسفہ اور نظریہ کی سطح پر انہوں نے زمین کی ملکیت کی کلی نفی کی کہ ع

پادشاہوں کی نہیں' اللہ کی ہے یہ زمیں!

اور ؎

دہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں' تیری نہیں
تیرے آباء کی نہیں' تیری نہیں' میری نہیں!

اور ؎ رزقِ خود را از زمیں بردن رواست
ایں متاعِ بندہ و ملک خداست!

اور دوسری جانب عملی سطح پر امام اعظم اور امام دارالہجرت کی آراء سے ہم آہنگی اختیار کرتے ہوئے حضرت علامہ نے زراعت میں مزارعت یعنی بٹائی کے نظام کو اللہ کی رحمت اور برکت سے محرومی کا سبب قرار دیا۔ فرمایا:؎

خدا آں ملتے را سروری داد
کہ تقدیرش بدستِ خویش بنوشت!
بہ آں قومے سروکارے نہ دارد
کہ دہقانش برائے دیگراں کشت!

چنانچہ حقیقت یہ کہ اس معاملے میں تو ان کی شان بالکل ''منفرد'' ہے!

بہرحال' اسلام کے اس انقلابی فکر کی تجدید کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ علامہ اقبال نے ''انقلاب'' کا نعرہ بلند کیا۔ اور اس کے لئے خاص طور پر سرمایہ داری' زمینداری اور جاگیرداری ہی کے خلاف اعلان جہاد کیا ـــــ یعنی ؎

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعل ناب
از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب! انقلاب!! اے انقلاب!!!

لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ حضرت علامہ نے اسلامی انقلاب کا ہدف معین کرنے کے ساتھ ساتھ اس کو برپا کرنے کے منہج اور منہاج کو بھی کمال جامعیت اور غایت اختصار کے ساتھ واضح کر دیا۔ چنانچہ اس موضوع پر ان کا ایک شعر تو الہامی ہی نہیں ''معجزانہ'' ہے! تاہم اس کا ذکر بعد میں ہوگا۔ پہلے یہ بات واضح ہو جائے کہ علامہ کے نزدیک اسلامی انقلاب کی جدوجہد کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ قرآن حکیم کو لوگوں کے ''اندر'' اتارا جائے جس سے ان کے ذہن و فکر، نظریات و خیالات، اہداف و مقاصد اور اقدار و ترجیحات میں ''انقلاب'' برپا ہو جائے۔ اور وہ ''اندر سے'' بالکل تبدیل ہو کر رہ جائیں۔ اس لئے کہ عالم انسانیت میں یہ باطنی اور نفسیاتی تبدیلی

اور شخصی و انفرادی انقلاب ہی عالمی انقلاب کا پیش خیمہ بن سکتا ہے چنانچہ عظمت قرآن کے بیان میں فرماتے ہیں:

؎ چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود!

واضح رہے کہ اسی کو اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفرقان کی آیت نمبر ۵۲ میں ''جہاد بالقرآن'' یعنی قرآن کے ذریعے جہاد سے تعبیر فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے:

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا

''تو (اے نبی ﷺ) آپ ان کافروں کا کہنا نہ مانیں اور ان کے ساتھ جہاد جاری رکھیں اس (قرآن) کے ذریعے، پوری شدت اور قوت والا جہاد!''

اس لئے کہ یہ تو سب جانتے ہیں کہ اسلامی انقلاب کی جدوجہد کے مرحلہ اوّل یعنی دعوت و تبلیغ کا کل مبنیٰ و مدار، اور مرکز و محور صرف اور صرف قرآن حکیم ہے چنانچہ اسی کے ذریعے وعظ و نصیحت، انذار و تبشیر، اور تذکیر و تلقین۔ گویا فی الجملہ اسی کی تبلیغ و تعلیم اسلامی انقلابی جدوجہد کا پہلا مرحلہ ہے لیکن یہ حقیقت کہ تزکیہ و تربیت کا آلہ اور ذریعہ بھی قرآن حکیم ہی ہے اور شیطان لعین اور اس کی صلبی اور معنوی اولاد کے مقابلے کے لئے بھی واحد تلوار اور ہتھیار اللہ کی کتاب ہی ہے جس شدت کے ساتھ اقبال پر منکشف ہوئی اور جس قدر وضاحت کے ساتھ انہوں نے اسے بیان کیا اس کی بھی کوئی دوسری مثال کم از کم راقم کے علم میں موجود نہیں ہے! (اس موضوع پر بھی چونکہ ان کالموں میں مفصل گفتگو ہو چکی ہے لہٰذا تفصیل کی ضرورت نہیں) ـــــ ان کے ساتھ دو مراحل کا مزید اضافہ کر لیا جائے یعنی ایک تنظیم جس پر گفتگو ہو چکی ہے اور دوسرے صبر محض یا عدم تشدد یا صحیح الفاظ میں ''عدم انتقام'' جس پر گفتگو ابھی باقی ہے، تو علامہ اقبال کے متذکرۂ صدر ''معجزانہ'' شعر کا مصرعہ اوّل مکمل ہو جاتا ہے یعنی: ع

''با نشہ درویشی در ساز و دما دم زن!''

اس لئے کہ ان چار مراحل کے دوران اسلامی انقلاب کے لئے کوشاں کارکنوں اور مجاہدوں کا نقشہ واقعی طور پر اور لامحالہ بدھ مت کے بھکشوؤں اور حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں ہی سے

مشابہ ہوتا ہے۔یعنی گالیاں سنو! اور دعائیں دو' پتھر کھاؤ اور پھول پیش کرو' اور سائلوں کی طرح دعوت دو اور بھکاریوں کی طرح در در کی ٹھوکریں کھاؤ' اور اُف تک نہ کرو بلکہ صبر کرو اور اپنی جدوجہد کو ''دمادم زن'' کے انداز میں جاری رکھو! چنانچہ مکی دور کے بارہ سالوں کے دوران مسلسل یہی ہدایات اللہ تعالیٰ کی جانب سے محمد رسول ﷺ کو' اور آنحضور ﷺ کی جانب سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ملتی رہی کہ!

وَ لِرَبِّكَ فَاصْبِرO(المدثر:۷)

''اور اپنے رب (کی خوشنودی) کے لئے صبر کرو''

اور

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَO (الحجر:۹۷)

''ہمیں خوب معلوم ہے کہ جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں اس سے آپ کا سینہ بھینچتا ہے''

لیکن اس کے باوجود

وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلاًO (المزمل:۱۰)

''صبر کرو اس پر جو یہ کہہ رہے ہیں۔اور ان سے کنارہ کشی بھی کرو تو خوبصورتی کے ساتھ''

اور

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ (القلم:۴۸)

''صبر کے ساتھ انتظار کرو اپنے رب کے حکم کا اور مت ہو جاؤ اس مچھلی والے (حضرت یونسؑ) کی مانند (جنہوں نے عجلت سے کام لیا تھا)''

اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ شریعت کے مستقل اور ابدی قانون سے حکم قصاص ساقط ہو گیا تھا یا صحابہ کرامؓ کی طبع بشری بدل گئی تھی اور اس میں جوش انتقام پیدا ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ یہ صرف انقلابی جدوجہد کے ابتدائی مراحل کا وقتی تقاضا تھا چنانچہ خود سورۃ الشوریٰ میں جو مکی دور کے بھی وسط میں نازل ہوئی تھی' اہل ایمان کا یہ وصف مقام مدح میں مذکور ہے کہ

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْىُ هُمْ يَنْتَصِرُوْن O وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (آیات ۳۹، ۴۰)

''اور وہ کہ جن پر زیادتی کی جائے تو وہ بدلہ لیتے ہیں اور برائی کا بدلہ تو یقیناً ویسی ہی برائی ہے''

تاہم یہ کُفُّوا ایدیکم ''اپنے ہاتھ روکے رکھو'' (سورۃ النساء: ۷۷) کا وقتی حکم کچھ ایسی کیفیت کے ساتھ تھا کہ ؎

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

اس لئے کہ جیسے ہی یثرب کی جانب ہجرت ہوئی اور فضل خداوندی سے آنحضور ﷺ کی انقلابی جدوجہد کو ''اقدام اور چیلنج'' کے لئے مرکز اور قاعدہ (مورچہ) میسر آ گیا اہل ایمان کے ہاتھ کھول دیئے گئے اور اِذنِ قتال نازل ہو گیا۔ یعنی:

اذن للذین یقتلون با نھم ظلموا (الحج: ۳۹)

''اجازت دے دی گئی انہیں جو جنگ کر رہے ہیں (یا اختلاف قرات کی بنا پر جن پر جنگ مسلط کر دی گئی ہے) اس لئے کہ ان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گئے''

اور پھر جب اس کے نتیجے میں کچھ ہی دنوں بعد مسلح تصادم اور قتال فی سبیل اللہ کا آخری مرحلہ شروع ہو گیا تو اوّلاً سورۃ البقرہ کی آیت ۱۹۳ میں اور پھر مزید وضاحت اور صراحت کے ساتھ سورۃ الانفال کی آیت ۳۹ میں حکم دے دیا گیا کہ ''ان (کافروں) سے جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ فتنہ بالکل فرو ہو جائے اور دین کل کا کل اللہ ہی کیلئے ہو جائے''____ یعنی اللہ کی زمین سے باطل کی حکمرانی کا قلع قمع ہو جائے اور اس کے باغیوں اور سرکشوں کی حکومت کے تختے الٹ دیئے جائیں اور ''حق بحقدار رسید'' کے مصداق اللہ کی زمین پر اللہ ہی کی حکومت (یا انجیل کی اصطلاح میں ''آسمانی بادشاہت'') قائم ہو جائے۔

چنانچہ اقدام اور چیلنج اور مسلح یا غیر مسلح تصادم کے ان مراحل کو اقبال نے کمال جامعیت واختصار اور معجزانہ فصاحت و بلاغت کے ساتھ سمو دیا اپنے متذکرہ بالا شعر کے دوسرے مصرعہ میں

یعنی: ع ''چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن!''

اور اسی کے لئے وہ مسلسل پکارتے' اُبھارتے' اور للکارتے رہے امت مسلمہ بالخصوص اس کی ''مذہبی قیادت'' کو جو مدرسہ اور خانقاہ اور علماء اور صوفیاء میں منقسم تھی اور جس کے بارے میں ان کے مشاہدات اور تاثرات کا اظہار ان کے ان الفاظ کے ذریعے بخوبی ہو جاتا ہے کہ ع

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک!

یہی وجہ ہے کہ اگرچہ انہوں نے ایک جانب اس وجودی تصوف کی شدت کے ساتھ مخالفت کی، جس کے زیر اثر خام طبائع میں عمل اقدام اور جہاد کی بجائے تعطل گریز اور جمہود کی کیفیات پیدا ہوتی ہیں اور نہ صرف یہ کہ اہل تصوف کو زوردار دعوت دی کہ ؎

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیریؓ
کہ رسم خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری!

بلکہ یہ بھی بتایا کہ یہ تو مسلمانوں کے بارے میں ابلیس لعین کی اپنے کارندوں کو اہم ہدایت ہے کہ ؎

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

اور دوسری طرف علماء دین کو بھی جھنجوڑنے کی بھرپور کوشش کی' چنانچہ ان کے جو شاہکار اشعار ان کے مرقد کی زینت بنے ہوئے ہیں ان میں یہ قطعہ بھی شامل ہے کہ ؎

بیا تا کارِ ایں امت بسازیم
قمارِ زندگی مردانہ بازیم

اور ؎ چناں نالیم اندر مسجدِ شہر
دلے در سینہ ملا گدازیم!

تاہم ان کا اصل خطاب مسلمانان ہند کی جدید تعلیم یافتہ نوجوان نسل سے تھا جس کے دلوں کو انہوں نے کبھی تو عظمت رفتہ اور سطوت گذشتہ کی یاد سے گرمانے کی کوشش بھی کی کہ ؎

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارہ!

اور کبھی ان کے جوشِ عمل کو مستقبل کے بارے میں امید افزا پیشین گوئیوں اور مغرب کے زوال اور اسلام کے عروج کی ع ''قلندر ہر چہ دیدہ گوید!'' کے سے انداز کی خبروں کے ذریعے ابھارا۔ جیسے

؎ کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

اور ؎ سبق پھر پڑھ صداقت کا، شجاعت کا، عدالت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا!

چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ علامہ اقبال کی اس ملی شاعری نے مسلمانانِ ہند کے نوجوان طبقے کے دلوں سے اس یاس اور ناامیدی کے اندھیاروں کو کافور کر دیا جس کا نمایاں ترین مظہر قومی شاعر ہونے کے اعتبار سے علامہ کے پیشرو مولانا حالی کی شہرہ آفاق مسدس کی ابتداء اور اختتام کے یہ دلدوز اشعار ہیں

؎ پستی کا کوئی حد سے گذرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے!
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے!

اور ؎

اے خاصۂ خاصانِ رسلؐ وقتِ دعا ہے
امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے!
وہ دیں جو بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے!

بایں ہمہ یہ واقعہ اپنی جگہ ناقابل انکار ہے کہ علامہ اقبال نے اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید کے اس عظیم الشان کارنامے، اور انقلاب کے منہج اور منہاج کی واضح نشاندہی کی عظیم خدمت، اور مسلمانانِ ہند کے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے طبقے میں ایک جذبہ عمل پیدا کرنے کی بھرپور سعی

کے باوجود خود نہ کسی احیائی تحریک کا آغاز کیا' نہ ہی کسی جماعت کی تاسیس کی۔ اور اسی بنا پر ہم نے اس سے قبل انہیں شاہ ولی اللہ دہلوی سے مشابہ قرار دیا تھا' جو اگرچہ خود تو آخر وقت تک صرف ایک گوشہ نشین درویش اور معلم و مصنف ہی رہے لیکن انہوں نے ایک جانب مسلمانانِ ہند کی ڈوبتی کشتی کو بچانے کے لئے افغانستان سے احمد شاہ ابدالی کو بلایا' اور دوسری جانب صحیح علم و عمل کی وہ فضا پیدا کر دی جس کے نتیجے میں دوسری ہی نسل میں سید احمد بریلوی کی قیادت و امارت اور شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ اسماعیل کی معاونت و مبایعت سے تحریک مجاہدین ایسی عظیم تحریک برپا ہوگئی۔ عجیب حسن اتفاق ہے کہ بالکل اسی طرح علامہ مرحوم نے بھی مسلمانانِ ہند کی قومی جدوجہد کی کشتی کی ناخدائی کے لئے بلایا قائداعظم محمد علی جناح کو انگلستان سے' اور خود اپنی بھی عملی سرگرمی کو اسی قومی دائرے میں محدود رکھا ـــــ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان ہی کی ''تجدید فکر اسلامی'' تھی جس کے نتیجے میں اولاً مولانا ابوالکلام آزاد نے ''حکومت الٰہیہ'' کا نعرہ لگایا اور 'حزب اللہ'' قائم کی اور بعد ازاں مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی میدان میں اترے' جنہیں حضرت علامہ ہی نے پنجاب نقل مکانی کی دعوت دی جہاں کی فضا علامہ کی ملی شاعری کے ذریعے بہت ہموار اور سازگار ہو چکی تھی۔

نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیب حاضر کی تجلی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراجِ مسلمانی

هکذا کانت صفات سیدنا محمد

علیه وعلی آله الصلاۃ والسلام

ایسے اوصاف تھے سیّدنا محمد ﷺ کے

جو حکمرانوں کو بھی اپنی نجات کے لیے اپنانے ضروری ہیں

اِنَّ اللّٰـهَ وَ مَلٰئِکَتَهٗ یُصَلُّوۡنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ
اٰمَنُوۡا صَلُّوۡا عَلَیۡهِ وَ سَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًاO (33:56)

''اللہ تعالیٰ اور فرشتے رحمت بھیجتے ہیں رسول پر، اے ایمان
والو! رحمت بھیجو اس پر اور سلام بھیجو سلام کہہ کر''

هکذا کان محمد ﷺ ایسے تھے محمد ﷺ

مُحَمَّد صلی اللہ علیه وعلی آله وسلّم ما عَابَ شیئًا قَطّ۔	حضرت محمد ﷺ نے کبھی کسی چیز پر عیب نہیں لگایا۔
محمد صلی اللہ علیه وعلی آله وسلم ما عاب طعامًا قط ؛ اِنِ اشۡتهاہ أکَله و اِلَّا ترکه۔	حضرت محمد ﷺ نے کبھی کسی کھانے پر عیب نہیں لگایا، اگر آپ کو اس کی طلب ہوتی ہو تناول فرماتے ورنہ اس کو چھوڑ دیتے۔
محمد صلی اللہ علیه وعلی آله وسلم یبدأ من لَقِیَهٗ بالسلام۔	حضرت محمد ﷺ کی جس سے ملاقات ہوتی، اس کو سلام کرنے میں پہل کرتے۔
محمد صلی اللہ علیه وعلی آله وسلم یُجالس الفقراء	حضرت محمد ﷺ فقراء کے ساتھ بھی مل جل کر بیٹھتے تھے۔
محمد صلی اللہ علیه وعلی آله وسلم یجلس حیث انتهی به المجلس	حضرت محمد ﷺ مجلس کے اخیر میں جہاں جگہ ہوتی وہیں بیٹھ جاتے تھے۔

محمد صلى الله عليه وعلى آله وسلم كان أجود الناس۔

حضرت محمد ﷺ لوگوں میں سب سے زیادہ سخاوت کرنے والے تھے۔

محمد صلى الله عليه وعلى آله وسلم أشجع الناس۔

حضرت محمد ﷺ لوگوں میں سب سے زیادہ بہادر تھے۔

محمد صلى الله عليه وعلى آله وسلم أشد حياء من العذراء فى خدرها

حضرت محمد ﷺ اُس کنواری لڑکی سے بھی زیادہ باحیا تھے جو اپنے کمرے میں باپردہ رہتی ہے۔

محمد صلى الله عليه وعلى آله وسلم ما سئل شيئا فقال: لا۔

کبھی ایسا نہیں ہوا کہ حضرت محمد ﷺ سے کوئی سوال کیا گیا ہو اور آپ نے 'نہیں' کہا ہو۔

محمد صلى الله عليه وعلى آله وسلم يحلم على الجاهل، ويصبر على الأذى۔

حضرت محمد ﷺ برداشت کرتے تھے بدسلوکی کرنے والے کو اور صبر کرتے تھے تکلیف پر۔

محمد صلى الله عليه وعلى آله وسلم يتبسم فى وجه محدثه، ويأخذ بيده، ولا ينزعها قبله۔

حضرت محمد ﷺ بات کرنے والے کے سامنے مسکراتے تھے، آپ اس کا ہاتھ پکڑ لیتے اور اسکے چھوڑنے سے پہلے ہاتھ چھوڑتے نہیں تھے۔

محمد صلى الله عليه وعلى آله وسلم يقبل على من يحدثه، حتى يظن أنه أحب الناس اليه۔

حضرت محمد ﷺ اپنے سے بات کرنے والے کی بات ایسی توجہ سے سنتے تھے کہ وہ سمجھتا تھا کہ سب لوگوں سے زیادہ آپ اسی سے محبت کرتے ہیں۔

محمد صلى الله عليه وعلى آله وسلم ما أراد احد أن يسره بحديث، الا واستمع اليه بانصات۔

حضرت محمد ﷺ سے کوئی بھی راز کی بات کہنا چاہتا تو آپ خاموش ہو کر اس کی بات کو اچھی طرح سنتے تھے۔

محمد صلى الله عليه وعلى آله وسلم يكره أن يقوم له أحد، كما ينهى عن الغلو فى مدحه۔

حضرت محمد ﷺ کو یہ بات پسند نہ تھی کہ کوئی آپ کے لیے کھڑا ہو جیسا کہ آپ ﷺ اپنی تعریف میں غلو سے منع کرتے تھے۔

محمد صلى الله عليه وعلى آله وسلم اذا كره شيئا عرف ذلك فى وجهه

حضرت محمد ﷺ کو جب کوئی چیز ناگوار ہوتی تو اس کی پہچان آپ کے چہرۂ انور سے ہو جاتی تھی

محمد صلى الله عليه وعلى آله وسلم ما ضرب بيمينه قط الا فى سبيل الله

حضرت محمد ﷺ کبھی کسی کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا، سوائے اللہ کی راہ میں۔

محمد صلى الله عليه وعلى آله وسلم لا تأخذه النشوة والكبر عن النصر

حضرت محمد ﷺ کو تکبر اور بڑائی کسی کی مدد سے نہیں روکتا تھا۔

محمد صلى الله عليه وعلى آله وسلم كان زاهدا فى الدنيا۔

حضرت محمد ﷺ دنیا سے بے رغبتی رکھتے تھے

محمد صلى الله عليه وعلى آله وسلم كان يبغض الكذب۔

حضرت محمد ﷺ جھوٹ سے نفرت کرتے تھے

محمد صلى الله عليه وعلى آله وسلم كان أحب العمل اليه ما داوم عليه وان قل۔

حضرت محمد ﷺ کو سب سے محبوب عمل وہ تھا جس پر ہمیشگی کی جائے اگرچہ تھوڑا ہی ہو۔

محمد صلى الله عليه وعلى آله وسلم كان أخف الناس صلاة على الناس وأطول الناس صلاة لنفسه۔

حضرت محمد ﷺ لوگوں کو سب سے ہلکی نماز (باجماعت) پڑھاتے تھے اور اپنی ذاتی نماز لوگوں میں سب سے طویل پڑھتے تھے۔

محمد صلى الله عليه وعلى آله وسلم كان اذا أخذ مضجعه جعل يده اليمنى تحت خده الأيمن

حضرت محمد ﷺ جب اپنی بستر لیٹتے تو اپنا داہنا ہاتھ اپنی داہنی رخسار کے نیچے رکھ لیتے۔

محمد صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم کان اذا أراد أن ینام وھو جنب غسل فرجہ وتوضأ وضوئہ للصلاۃ۔

حضرت محمد ﷺ جب سونے کا ارادہ کرتے اور آپ جنبی ہوتے تو اپنی شرمگاہ کو دھو لیتے اور نماز کے وضو کی طرح وضو کر لیتے تھے۔

محمد صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم کان اذا جاء ہ أمر أسرہ یخر ساجداً شکرا للہ تعالی۔

حضرت محمد ﷺ کو جب کوئی خوش کن معاملہ پیش آتا تو آپ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے سجدے میں گر جاتے۔

محمد صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم کان اذا خاف قوما قال اللھم انا نجعلك فی نحورھم ونعوذ بك من شرورھم

حضرت محمد ﷺ کو جب کسی قوم سے اندیشہ ہوتا تو آپ یوں دُعا کرتے: اے اللہ ہم تجھے ان کے مقابلے میں کرتے ہیں اور ان کے شرور سے تیری پناہ میں آتے ہیں۔

محمد صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم کان اذا رأی ما یحب قال الحمد للہ الذی بنعمتہ تتم الصالحات واذا رأی ما یکرہ قال الحمد للہ علی کل حال۔

حضرت محمد ﷺ جب کوئی پسندیدہ چیز دیکھتے تو فرماتے: تمام تعریف اُس اللہ ہی کے لیے ہے جس کے احسان سے اچھے کام پورے ہوتے ہیں اور جب کوئی ناگوار چیز دیکھتے تو فرماتے: ہر حالت میں تعریف اللہ ہی کے لیے ہے

محمد صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم کان اذا دعا بدا بنفسہ۔

حضرت محمد ﷺ جب دُعا کرتے تو پہلے اپنے لیے دعا کرتے

محمد صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم کان اذا صلی رکعتی الفجر اضطجع علی شقہ الأیمن۔

حضرت محمد ﷺ جب فجر کی دو رکعتیں پڑھ لیتے تو اپنی دائیں کروٹ لیٹ جاتے۔

محمد صلى الله عليه وعلى آله وسلم كان اذا فرغ من دفن الميت وقف عليه وقال استغفروا الله لأخيكم وسلوا له التثبيت فانه الآن يسأل۔

حضرت محمد ﷺ جب میّت کو دفن کر کے فارغ ہوتے تو (قبر پر) ٹھہر جاتے اور فرماتے: اپنے بھائی کے لیے اللہ سے مغفرت طلب کرو اور اس کے لیے ثابت قدمی کی دُعا کرو کیونکہ اب اس سے سوال کیا جا رہا ہے۔

محمد صلى الله عليه وعلى آله وسلم كان لا ينام الا والسواك عند رأسه فاذا استيقظ بدأ بالسواك۔

حضرت محمد ﷺ جب سوتے تھے تو مسواک آپ کے سرہانے ہوتی تھی پھر جب بیدار ہوتے تو سب سے پہلے مسواک کرتے۔

محمد صلى الله عليه وعلى آله وسلم كان يأكل بثلاثة أصابع ويلعق يده قبل أن يمسحها۔

حضرت محمد ﷺ تین انگلیوں سے کھانا کھاتے تھے اور آپ اپنے ہاتھ کسی کپڑے سے صاف کرنے سے پہلے چاٹ لیتے تھے۔

محمد صلى الله عليه وعلى آله وسلم كان يحب التيامن ما استطاع فى طهوره وتنعله وترجله وفى شأنه كله۔

حضرت محمد ﷺ دائیں طرف سے شروع کرنا پسند کرتے تھے، جتنا ممکن ہوتا، اپنی طہارت میں، جوتا پہننے میں، کنگھی کرنے میں اور اپنے تمام کاموں میں

محمد صلى الله عليه وعلى آله وسلم كان يذكر الله تعالى فى كل وقت۔

حضرت محمد ﷺ ہر وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تھے

محمد صلى الله عليه وعلى آله وسلم كان يصلى الضحى أربعا ويزيد ما شاء الله۔

حضرت محمد ﷺ چاشت کے وقت چار رکعات نماز ادا کرتے تھے اور اس زیادہ بھی پڑھتے تھے جو اللہ چاہتا۔

محمد صلى الله عليه وعلى آله وسلم كان يتحرى صيام الاثنين والخميس۔

حضرت محمد ﷺ پیر اور جمعرات کے روزوں کا اہتمام کرتے تھے

محمد صلى الله عليه وعلى آله وسلم يضطجع على الحصير، ويرضى باليسير، وسادته من أدم حشوها ليف۔

حضرت محمد ﷺ چٹائی پر لیٹ جاتے تھے اور تھوڑی چیز پر راضی ہوتے، آپ کا تکیہ چمڑے کا تھا جس میں چھال بھری ہوئی تھی۔

محمد صلى الله عليه وعلى آله وسلم على الرغم من حُسن خلقه كان يدعو الله بأن يحسّن أخلاقه ويتعوذ من سوء الأخلاق عليه الصلاة والسلام

حضرت محمد ﷺ حسن اخلاق کا پیکر ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے تھے کہ وہ آپ کے اخلاق کو اچھا کردے اور آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام بُرے اخلاق سے پناہ مانگتے تھے۔

عن عائشة رضى الله عنها قالت : كان ﷺ يقول: اَللّٰهُمَّ كَمَا أَحْسَنْتَ خَلْقِيْ فَأَحْسِنْ خُلُقِيْ (رواه أحمد ورواته ثقات)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ یہ دعا کرتے تھے: اے اللہ! جس طرح تو میری خلقت (بناوٹ) کو اچھا کیا ہے ایسے ہی میرے اخلاق بھی اچھے کردے۔

عن أبى هريرة رضى الله عنه قال : كان ﷺ يدعو فيقول: اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الشِّقَاقِ وَالنِّفَاقِ وَ سُوْءِ الْأَخْلَاقِ (رواه أبو داود والنسائى)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ یہ دُعا کرتے تھے: اے اللہ! میں تیری پناہ میں آتا ہوں دشمنی سے، نفاق سے اور بُرے اخلاق سے۔

خلافت یعنی درویشی کی حکمرانی کا قیام

مسئلہ امامت، امارت اور خلافت

اقتباس از مضمون مولانا محمد ایوب دھلوی رحمۃ اللہ علیہ

(بشکریہ، سہ ماہی جی لاہور، جولائی، اکتوبر 2013ء)

ہمارا مضمون تینوں معنوں کو محیط ہے۔ پہلے ہم مسئلہ کی تشقیق کریں گے۔ خلافت یعنی خلیفہ کا تقرر واجب نہیں ہے یا واجب ہے۔ اگر واجب ہے تو کس پر واجب ہے؟ اللہ پر یا بندوں پر یعنی مخلوق پر؟ اگر مخلوق پر بھی واجب ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں عقلاً واجب ہے یا شرعاً واجب ہے۔ پورے مسئلہ کا حصر عقلی کر لیا ہے تا کہ سہولت ہو جائے۔ چار ہی صورتیں ہیں۔ جتنے مذاہب ہیں، انہی چار صورتوں میں آ جائیں گے۔ کسی کا نام لینے کی ضرورت نہیں۔

- جو گروہ یہ کہتا ہے کہ اللہ پر واجب ہے، وہ اہل تشیع ہیں۔
- جو گروہ یہ کہتا ہے کہ واجب نہیں ہے، وہ خوارج ہیں۔
- جو گروہ یہ کہتا ہے کہ بندوں پر واجب ہے ان کی دو قسمیں ہیں۔ ان میں جو گروہ یہ کہتا ہے کہ عقلاً واجب ہے وہ علمائے معتزلہ خیاط، جاحظ وغیرہ ہیں، اور جو اس کو شرعاً بندوں پر واجب کرتا ہے، وہ علمائے اہل سنت ہیں۔

امامت کے جتنے مسائل اور گروہ ہیں وہ ان ہی چار میں سے کسی ایک میں آ جائیں گے، مگر ہمیں گروہوں سے کوئی مطلب نہیں ہے، ہمیں تو اصل مسئلہ سے مطلب ہے۔

ہم نے حال ہی میں تحقیق کی ہے کہ یہ بات کہ خلافت کی ضرورت نہیں ہے، یہ غلط ہے۔ خلافت دراصل واجب کا مقدمہ ہے۔ ''مقدمہ'' اس شے کو کہتے ہیں جس پر کوئی شے موقوف ہو، تو یہ اس شے کا مقدمہ کہلائے گا۔ جیسے چھت موقوف ہے دیوار پر تو دیوار چھت کا 'مقدمہ'

کہلائے گا۔ ''واجب'' یا ''ضروری'' اس شے کو کہتے ہیں جس کے نہ ہونے سے ہلاکت واقع ہو جائے اور جس شے کے نہ ہونے سے ہلاکت تو نہ ہو صرف تکلیف اور دکھ ہو اس کو ''حاجت'' کہتے ہیں۔ کپڑا نہ ہو تو تکلیف پائے گا اور کھانا نہ ملے تو مر جائے گا۔ تو کھانے کی ضرورت ''واجب'' ہے اور کپڑے کی ''حاجت'' ہے۔ مقصود اصل میں بقا ہے، زندگی ہے، حیات ہے۔ یہ ضروری اور واجب ہے۔ کوئی شخص مرنا نہیں چاہتا خواہ وہ کتنا ہی بیمار ہو یا تندرست ہو۔

انسان مدنی الطبع ہے یعنی اپنی بقا کے اسباب تنہا خود مہیا نہیں کر سکتا، جس طرح جانور اپنی زندگی کے کل اسباب مہیا کر لیتا ہے اس کو کسی دوسرے جانور کی معاونت کی ضرورت نہیں۔ برخلاف اس کے، انسان میں تقسیم کار ہوگی کوئی ایک ضرورت پوری کرے گا، دوسرا، دوسری ضرورت مہیا کرے گا۔ تیسرا، تیسری ضرورت پوری کرے گا اور سب مل کر ایک دوسرے کی تمام ضرورتیں پوری کر دیتے ہیں۔

بقائے عالم کے تین اصل ہیں: عمارت، زراعت، خیاطت، (یعنی) رہائش، خوراک اور کپڑا۔ یہ مصالح عالم کہلاتے ہیں، رہنے کے لئے جگہ بنانا، کھانے وغیرہ کے لئے اناج وغیرہ پیدا کرنا اور پہننے کے لئے پوشاک تیار کرنا، یہ تین مصالح عالم ہیں۔ ان کے متعلقات، جیسے آہن گری، اینٹوں کی تیاری، سیمنٹ بنانا وغیرہ، یہ سب مصالح عالم میں شامل ہیں اور جو کام ان مصالح عالم میں شامل نہیں ہیں ان ہی کو حرام کہتے ہیں۔ جو کام بقائے حیات میں دخیل نہیں ہے، وہی حرام ہے۔ کوئی کام ایسا کرنا پڑے گا جو فوراً یا کسی وقت آگے چل کر انسانی زندگی میں دخیل ہو، ایسے تمام کام جائز اور حلال ہیں اور جن کاموں کو انسانی زندگی میں دخل نہیں ہے جیسے تصویر کشی، یہ نہیں کہا جائے گا یہ ناجائز ہے۔ یہ تین اصول اور اس کی بیسیوں فروع، یہ سب ایک شخص واحد نہیں کر سکتا ہر کام الگ الگ اشخاص یا جماعتیں کریں گی۔ اب صورت یہ ہوگی کہ ایک شخص اپنے عمل کا تبادلہ دوسرے شخص کے عمل سے کرے گا۔ اب زراعت والا، اناج دے کر جولاہے سے کپڑا لے لے گا۔ لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ کپڑے والے کو اناج کی ضرورت نہ ہو تو وہ تبادلے کے لئے تیار نہ ہوگا اور اس کا بھی امکان ہے کہ وہ ایک گز کپڑے کے لیے پانچ سیر اناج کی طلب کرے تو کسان کی ضرورت پوری نہیں ہوگی تو اب ایک اور آدمی ہونا چاہیے جو اس تبادلے کا نظام قائم کر دے کیونکہ

یہ نظام قائم کرنا نہ کسان کا کام ہے نہ جولاہے کا۔ یہ نظام قائم کرنے کے لیے کہ تبادلہ میں توازن قائم ہو اور اس متعین توازن پر عمل ہو اس کے دیکھنے کے لئے ایک تیسرے آدمی کی ضرورت ہے جو یہ نظام قائم کرے گا کہ ہر شخص اپنے عمل کو سکہ سے بدلے اسی کو سیم وزر بھی کہتے ہیں اور اس سکے سے ہر دوسرے شخص کے عمل کو بدل لے۔ اس عمل سے کاروبار پیدا ہوگا۔ اب ایسے کام میں جو تنازع ہوں گے، ان کا فیصلہ کرے گا اور جو ایسے عمل ہیں جو زندگی میں مفید نہیں ہیں، ان کو روکے گا، اب جو جماعت یا شخص اس کام کو کرے گا، اسی کا نام خلافت، امارت اور امامت ہے۔

اب ہم یہ کہتے ہیں کہ واجب نام ہے زندگی کا، حیات کا، بقا کا۔ اور زندگی کا قیام اس پر موقوف ہے کہ تنازع نہ ہو اور جو کام غیر مفید ہیں، وہ عمل مٹ جائے۔ تو انسانی زندگی ان دو چیزوں پر موقوف ہے۔ صحیح عمل میں توازن اور بدعملی کا روکنا، تو اب اس کے لئے ایک آدمی چاہیے کہ ان دونوں معاملات میں درستگی کرادے۔ اسی کا نام خلافت ہے۔ زندگی موقوف ہے ترکِ تنازع پر تو ترکِ تنازعہ مقدمہ ہے زندگی کا۔ اور ترکِ تنازع موقوف ہے خلافت پر۔ تو خلافت مقدمہ ہوا زندگی کا اور زندگی واجب ہے۔ تو خلافت مقدمہ واجب ہوگئی، کیونکہ اگر تنازع ترک نہ ہوگا تو زندگی نہ رہے گی۔

اب تقریر یوں ہوگی۔

خلافت مقدمۂ واجب ہے، اور مقدمۂ واجب، واجب ہے۔ لہٰذا خلافت واجب ہے۔ یہی ہم کو ثابت کرنا تھا۔ بڑا حسین بیان ہے، میں نے ایک مرتبہ اجمل خان کے یہاں بیان کیا تھا، سب لوگ جھوم گئے۔ لہٰذا جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ خلافت یا امامت واجب نہیں ہے وہ غلط کہتے ہیں، وہ بات نہیں سمجھے۔

مملکتوں کے استحکام کے بارے میں
علامہ اقبال کے تصورات

رضی الدین سیّد کراچی

علامہ اقبال اپنی فلسفیانہ گفتگو میں اکثر و بیشتر منفرد خیالات پیش کیا کرتے تھے۔ ملت اسلامیہ کے بڑے مفکر اور درد دل رکھنے والے عظیم اسلامی شاعر ہونے کے باعث ان کے خیالات ہمیشہ قابل توجہ رہے۔ دیگر معاملات کے علاوہ مملکتوں کے استحکام کے متعلق بھی انہوں نے بہت نادر خیالات پیش کئے۔ ان کے مندرجہ ذیل تبصرے اگر چہ تخلیق پاکستان سے براہِ راست متعلق نہیں ہیں لیکن ان کی معنویت پاکستان کے سابقہ و موجودہ حالات سے بہت حد تک مماثلت رکھتی ہے۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں:

❁ ''ریاست کا وجود جب ہی قائم رہتا ہے کہ ہر طرح کی صلاحیتوں سے کام لیا جائے۔ گویا اس کی نظر فضائل پر ہو، افراد پر نہ ہو۔ افسوس ہے کہ آگے چل کر مسلمانوں نے اس مثال (فاروق اعظمؓ) سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ عربوں کے نسلی خصائص جس قدر اسلام کے لیے مفید ثابت ہوئے، اتنا ہی ان کی نسلی عصبیت سے (اسے) نقصان پہنچا''۔ (''کتاب اقبال کے حضور''۔ حصہ اوّل۔ سید نذیر نیازی۔ صفحہ ۱۴۷۔ اقبال اکادمی کراچی۔ ۱۹۳۸)

❁ ''(ملّتِ اسلامیہ کی) وحدت پھر سے پیدا ہوگی تو اسی اصول کی بدولت جس پر اوّل اوّل اس کی اساس رکھی گئی، اور جس کا اظہار حیاتِ ملّی کی شکل میں ہوا۔ یہ بڑی غلطی ہوگی کہ ہم اس کے لیے کوئی دوسری اساس تلاش کریں، جیسا کہ ہمارے اربابِ سیاست کر

رہے ہیں۔ ناممکن ہے کہ مسلمان اس طرح متحد ہوسکیں!۔ یورپ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ لوتھر کی تحریک نے اہل مغرب کی وحدت پارہ پارہ کردی۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ عیسائیت یا عیسائیت کے علاوہ بعض اور عوامل بھی تھے جنہوں نے اتحادِ مغرب میں حصّہ لیا۔ بحث یہ ہے کہ یہ اتحاد جیسا بھی تھا ختم ہوگیا۔ اور اس کی بجائے نسلیّت اور وطنیّت نے سر نکالا۔ اقوام یورپ الگ الگ گروہوں میں بٹ گئیں۔'' (ایضاً۔ صفحہ۔ ۱۵۔۳۱۴)

❁ ''جب تک کوئی قوم اپنے نصب العین پر قائم رہتی ہے، اپنی روایات کو زندہ رکھتی ہے، اور اپنے اصل اصول سے پیچھے نہیں ہٹتی، (تو) عوام بے رہرو نہیں ہونے پاتے، خواص ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ قوم کے وجودِ ملّی کو تقویت پہنچتی، اور ترقی اور کامرانی کی منزلوں میں باامید و اعتماد آگے بڑھتی (ہے) بلکہ دوسروں کو بھی اپنی جانب کھینچتی ہے۔'' (ایضاً صفحہ: ۳۹)

❁ ''جب تک ایمان قائم تھا، مسلمانوں میں عزم بھی تھا، ہمت اور حوصلہ بھی!۔ وہ اللہ کا سہارا ڈھونڈتے (تھے) تو تدبیر سے بھی کام لیتے (تھے)۔ انہیں معلوم تھا ''ایمان زندگی ہے، طاقت ہے، قدرت ہے''۔ جب تک مسلمان زندہ رہے، اس نکتے کو خوب سمجھے۔ عام اور خاص، عالم اور جاہل، سب ہی!۔'' (ایضاً صفحہ ۳۹۴)

❁ ''قوموں کی زندگی تحریکوں سے ہے۔ تحریکیں ہیں تو قومیں بھی زندہ ہیں۔ وہ زندگی کے تقاضوں کو سمجھتی اور ان کے پیش نظر مختلف سمتوں میں قدم اٹھاتی ہیں۔ یوں ان کے مستقبل کا رخ متعین ہوتا ہے۔ تحریکیں گویا وہ اقدامات ہیں جو زندگی کی پیش رو حرکت کے باعث ناگزیر ہوجاتے ہیں۔ لیکن تحریک جب ہی تحریک ہے کہ اس سے قوم کی وحدت میں فرق نہ آئے۔ بلکہ جس انداز سے بھی آگے بڑھے، اس سے حیاتِ ملّی ہی کو تقویت پہنچے۔ افراد سمجھیں، کوئی منزل ہے جو ان کے سامنے ہے، اور جس کو انہیں طے کرنا ہے۔ کوئی کام ہے جسے سرانجام دینا ہے''۔ (ایضاً۔ ص ۲۸۶)

❁ ''ماضی سے تعلق قائم رہنا (بھی) ضروری ہے۔ قدامت پسندی، قوموں کی زندگی میں ایک تقویت بخش عنصر ہے۔ گو تنہا یہ عنصر کافی نہیں۔ قدامت پرستی سے کچھ مقصود ہے تو یہ کہ

ہمارا ماضی محفوظ رہے (لیکن) آگے بڑھنا ہی (اصل) زندگی ہے۔'' (ایضاً، صفحہ۔۲۸۶)

❁ ''اسلام کی روح اجتماعی ہے۔ لہٰذا عالمِ اسلام کا زوال وانحطاط رُک سکتا ہے تو کسی ایسی تحریک سے رُک سکتا ہے جو اس پورے کل پر محیط ہو جسے ہم دین اسلام سے تعبیر کرتے ہیں''۔ (ایضاً۔ صفحہ۔۲۸۸)

☆ افسوس کہ ملک میں علامہ کا نام تو بہت لیا گیا، ان کا کلام بھی ہر ذریعۂ ابلاغ پر چھایا رہا، ان کے ایام بھی بہت منائے گئے، اخبارات کے ایڈیشن بھی ہر سال پابندی سے شائع ہوتے رہے، اور ان کے نام سے قومی تعطیلات بھی بہت منائی جاتی رہیں، لیکن افسوس کہ ان کے پیغام کو ہمارے ہاں مطلق اہمیت بھی نہیں دی گئی۔ پاکستان میں یہ عظیم ملّی شاعر بس کتابوں اور تقریروں ہی میں بند ہو کے رہ گیا۔ اس منفرد اسلامی، قومی و بے باک شاعر کو نوابوں، جاگیرداروں، جنرلوں، افسر شاہی اور حکومتی مقتدرہ نے کبھی گھاس نہیں ڈالی۔ پاکستان میں اگر علامہ اقبال کے خیالات و تصورات پر مبنی ایک معاشرہ قائم کر لیا جاتا تو کسی کو کیا شک ہے کہ وہ معاشرہ پھر اپنی عظیم الشان بلندی و تعاونِ انسانیت کے اعلیٰ درجے پر ہوتا!۔

باب 2

☆ حیاتِ انسانی کا آغاز اور ارتقائی مراحل (I) 53

☆ حیاتِ انسانی کا آغاز اور ارتقائی مراحل (II) 76

☆ مقتدر طبقات اور سفّاک بادشاہتوں کے دوام کے لیے 87
دونئی جہتوں (DIMENSIONS) کا اضافہ

☆ ظلم کے خلاف بولنے والے مصلحین
(انبیاء کرام علیہم السلام) کا قتل 90

حیاتِ انسانی کا آغاز اور ارتقائی مراحل (I)

1 1۔ آسمانی ہدایت یعنی پیغمبروں کی تعلیمات کے مطابق انسان کے دو وجود ہیں اور اس کی تخلیق دو مراحل میں ہوئی ہے۔ ایک غیر مرئی اور نوری وجود ہے یعنی روحِ ربّانی اور دوسرا مادّی اور خاکی وجود ہے جو حیوانی زندگی (ANIMAL LIFE) کے مشابہ ہونے کے باوجود کئی پہلوؤں سے مختلف اور ممیّز ہے۔ آسمانی ہدایت کی رُو سے پہلے 'روح' پیدا کی گئی۔ خالق کائنات نے تمام انسانوں کی روحیں یکبارگی پیدا فرمائیں اور ان سے ایک عہد (عہدِ الست) لے کر مکالمہ اور 'وحی' کا شعور دیا۔ جبکہ جسدِ انسانی دوسرے مرحلے میں حیاتِ حیوانی کے بعد کسی مرحلہ پر پیدا کیا گیا۔ علمائے اسلام کے نزدیک یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام کو بطورِ خاص پیدا فرمایا یا انسانی شکل کی لاتعداد مخلوق دنیا میں ایک عرصے تک رہی ہو اور تہذیب و تمدّن کے ابتدائی مراحل طے کر کے ایک خاص حد تک 'مہذّب' ہونے کے بعد ایک مہذّب ترین اور باصلاحیت وجود کو چن کر اس میں روح انسانی ڈالی گئی ہو جس سے قرآن مجید کے مطابق پہلا مکمل انسان وجود میں آیا ہو۔ سورۃ الاعراف (07:11) میں اس تصور کو تقویت ملتی ہے۔ واللہ اعلم

2۔ حضرت آدم علیہ السلام پہلے مکمل انسان اور پہلے پیغمبر ہیں۔ انسانی زندگی ابتدائی مراحل سے گزر کر آہستہ آہستہ نسلاً بعد نسلٍ تہذیب کے نئے مراحل سے روشناس ہوئی اور یوں مدنیّت یا 'تمدّن' کا وہ طویل سفر شروع ہوا جو آج بھی جاری ہے۔

مل جل کر رہنا انسان کا خاصّہ ہے۔ لہٰذا ابتدا ہی سے انسانی زندگی کے دو گوشے نمایاں ہوتے گئے۔ ایک انفرادی زندگی اور دوسرے اجتماعی زندگی۔

سوسائٹی اور معاشرہ

ابتدائی صدیوں میں انفرادی زندگی کا دائرہ زیادہ بڑا تھا جبکہ اجتماعی زندگی کا دائرہ مختصر۔ وقت کے ساتھ تجربہ، معلومات اور ضروریات بڑھتی گئیں تو انسان کے اندر چیزوں کی ملکیت (OWNERSHIP) کا شعور پیدا ہوا۔ اشیائے ضرورت کو جمع کر کے دوسروں کو محروم کرنے کا رجحان سامنے آیا۔ مکان، لباس اور خوراک کے ناگزیر ہونے کا احساس پیدا ہوا۔ اشیائے ضرورت کا ادھار لینا، واپس کرنا اور ناگزیر حالات میں تبادلے کے تصوّر نے جنم لیا۔ یہیں سے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کی چیزیں چوری کر لینے اور زبردستی چھین لینے کا ناپسندیدہ تجربہ ہوا۔ ظلم، زیادتی، چوری ڈاکہ سے بات بڑھی تو لڑائیاں جھگڑے، خون خرابے اور قتل وغارت کی شکلیں سامنے آئیں، جس سے اجتماعی زندگی کا داعیہ اُبھرا اور 'ضرورت ایجاد کی ماں ہے' کے اُصول کے تحت انسان نے اجتماعی زندگی کے ضابطے اور اُصول وضع کرنے کی طرف بھی توجہ دی ہے۔

خاندان

انسانوں کے مل جل کر رہائش پذیر ہو کر اپنی ضروریات کو پورا کرنے کی ضرورت کے لیے ابتدائی شکل ایک فطری مرحلہ یعنی مرد، عورت اور اولاد پر مشتمل خاندان کا تصوّر تھا۔ اس مرحلہ پر خاندان کے افراد فطرت وجبلّت کے تقاضوں اور خارجی ماحول کے منفی رجحانات کی وجہ سے باہمی جڑے رہتے تھے اور تحفظِ ذات اور تحفظِ نسل کا جذبہ خاندان کی بنیاد تھا۔

برادری اور قبیلہ

خاندان نے وسعت اختیار کی تو باپ کے بہن بھائی، والدہ کے بہن بھائی اور ان کی اولادیں بھی خاندان کا حصہ سمجھے گئے لہٰذا برادری کا تصوّر اُبھرا اور 'دُور کی رشتہ داری' اور دُور کی رہائش کے باوجود اپنائیت اور یگانگت کے احساس نے 'قبیلہ' (TRIBE) کا تصوّر پیدا کیا۔ اس مرحلہ پر رنگ، نسل، رشتہ داری کے ساتھ زبان کا اشتراک بھی سامنے آنے لگا۔

اجتماعیتّ کے تقاضے

انسان کو جن کیفیّات اور تجربات سے گزرنا پڑتا ہے اس کے نتیجے میں کسی ضرورت کا

احساس ہوتا ہے، جلد ہی پھر اس ضرورت کی تکمیل اور فراہمی کا احساس ہوتا ہے اور پھر وہ ضرورت زندگی کا حصہ بن جاتی ہے۔ اجتماعیت کی ابتدائی شکل خاندان میں افراد دس بیس سے بڑھ کر پچاس تک ہوتے ہوں گے مگر قبیلہ میں سو دوسو خاندان اکٹھے ہوئے تو قبیلہ کے معاملات نمٹانے، جھگڑے چکانے، صلح صفائی کرانے اور اختلافات کو رفع کرنے کے لیے خاندان کے مقابلے میں زیادہ مشکلات پیش آئیں اور وقت بھی زیادہ صرف ہونے لگا تو ـــــ قبیلہ کی سربراہی کا تصوّر اُبھرا کہ قبیلہ ہے تو اس کا ایک مستقل سربراہ ہونا چاہیے۔ اس سربراہی کے لیے کوئی شخص ہمہ وقت ہو تو اس 'سربراہ' کے گھر (بیوی بچوں) کے اخراجات قبیلہ کے دوسرے خاندان اور افراد برداشت کریں۔ اس طرح قبیلہ کے ساتھ 'سرداری' یا سربراہی کا تصوّر آیا اور وقت گزرنے کے ساتھ اس تصوّر کے مثبت اور منفی پہلو بھی سامنے آنے لگے۔

2 بعض قدیم اور جدید فلاسفہ کے نزدیک انسان چند نامیاتی مرکبات (ORGANIC COMPOUNDS) اور چند غیر میاتی مرکبات (IN ORGANIC COMPOUNDS) کا مجموعہ ہے اور بس۔ ایسے حضرات کے نزدیک پھر انسان صرف حیوان ہے اور تحفّظ ذات و نسل اور بقائے ذات کے سوا کچھ نہیں۔ انسانی فطرت میں کسی اعلیٰ مقصد، بلند خیال اور ذوقِ لطیف کا کھوج لگانا بے سُود ہے۔

ان خیالات کے حامل اہل علم فلاسفہ بھی 'اخلاق' اور 'فلسفۂ اخلاق' کی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں مگر ان کا فلسفۂ اَخلاق حیوانوں اور حشرات الارض کے اجتماعی شعور اور باہمی احترام کے رویّوں سے زیادہ گہرا نہ ہوسکتا ہے نہ ہے۔

ان حضرات کے نزدیک اَزمنہ قدیم کی اصطلاح میں انسان ان چار عناصر (ہوا، آگ، مٹی اور پانی) سے بنا ہے اور زندگی کے پانے سے ان عناصر میں ایک خاص ترتیب آجاتی ہے اور موت انہیں عناصر کے بکھر جانے کا نام ہے اور عصر حاضر میں سائنس اور سوشل سائنسز کے بے پناہ پھیلاؤ کے باعث آج کا انسان ان عناصر کی تعداد 200 تک بیان کرتا ہے اور تحقیقی و مشاہداتی ترقی کی وجہ دُوربین وخوردبین (TELESCOPE & MICROSCOPE) کی وجہ سے ذرّات کی اصطلاح سے گہرا اُتر کر ایٹم، پروٹون اور الیکٹرون تک پہنچ گیا ہے۔ نوعیّت

(QUALITATIVE) کا کوئی فرق نہیں ہے طرزِ استدلال میں صرف علم کی وسعت اور گہرائی کی وجہ سے اصطلاحات کی بھرمار، شعبہ ہائے علوم کی کثرت کے نتیجے میں کتابوں کا بوجھ انسان نے اپنے اوپر لاد لیا گیا۔ قدیم انسان اور جدید انسان کی 'فکر' اور 'حقیقت انسان' تک رسائی میں نارسائی ایک مشترک 'محرومی' ہے جو سائے کی طرح ساتھ لگی ہوئی ہے۔

3 ہمارے نزدیک (یعنی آسمانی وحی کے مطابق) انسان رُوح اور جسد کے مجموعے کا نام ہے اور رُوح کی وجہ سے ہی انسان مسجودِ ملائک بنا اور اشرف المخلوقات کہلاتا ہے۔ اسی روح کے وجود کے اثبات اور تحفُّظ کا اثر یہ ہے کہ انسان میں شعورِ ذات کے بعد خالق وربّ کا شعور ہے وہی ہستی شدید محبت کرنے کے لائق ایک ہی ہستی ہے۔ آخری آسمانی ہدایت قرآن مجید میں واضح طور پر آیا ہے کہ انسان جب چہار طرف پھیلی کائنات اور مختلف واقعات وحادثات پر غور کرتا ہے تو یہ عمل اس کے اندر موجود 'غور وفکر' کے فطری جذبہ کو بیدار کرتا ہے اور انسان کائنات کو ایک بامقصد تخلیق کی حیثیت سے پہچان لیتا ہے اور اس کے خالق وربّ سے شدید محبت کرنے والا بن جاتا ہے اور جو لوگ غور وفکر کے اس عمل میں اپنے پہلے سے طے شدہ بعض نظریات اور 'من پسند' باتوں کی روشنی میں ہی آگے بڑھتے ہیں وہ ـــــ 'ظلم' کرتے ہیں اور غلط فیصلے کرتے ہیں اور ماحول میں موجود بعض بے قدر چیزوں کو بہت زیادہ اہم بنا دیتے ہیں (جیسے دیوی دیوتاؤں اور بتوں کا تصوّر) اور حقیقی اور مؤثر 'قوتوں' کو کم اہمیت دیتے ہیں یا نظر انداز کرنے کا رویّہ اختیار کرتے ہیں۔ یہی ظلم ہے کہ انسان حیوانی سطح پر گر جاتا ہے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے جس سے مادی وجود اور بقا وتحفُّظِ ذات ونسل کے علاوہ اسے کچھ نظر نہیں آتا۔

حضرت آدم علیہ السلام پہلے حقیقی انسان اور پہلے پیغمبر ہیں لہٰذا آسمانی وحی کے مطابق انسانیت کے قافلہ کے سفر کی ابتداء ایک واضح، شعوری، حقیقی اور وجدانی منزل سے ہوئی ہے اور عہدِ الست، روح ربّانی کا القاء اور مسجودِ ملائک ہونے جیسے مراحل کی ہلکی ہلکی سی یاد انسانیت کے اجتماعی شعور میں آج بھی تازہ ہے اور ابلیس لعین کا احساس اور خیر وشر کی ایک داخلی وخارجی جنگ کا شعور بھی قلب انسانی میں موجود ہے اس سارے اجتماعی شعور کا حاصل یہ ہے کہ ہر انسان کی شخصیت میں اس مرحلہ کا ایک عکس موجود ہے جو ضمیر کہلاتا ہے اور عقل، تعقّل، شعور کی طرح ایک زندہ قوت

ہے اس کو CONSCIENCE اسی لیے کہا گیا ہے کہ دیگر سائنسز اور انسانی علوم سے بڑھ واضح سائنس ہے جہاں ساری انسانی فکر مرتکز ہو جاتی ہے (واضح رہے کہ انگریزی میں ضمیر کے لیے CONSCIENCE کا لفظ SCIENCE کے شروع میں CON کا سابقہ لگا کر بنایا گیا ہے جو ساری SCIENCE کو ایک جگہ مرتکز کرنے کی طرف اشارہ ہے جیسے انگریزی میں TRACT سے CONTRACT، TACT سے CONTACT، VERGE سے CONVERGE، SIST سے CONSIST کے الفاظ ہیں)

یہی ضمیر انسانیت کا حاصل ہے اور تاریخ انسانی میں کچھ بگڑے ہوئے ماحول کے لوگوں اور معاشروں کے علاوہ اس لفظ کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ مثلاً ایک صدی قبل تک آج کے مغرب میں بھی CONSCIENCE کی اہمیّت سمجھی جاتی تھی اور اسے بنیادی انسانی وصف اور شعورِ ذات اور شعورِ الٰہ کے لیے ایک پیمانہ اور رہنما سمجھا جاتا تھا۔ جیسے

1. A CLEAR CONSCIENCE YIELDS A GOOD NIGHT'S SLEEP.
2. A CLEAR CONSCIENCE IS THE GREATEST ARMOR. (CHINESE PROVERB)
3. CONSCIENCE IS MAN'S COMPASS. (VINCENT VAN GOGH)
4. CONSCIENCE IS THE VOICE OF THE SOUL. (POLISH PROVERB)

گویا ابتدائی انسانی معاشرہ اور اجتماعیّت کا سفر (جس کا اوپر تذکرہ ہے) اسی ضمیر کی روشنی میں بڑے معصومانہ جذبوں، اُمنگوں اور حوصلوں کے جلو میں شروع ہوا تھا۔ ابلیس اور ابلیسی قوتوں کا عمل دخل اور ردّعمل ایک ضمنی عمل اور اس کا ردّعمل ہے نہ کہ بنیادی اور حقیقی۔

4 وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نظر آنے اور محسوس ہونے والی بنیادی انسانی ضرورتوں (جیسے بھوک، پیاس، بیماری اور درد کا دور کرنا وغیرہ) کی فراہمی تو سب سے اہم قرار پائی اور انسان ان ضرورتوں (BASIC NEEDS) کو پورا کرنے کے لیے ہی تگ و دو کرنے لگا۔

اس بنیادی ضرورتوں کے احساس اور ان کی درجہ بدرجہ اہمیّت کی وجہ سے ایک نیا احساس جو انسان کے اندر پیدا ہوا وہ چیزوں کی ملکیت (OWNERSHIP) کا تھا۔ جانور، درختوں کے پھل، استعمال کا سامان اور پینے کا پانی قدرت نے وافر مقدار میں بنائے ہیں مگر کوئی

شخص ان چیزوں کو جنگل سے حاصل کر کے اپنے قبضے میں کر لے اور اپنے رہنے کی جگہ لے آئے تو اخلاقاً اس شئے پر اس کا حق استعمال فائق ہے کہ اس نے محنت سے اس کو قدرتی خزانوں سے حاصل کیا ہے۔ اسی طرح رہنے کے غار یا کھاس بھونس کا جھونپڑا، کوئی لوہے یا پتھر کا ہتھیار نما ٹکڑا، لکڑی کا کوئی ٹکڑا، شکار کیا ہوا جانور وغیرہ وغیرہ کا حق استعمال انسان کو حاصل ہوا اور یہ سب نے تسلیم کر لیا اور عقلاً اور فطرتاً قدر مشترک کے طور پر سب نے مانا اور یوں CONSESUS ہو گیا کہ یہ اُصول قابل قبول ہے۔ یہاں سے آگے چند نکات قابل غور ہیں:

☆ یہاں سے ابلیسی ذہن نے کام شروع کیا اور انسان کو اپنی ضرورت سے زیادہ سامان جمع کر لینے کا سبق پڑھایا۔ قدرتی وسائل اور ذرائع پیداوار پر سب انسانوں کو برابر کا حق ہے مگر طاقت، حیثیت، افرادی قوت وغیرہ کی بنیاد پر ضرورت سے زیادہ اشیاء یا ایک لمبے عرصے تک کے لیے اپنی ضروریات جمع کر لینے کا جذبہ پروان چڑھا۔

☆ جب ایک باحیثیت شخص کے پاس ضروریات کی وافر اشیاء دستیاب ہیں وہ اب روزانہ جا کر ان ضروریات کی فراہمی میں وقت نہیں لگائے گا آرام کرے گا اپنے گھر بیٹھے گا فارغ ذہن کے ساتھ کئی طرح منصوبے بنائے گا اور وسائل پر مزید قبضہ کے طریقے تلاش کرے گا۔

☆ ایک قدم اور آگے بڑھ کر انسانوں کے درمیان بیماری، بڑھاپا، اور معذوری کی صورت میں ضرورتوں کی فراہمی میں رکاوٹیں پیدا ہوئیں تو چیزوں کا قرض لینا، تبادلہ، دوسرے کے سامنے اپنی احتیاج رکھنا اور محتاج بن کر جانا وغیرہ کے احساسات پیدا ہوئے۔

☆ یہاں سے ذرا آگے بڑھے تو ابلیس لعین نے یہ بات سکھائی کہ.....صاحب حیثیت دوسروں کو انکار کرے، بے عزت کرے، استعمال کی چیزیں نہ دے اور ردّعمل کے طور پر محرومین اور سائلین 'تنگ آمد بجنگ آمد' کے مصداق چھینا جھپٹی، چوری، سینہ زوری، ڈاکہ، جسمانی مار پیٹ اور انسانی جان کا قتل بھی شروع ہو گیا۔

☆ کہا جا سکتا ہے کہ لوگوں نے آسمانی ہدایت کو بھلا کر گمراہی کا راستہ اختیار کیا تو انسان کے لیے یہ مصائب و آلام اور پریشانیاں سامنے آ گئیں۔

5 اس مرحلہ پر ہدایت کیا تھی؟

آسمانی ہدایت کے برخلاف انسانوں میں سب سے پہلے اقتصادی اور مالیاتی بُرائی یہ درآئی کہ انسان جو اشیاء جیسے تیسے (جائز و ناجائز) جمع کرلیتا ہے وہ اس کی ملکیت ہے۔ یہ تصورِ ملکیت (OWNERSHIP RIGHT) ہی ہے کہ جس نے آگے بڑھ کر پوری انسانی سوچ کو متاثر کیا ہے۔ اگرچہ وقتاً فوقتاً ہر معاشرے میں جو پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے آئے انھوں نے بھی، اور بعد والے پیغمبروں علیہم السلام نے بھی، ملکیت کی بجائے 'امانت' کا تصور دیا ہے مگر ابلیسی سوچ کے تحت اور دیگر کئی عوامل کے نتیجے میں یہ تصور پھیلتا چلا گیا اور ایک وقت میں مشرق و مغرب کے ممالک میں قبول کرلیا گیا۔

6 تصورِ ملکیت اور اجتماعیت

تاریخ انسانی میں تصوّرِ ملکیت نے جتنا نقصان انسانیت کو پہنچایا ہے اس کا کوئی اندازہ ممکن نہیں۔ قتل و غارت کے علاوہ تہذیب و تمدّن، اَخلاق، احترامِ باہمی، حقوقِ انسانی اور صنف نازک سمیت کمزور طبقات کا جس طرح استحصال کیا گیا اس کی تفصیلات جان کر ہی انسان پر لرزہ طاری ہوجاتا ہے۔ بقولِ اقبال

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرت انساں کی قبا چاک

تصوّرِ ملکیت سے ہی وسائل رزق کا تصوّر پیدا ہوا۔ پھر ان وسائل پر قبضہ جمانے اور اپنے لیے یا اپنے خاندان کے لیے مخصوص کرنے کا تصوّر پیدا ہوا۔ اسی تصوّرِ ملکیت کے پہلو سے کئی دیگر مجرمانہ اَخلاقی اور انسانی جرائم نے جنم لیا۔ مثلاً:

6.1 مقتدر طبقہ یا قبیلے کا سردار، اور اس کا خاندان (قریبی رشتہ دار) نے وسائل پر قبضہ کرلینے کے بعد اس کے تحفّظ کے لیے 'عصبیّت' کے تصوّر کو فروغ دیا اور نسل انسانی ایک وحدت ہونے کے باوجود اور ایک انسانی جوڑے (حضرت آدم اور حوا علیہما السلام) کی اولاد ہونے کے ناطے اخوتِ باہمی اور احترامِ باہمی یعنی مساوات انسانی کے نظریہ کو اپنا کر اس کو فروغ نہیں دیا بلکہ انسانوں نے اپنی علیحدہ اَملاک کے تحفّظ کے لیے دوسروں سے اپنی شناخت الگ کرنے پر عمل کیا ہے اور یوں نسل انسانی تقسیم در تقسیم کے عمل سے آج تک گزر رہی ہے۔

6.2 تصوّرِ ملکیت کے نتیجے میں اپنی ملکیّتی اشیاء اور ذرائع پیداوار کی حفاظت کی خاطر جتھا بندی، قبضہ گروپ اور دوسروں کو منظّم نقصان پہنچانے کے تصوّر پر مبنی تنظیموں نے جنم لیا ہے۔ ایک دوسرے کو نقصان پہنچانا، قتل وغارت، وسائل پر قبضہ وغیرہ اسی تصوّر کا شاخسانہ ہے۔

6.3 تصورِ ملکیت اور اسلحہ سازی

تاریخ انسانی میں اسلحہ سازی کی صنعت پتھر کے زمانے سے آج کے ایٹمی دور کے خود کار ہتھیاروں تک کئی مراحل سے گزری ہے۔ مگر دنیا میں بنیادی طور پر اس صنعت کا مقصد وسائل رزق اور اپنی ملکیّتی اشیاء سے دوسروں کو دور رکھنے، اپنے حقِ ملکیّت کا تحفظ اور کسی گروہ کی طرف سے حملہ کرنے کے امکانات کی اطلاعات پر بھی فوری حملہ کر کے اس گروہ کا خاتمہ (TO NIP THE EVIL IN THE BUD) ہی تھا اور یہی نظریہ اور THEME آج تک دنیا میں پھیلا ہوا ہے اور ہر طاقت (چاہے علاقائی ہو یا عالمی) ہر گروہ، ہر سردار، ہر حکمران تاریخ کے اوراق میں اسی اُصول پر عمل کرتا نظر آتا ہے اِلا ماشاءاللہ (سوائے چند استثنا آت کے)

اس سلسلے میں اہم بات یہ ہے کہ تصوّرِ ملکیّت پہلے ہی ایک 'بلا' یا EVIL کے طور پر اُبھرا اس EVIL اور انسان دشمن، اخلاق دشمن اور وحی دشمن قوتوں کو اسلحہ سے مسلح کر دیا گیا اور حق کے مقابلے میں 'باطل' اور صحیح کے مقابلے میں غلط کو مضبوط کر دیا گیا۔

ابتدا میں یہ اسلحہ سازی بڑی سادہ اور بے ضرر سی کاوش معلوم ہوئی ـــــ مگر وقت کے ساتھ اس 'عفریت' نے جب ترقی کی اور یہ فتنہ جوان ہو کر سامنے آیا ہے تو آج سے نہیں گزشتہ تین ہزار سال کی تاریخ گواہ ہے کہ انسانیت کو سر چھپانے اور منہ چھپانے کی جگہ میسّر نہیں ہے اور اسلحہ ساز اور اسلحہ بردار گروہ دندناتے پھرتے ہیں۔

6.4 تصورِ ملکیت، محافظ دستے اور ذاتی فوج

تصوّرِ ملکیت کا نظریہ جو ابتداءً بڑا سادہ، فطری اور بنیادی ضروریات کا حصہ محسوس ہوتا ہے، وقت کے ساتھ ساتھ خوفناک شکل اختیار کرتا چلا گیا۔ قبیلہ کے وسائل کا چند مقتدر افراد کے ہاتھوں میں جمع ہو جانا اس فیصلہ کی بنیاد بن گیا کہ اب مقتدر طبقہ خود (باپ بیٹا اور گھر کے دیگر افراد) اس اثاثہ کی حفاظت نہیں کر سکتے لہٰذا بڑی حویلی، مویشی، سواری کے جانور، نوکر، خدمتگار،

لہٰذا قبیلے کے سردار کے ذاتی محافظ، پہرے دار اور ذاتی فوج کا تصوّر اُبھرا۔ قبیلے کے سردار کے اخراجات کے اس اضافے کا بوجھ بالواسطہ طور پر قبیلے کے افراد ہی پر پڑا۔ قبیلے کے سردار کے کرّ وفر اور ٹھاٹھ باٹھ کا اثر بھی قبیلے کے عام افراد پر ہی پڑا اور اس ٹھاٹھ باٹھ کا ایک طرف نتیجہ یہ نکلا کہ شریف لوگ دہشت زدہ ہوگئے۔ جبکہ دوسروں کے وسائل پر چلنے والا طبقہ 'محافظ' بن کر لوٹنے والے گروہ میں شامل ہوگیا۔ یہیں سے اگلا قدم یہ بنا کہ سردار سے اختلاف کی شکل میں لڑائی کی صورت آجاتی اور بچ جانے کی صورت میں سردار کا مخالف طبقہ نقل مکانی کر کے کہیں اور جا آباد ہوتا اور 'سرداری' ذہنیت کا کوئی گھرانہ سردار، ملِک یا چودھری بن کر حکمرانی کے منصب پر خود قبضہ کر کے عیش دوام کا راستہ نکال لیتا۔

7 قبیلے کی سرداری کا معاملہ اجتماعیّت کی ابتدائی شکل تھی۔ قبیلے کا سردار جتنا اعلیٰ منتظم، مدبّر، سمجھدار اور ذہین ہوتا وہ اتنا ہی کامیاب سردار ثابت ہوتا اور قبیلے کے افراد امن و امان کے ساتھ اپنی زندگی کے دن گزارتے۔

☆ صدیوں کے تعامل سے اس تصوّر نے کئی رہنما اصول وضع کر لیے اور کئی تجربات کیے گئے جس کی روشنی میں قبیلہ یا بڑا قبیلہ یعنی معاشرہ (سوسائٹی) میں ذمہ داریوں اور مراتب کا تعین کیا جانا آسان کر دیا گیا۔ تاریخ انسانی کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہے کہ چونکہ قبیلوں کے معاملے میں غالب اکثریت کسی ایک ہی بڑے انسان کے اعزہ و اقارب ہوتے تھے لہٰذا ___ شروع شروع میں اونچ نیچ اور اعلیٰ و ادنیٰ کا تصوّر دبا رہا۔

اس معاشرہ یا سوسائٹی میں عموماً تقسیم پیشیوں کی بنیاد پر ہوئی اور ایک ہی نسل اور برادری کے لوگ ہونے کی بنا پر ایک دوسرے کے مقابلے میں پیشہ ہی انسانوں کی پہچان قرار پایا۔ چنانچہ قوم لوہار قوم کمہار، قوم موچی وغیرہ کی تقسیم اسی بات کو ظاہر کرتی ہے۔

☆ قدیم جنوبی ایشیا کے باسیوں نے انسانی آبادی کے مابین پہچان کے لئے اس ناگزیر ضرورت کو مستقل بنیادوں پر خاندانی تقسیم بنا دیا۔ اس تقسیم کا فائدہ چونکہ سب سے اونچے اور مقتدر طبقے کو پہنچانا مقصود تھا جو فائدہ صدیوں سے اسی طبقے کے افراد سمیٹ رہے ہیں لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ انسانی آبادی اور ہم وطنوں کی یہ تقسیم انتہائی ظالمانہ ہی نہیں انسان دشمن، اخلاق دشمن اور ابلیسی

ذہنیت کی پیداوار ہے جس نے انسانوں کے درمیان ہی نفرت کی دیواریں کھڑی کر دیں اور انسان کو اپنے جیسے انسانوں کا غلام بنا دیا۔

☆ انسان عملی میدان میں پتھر کے زمانے سے ترقی کر کے آج ڈیجیٹل دور میں آ گیا ہے ہزاروں سالوں کے اس سفر میں کئی اہم موڑ آئے اور کئی انقلابات بھی گزر گئے طرز بود و باش بدل گئی، سواریاں بدل گئیں، غاروں سے آغاز کر کے انسان نے عالی شان مکان بنانے کا فن ایجاد کر لیا، علم نے بے پناہ وسعت اختیار کر لی، سفر آسان ہو گئے، دُوریاں ختم ہو گئیں، زیب و زینت کے انداز بدل گئے، انداز حکمرانی بدل گیا، کھیل کود کے مشاغل، فارغ اوقات کے مشاغل، تنہائی کے لمحات کی مصروفیات غرض سب کچھ بدل گیا ہے مگر کیا کہیے اگر کوئی چیز نہیں بدلی تو جنوبی ایشیا میں شودر اور دلت کی قسمت نہیں بدلی اور ان کی پہچان نہیں بدلی اور باقی دنیا میں حکمرانی پر قابض خاندان تو بدل گئے مگر اندازِ حکمرانی جوں کے توں وہی رہے بلکہ وقت کے ساتھ اس میں تاریخی تسلسل کی 'برکت' اور SANCTITY بھی شامل ہو گئی اور "OLD IS GOLD" کے مصداق لوگوں میں اس بات کو HAMMER کر دیا گیا ہے کہ دنیا میں واحد یہی اندازِ حکمرانی قابل عمل ہے اور حاکموں کو حاکم اور محکوموں کو محکوم بنائے رکھنے میں ہی دنیا کا امن قائم ہے۔

☆ دنیا میں گزشتہ معلوم تاریخ کے سات ہزار سالوں میں ظالمانہ جابرانہ طویل خاندانی حکمرانی کے ادوار کے صحراء میں کہیں کہیں نخلستان ہیں جہاں آسمانی ہدایت کے مطابق عدل وانصاف، مساوات، بھائی چارہ، عوتوں کی عزت افزائی، محنت کی عظمت اور وسائل رزق پر تمام انسانوں کا برابر حق ہونے کی بات کی گئی بلکہ اس پر عمل بھی کیا گیا، یہاں جانفزا ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بھی انسانیّت کا مقدر بنے بلکہ آج تک انسانیت کے اجتماعی شعور میں ایک سہانے خواب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

☆ دنیا کی تاریخ میں فکر اور سوچ کے دو دھارے مسلسل جاری ہیں اور آسمانی ہدایت بتاتی ہے کہ چونکہ انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر اس دنیا کے 'کمرۂ امتحان' میں اس لئے لایا گیا ہے کہ وہ اپنی پسند اور وجدان کی روشنی میں انسان دوست، اخلاق دوست، ماحول دوست اور خدا دوست راہ اپنائے اگرچہ اس کے لئے ابلیسی قوتوں کے پرچار، پراپیگنڈے اور نفسیانی خواہشات کے دباؤ

میں آ کر انسان دشمن اور اخلاق دشمن، ماحول دشمن اور خدا بیزار رویّے اپنانے کی بھی آزادی اور کھلی چھوٹ ہے جس کا نتیجہ دنیا میں ضمیر کی خلش (GUILTY CONSCIENCE) ہے اور مرنے کے بعد ایک دوسری زندگی میں دائمی سزا ہے۔ جبکہ اوّل الذکر لوگ مرنے کے بعد انعام کے طور پر اچھی زندگی کے حقدار سمجھے جائیں گے اور ان کو انسانی ضرورت کی بے بہا نعمتیں ان کی توقعات سے بڑھ کر عطا کر دی جائیں گی۔

اوّل الذکر راستے کی رہنمائی کے لئے پیغمبر ﷺ تشریف لائے اور دوسرے راستے کی طرف ابلیس (LUCIFER) اور بگڑے ہوئے لوگ نمونہ بن کر اپنی طرف بلاتے ہیں اور اپنے نظریات کے جال کے جھوٹے وعدوں اور ناپائیدار وقتی لذتوں کا گرویدہ بنا کر خالق کائنات کے راستے سے دُور کر دیتے ہیں۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ انسانی آبادیوں میں دونوں طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں آسمانی ہدایت کے ماننے والے بتاتے ہیں کہ انسانوں کی رہنمائی کے لئے بے شمار ہستیاں دنیا میں آئیں جن کا کردار، زندگی کا لائف سٹائل اور طور طریقے انسانی فطرت کے صرف قریب ہی نہیں بلکہ ایسے پسندیدہ، قابل عمل اور بے لوث تھے کہ انسانیت اور آدمیّت عش عش کر اٹھی۔ ایسے لوگ انسانوں کو اپنے ربّ اور خالق سے ملانے کے دعوے لے کر آئے اور ان کی تعلیمات کائنات کے بنانے والے کی طرف سے ہونے کی وجہ سے کائنات کے تمام کرّوں، حیوانات، انسانوں، جمادات ماحول اور اڑتے پرندوں کے لیے بھی باعث رحمت تھیں اور ماحول دوست تھیں۔

ایسے مثالی (IDEAL) اور اعلیٰ کردار کے مالک انسانوں کو پیغمبر کہا جاتا ہے اور دنیا کے ہر خطّے اور قدیم تہذیب میں ایسے پیغمبروں کا تذکرہ بھی ملتا ہے اور خداشناسی کے افکار بھی اور بے لاگ حق یہ ہے کہ انسانی ضمیر ایسی تعلیمات کو OWN بھی کرتے ہوئے جھجک محسوس نہیں کرتا اور ان تعلیمات کو ہر ماحول میں ماحول دوست پاتا ہے اور قابل عمل سمجھتا ہے اور ان تعلیمات پر عمل کر کے انسان اپنے باطن (یا ضمیر) میں ایک سکون محسوس کرتا ہے۔

☆ آسمانی ہدایت یا خداشناسی کے جذبے کی روشنی میں انسانی زندگی کا نمونہ یا لائف سٹائل ایسا دلکش اور دلآویز نمونہ ہے جس کے سب سے بڑے مظہر وہ انسان ہیں جنہوں نے پیغمبر ہونے کا

دعویٰ کیا اور ان میں سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام تھے جو انسانیت کے جدامجد ہیں اسی سنہری زنجیر کی مختلف کڑیاں ہیں حضرت نوح، ہود، صالح، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام اور اس سلسلہ الذہب کی آخری کڑی ہیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، جنہوں نے اپنی تعلیم کو انسانیت کی معراج قرار دیا اور اپنے زمانے میں بھی اور قیامت تک کے ہر زمانے کے لئے آفاقی (GLOBAL) قرار دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات مشرق و مغرب کے انسان، کالے اور گورے، سپاہی و جنرل، صدر و وزیراعظم اور قاصد، نائب قاصد سب کے لئے یکساں ہیں اور بلحاظ رنگ و نسل و زبان و مکان ہیں اور بلالحاظ پیشہ و مالی حیثیت و جنس ہیں۔ یہ تعلیمات مساوات انسانی کا کامل و اکمل نمونہ ہیں جن کی کوئی نظیر تاریخ میں نہیں مل سکتی۔

☆ انسانی تاریخ میں جب کبھی انسان نے آسمانی ہدایت پر عمل کیا تو امن و سکون، عدل و انصاف، مساوات، احترامِ انسانیت اور وسائل رزق کی منصفانہ تقسیم کے وہ نمونے سامنے آئے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے کہ ایسے بھی انسان دنیا میں گزرے ہیں اور ایسے بھی 'سردار' اور چوہدری انسانی آبادیوں میں تھے۔

——اور—— جب کبھی انسانی گروہوں اور قبیلوں نے آسمانی ہدایت سے سرکشی کی ہے سرتابی کر کے خالق کائنات کی حکم عدولی کی ہے اور ابلیس و شیطان کے ہم نوا بن کر انسانیت سوز طور طریقے اختیار کر کے انسانیت کے مقامِ رفیع سے گر کر—— حیوان بن گئے ہیں بلکہ حیوان سے بھی بدتر۔ اس لئے کہ ایک حیوان اپنے جیسے دوسرے حیوان پر کم ہی ظلم کرتا ہے جبکہ انسان —— جب گرتا ہے اور ذاتی مفادات اور اپنے اثاثوں کی محبت میں گرفتار ہوتا ہے تو اپنے جیسے سینکڑوں ہزاروں لاکھوں انسانوں کا خون کر دیتا ہے انہیں بھوکوں مارتا ہے ان کو درندوں کے آگے ڈال کر خوش ہوتا ہے۔ ایسے حکمران انسانیت کے نام پر داغ ہیں اور انسانیت ان سے منہ چھپاتی ہے۔ رُومی بادشاہ ایسے ہی کرتے تھے۔

8 ایک مغربی ماہر تعلیم اور فلسفی ROBERT BRIFFAULT اپنی تصنیف THE MAKING OF HUMANITY یعنی تعمیر انسانیت میں بنی نوعِ انسان کے تاریخی سفر میں آگے بڑھنے اور تجربات کی روشنی میں عقل و وجدان سے کام لیتے ہوئے محو سفر رہنے کی تاریخ بیان کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

Man has existed in much the same state of organic development for fifty thousand years or more; and yet during much the greater part of that time he has remained a miserable savage. During the five or six thousand years that he has enjoyed some measure of civilized organization, all his arrangements have remained to a great extent primitive, his thoughts have remained to a great extent primitive, he is still at the present day in every aspect of his existence the victim of self-imposed conditions which his thought, wherever it is even in the slightest degree rationally applied, utterly condemns and repudiates.

اس پیراگراف کے مطابق تفصیلات کو جانے دیں گزشتہ چھ یا سات ہزار سال کی تاریخ وہ ہے جس میں انسان نے روئے ارضی پر آسمانی آفات، رنج وغم، سیلاب، بارشیں، بیماریاں، وسائل رزق کی کمیابی، موسم کی سختیاں اور باہمی لڑائی جھگڑوں میں قتل و غارت کے ماحول سے نکل کر اپنے آپ کو منظّم کیا ہے اور ماحول کے اثرات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے ڈھنگ اپنا لیے ہیں۔

آسمانی ہدایت کی روشنی میں بھی تاریخ انسانی کی تعبیر اس کے قریب تر ہے۔ آغاز سے لے کر ایک منظّم ابتدائی شہری آبادی کا تصوّر حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں ملتا ہے اور یہ آبادی دریائے دجلہ وفرات کے درمیانی علاقہ میں واقع تھی۔ زندگی کی مشکلات نے انسان کو مل جل کر رہنا تو سکھا دیا تھا اور آسمانی آفات کے ساتھ حیوانی حیات کی درندگی سے بھی انسان قدرے محفوظ ہو گیا تھا مگر ـــــ انسان کے اندر بھی ایک حیوان ہے بگڑے ہوئے انسان نے یہاں بھی انسانیت کو چین نہیں لینے دیا اور تصوّرِ ملکیت نے آگے بڑھ کر استحصال اور EX PLOITATION کی شکل اختیار کر لی تھی یعنی اپنے جیسے کسی انسان کو دھوکے، فراڈ، دھونس دھاندلی اور طاقت کے بل بوتے پر اپنے وسائل سے محروم کر دینا۔ یہ رسم بد پہلے غیر مہذّب دور سے بدتر ثابت ہوئی۔ آسمانی ہدایت تو اُترتی رہی اور پیغمبران کرام علیہم السلام اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر بلکہ بعض اوقات

اپنی جان پر کھیل کر بھی دوسروں کو صحیح انسانی روشوں اور رویّوں کی تعلیم دیتے رہے مگر راست باز انسان کم، ان کی جمعیت کمزور اور IMPACT تھوڑا تھا جبکہ استحصالی طبقہ زیادہ مؤثر اور منظّم ہوگیا تھا حضرت نوح علیہ السلام کی اس جدوجہد میں ایک ہزار سال گزر گئے مگر معاشرے نے اجتماعی سطح پر کسی انسان دوست اور ماحول دوست قدم اُٹھانے سے گریز ہی کیا۔

9 انسانیت کا ایک مؤثر طبقہ جو آسمانی ہدایت کو وہ موزوں اہمیت نہیں دیتا جس اہمیت کی وہ انسان دوست، اخلاق دوست، ماحول دوست اور علم دوست تعلیمات مستحق ہیں۔ جبکہ آسمانی ہدایت کے ماننے والے اس بات کا بڑا واضح اور شفاف تصور رکھتے ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام جیسے نفیس، بے لوث اور باکردار انسان کی تعلیمات کو ردّ کر کے ان تعلیمات کو پیش کرنے والے لوگوں کو ستانے والے لوگ کون تھے؟ ان کا نقطۂ نظر کیا تھا؟ ان کا منشور کیا تھا؟ ان کے سامنے انسانیت کے آگے بڑھنے اور علمی فکری اور اقتصادی نمو اور پیش رفت کے لیے کیا پروگرام تھا؟

اس بات کا اصلاً جواب تو تاریخ دان ہی دے سکتے ہیں یا اہل علم دے سکتے ہیں مگر ایک بات یا مشاہدہ بڑا واضح ہے جس کو ثابت کرنے اور سمجھانے کے لیے کسی طویل بحث کی ضرورت ہے نہ اس دور کے آثارِ قدیمہ کی کھدائی کر کے وہاں سے نقاشی، مینا کاری، سنگ تراشی اور اہل صنعت وحرفت کی کاریگری کے نمونے معاینہ کرنے کی ضرورت ہے نہ اس دور کے شاہی فرامین اور محلات پر نصب کتبوں کو پڑھنے کی کوشش کی ضرورت ہے نہ ماہرین بلا کر اس دور کی زبان اور اشاروں سے ان تحریروں کو DECODE کر کے کوئی انوکھا فلسفہ سامنے آنے تک انتظار کی سولی پر لٹکنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی انسانیت کے ہر لمحہ حرکت اور آگے بڑھنے کے عمل کو PAUSE کر کے ماہرین آثارِ قدیمہ کی حتمی رپورٹ تک آرام کرنے کا بہانہ بنانے کی ـــــ بلکہ بڑی سادہ بات ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے دور میں آسمانی ہدایت کو ردّ کر کے اس کی مخالفت پر کمربستہ طبقہ وہی تھا جو آج کی روشن خیالی، علمی گہما گہمی، ذرائع مواصلات کی تیزی اور علم ومعلومات تک رسائی کے انقلاب کے دور میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو ردّ کر کے ان کو بے وقعت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے۔

اس طبقہ کے خدوخال، مزاج، نفسیات، ترجیحات، پسندوناپسند اور فرصت کے اوقات کے مشغلے، پرائیویٹ لائف کے سکینڈل اور بے اعتدالیاں قرآن مجید نے بھی بیان کی ہیں اور آج کے دور کے انقلابی (REVOLUTIONARY) لیڈر، شاعر، ادیب، اہل قلم اور دانشور حضرات کی تحریروں کی روشنی میں بھی اس طبقے کا ایک ذہنی خاکہ بنایا جاسکتا ہے۔

رابرٹ بریفالٹ نے تعمیر انسانیت نامی کتاب میں انسانیت کے آگے کے سفر کے لیے زادِ راہ کے طور پر ایک 'معقول طرزِ عمل' اور منصف مزاج روّیہ بھی لازمی قرار دیا ہے۔ یہی کہا جاسکتا ہے کہ اس دور کے مقتدر طبقات اور اُن کے ساتھ جڑے ہوئے لوگوں میں کسی معقول طرزِ عمل اور ایک منصفانہ مزاجی کے رویّے کا فقدان تھا ایک طرف یہ بات تاریخ سے بھی ثابت ہے اور دوسری طرف قرآن مجید بھی یہی بتاتا ہے کہ اس دور کی لیڈرشپ اور مقتدر حضرات کی پالیسیوں نے عوام کی بہبود اور فلاح کے لیے کوئی پیش رفت نہ کی بلکہ اپنے معاشرے کو انسان دشمن رویّوں کی وجہ سے ہلاکت سے دوچار کر دیا اور زندگی کو از سرِ نو انسانی عظمتوں اور رفعتوں کے سفر کا آغاز کرنا پڑا۔

10 حضرت نوح علیہ السلام کا زمانہ آج سے تقریباً چھ ہزار سال قبل کا زمانہ ہے اور اس وقت تک کے تجربات اور مستقبل میں آگے بڑھنے کے انسانی سفر کا حاصل (PRODUCT) یا آج کی اصطلاح میں ماڈل وہ معاشرہ تھا جو حضرت نوح علیہ السلام کو میسر آیا یا جس معاشرے کو انسان دوست اور اخلاق دوست بنانے میں انھوں نے تقریباً ایک ہزار سال لگا دیے مگر ابلیسی اور استحصالی سوچ کی ایسی پختگی کہ وہ انسانی سوسائٹی بال برابر بھی راہِ راست پر نہ آئی۔

11 قارئین کرام! ذرا غور فرمائیں تو ایک تاریخی حقیقت سے زیادہ علمی حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرنے کا اہم مرحلہ سامنے ہے۔

آج ہم تاریخ انسانی کے سارے علمی وِرثے کے حامل ہیں اور آج کے سائنسی دور میں دنیا سمٹ کر رہ گئی اور آج کا انسان دنیا بھر کے علاقوں اور ملکوں سے واقف ہے۔ آج ہمیں رہن سہن کی بے شمار سہولتیں حاصل ہیں؛ پختہ مکانات، سڑکیں، گرم ٹھنڈے پانی کا مستقل نظام، بجلی، گیس، فون، ٹی وی، سفر کی سہولتیں اور طرح طرح کی سواریاں میسّر ہیں۔ اس لحاظ سے شاید آج سے ایک

ہزار سال یا اس سے بھی قبل کے انسان کی مشکلات، مصائب و آلام، موسموں کی شدت اور رہن سہن کے انداز، وسائل رزق اور باہمی رابطوں اور ذرائع مواصلات کی شدید کمی کا تصوّر بھی محال ہے۔

سائبیریا کے انسانوں کا آج سے چند ہزار سال پہلے کیا لائف سٹائل ہوگا اور ان کی تہذیب وتمدّن کی شکل کیا ہوگی؟ یورپ، سکینڈے کیوبا کے ممالک اور روسی ریاستیں ایک ایسے کلچر کو اپنائے ہوئے تھیں جو تہذیب وتمدن کے اعتبار سے بالکل پہلے درجے میں تھا۔ وہاں نہ رات دن کا واضح تصوّر تھا نہ کام اور مصروفیات کا کوئی مستقل ٹائم ٹیبل نہ ضروریات زندگی اس طرح میسر تھیں اور نہ تجارتی لین دین کے لیے کوئی موزوں رابطے اور مارکیٹیں موجود تھیں۔

اسی لیے سائبیریا کے سرد علاقوں سے انسانی گروہ (HUMAN POTENTIAL) اچھے مستقبل اور پُرسکون زندگی کی تلاش میں سفر کر کے جب مشرق وسطیٰ پہنچتے تو بس وہیں کے ہو کے رہ جاتے۔

انسانی آبادی کے لیے سال کے تمام موسموں کے لیے اور دن رات کے واضح تصوّر اور موسموں کے اعتدال کی وجہ سے آج کے برما سے لے کر فلسطین تک اور افریقہ کے شمالی ساحل کے قریب کوئی 50 میل سے لے کر 200 میل چوڑائی کی پٹی (STRIP) کے علاوہ یورپ کے جنوبی محدود علاقے (جو بحیرۂ روم سے مربوط ہیں) ہی موزوں اور آئیڈیل تصوّر کیے جاتے رہے ہیں۔ اسی لیے جو قوم یہاں آ کر آباد ہوئی اسے سال کے 365 دن کی مصروفیت کا تصوّر اور موسموں کا اعتدال ایسا پسند آیا کہ وہ یہیں آباد ہوگئی اور مل جل کر رہنے کے آداب سے آشنا ہوئی۔ تہذیب و تمدن سے واقفیت کے بعد جلد ہی ایک ترقیاتی سفر میں شامل ہوگئی۔ نظریات، سوچ اور عادات و اطوار میں شعوری اصلاح ہوئی اور جن قوموں کا آسمانی ہدایت سے واسطہ پڑا ان قوموں کا ایک قلیل طبقہ خدا شناسی کے جذبے سے سرشار ہو کر انسان دوست، اخلاق دوست، علم دوست اور ماحول دوست رویوں کا حامل بن گیا جبکہ اکثریت نے صرف پرسکون زندگی گزارنے پر اکتفا کیا اور ماحول میں گم ہوگئے یہی لوگ تھے جو آسمانی ہدایت سے منہ موڑنے کے مرتکب ہوئے۔ بعض قومیں آسمانی عذاب کا نوالہ بن گئیں جیسے قوم عاد، قوم ثمود اور فرعونِ مصر وغیرہ اور تھوڑی تعداد میں لوگ حق کے ساتھی بنے اور انبیاء کرام علیہم السلام کے دست و بازو بنے۔

حضرت نوح علیہ السلام کے بعد کے زمانے میں یمن کے علاقے میں قومِ عاد اور شمالی سعودی عرب اور جنوبی اردن، مغربی عراق وغیرہ کے علاقے میں قومِ ثمود آباد ہو کر پھلی پھولی اور سیکولر تہذیب کو اُجاگر کیا۔ قومِ ثمود کے تہذیبی کھنڈرات PETRA کی تہذیب سے پائے جاتے ہیں اور خواص و عوام کے TOURISM کا اہم مرکز ہیں۔

قومِ ثمود کا زمانہ آج سے 4500 سال قبل کا ہے۔ جب اس قوم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا اور اہل ایمان کو بچا کر، پوری تہذیب اور تمام عمارتیں کھنڈر کر دی گئیں اسی دور میں عراق میں ایک بڑی تہذیب اُٹھی جو نمرود بادشاہ کہلاتے تھے اور جلدی ہی ترقی کر کے بہت بڑی سلطنت بنالی اور تقریباً ہزار سال حکومت کی۔

آج کے جمہوری دور میں تو چار سال حکومت چلانا مشکل ہے کسی خاندان کی ہزار سال یا کئی صدیاں حکومت، ایک ایسی سائنس ہے جو بڑی دلچسپ بھی ہے اور عبرت آموز بھی۔

12 6000 قم سے لے کر آج تک وہی استحصالی طبقہ بار بار دنیا میں بھیس بدل کر آتا ہے اور چھا جاتا ہے اس استحصالی طبقہ کے کئی چہرے اور کئی رُخ ہیں اس پر قدرے تفصیل سے بات اگلے ابواب میں ہوگی۔ یہاں قارئین کرام کی توجہ صرف اس امر کی طرف مبذول کرانا ضروری ہے کہ اس استحصالی طبقہ نے جب بھی عروج حاصل کیا اور حکومت قائم کی استحصال کر کے عوام کو لوٹا اس کے جلو میں آرٹ، فن، سنگ تراشی، ناچ گانا اور بت پرستی کے بت بنانا ایک ایسی قدر مشترک ہے کہ اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ قومِ عاد، قومِ ثمود، فراعنہ مصر، یونان، روم، نمرود بادشاہ، جنوبی ایشیا، ایران، میکسیکو وغیرہ وغیرہ سب کا ایک ہی طرزِ فکر تھا۔

حیرت ہے کہ جو سلطنت جتنی خوش حال اور طویل عرصے تک اقتدار میں رہی اس کے ہاں اتنی ہی عریانی، فحاشی اور بے حیائی پائی جاتی ہے اور صرف یہی نہیں ان تہذیبوں کے فن تعمیر، آرٹ اور سنگ تراشی کے دیگر آرائشی نمونوں میں بھی عریانیت سے آگے بڑھ کر بے حیائی کے فروغ کی بالارادہ کوشش نمایاں نظر آتی ہے۔ اس حیران کن مسئلہ اور تہذیبوں میں اس کے اشتراک پر جتنا غور کریں گے کئی عقدے کھلیں گے اور کئی راز فاش ہوتے نظر آئیں گے۔

13 قدیم تہذیبوں میں مذہب سے تو انکار کیا گیا۔ بے شمار آثارِ قدیمہ کے مقامات پر

برآمد شدہ شواہد ـــــ اس بات کے لیے کافی ہیں وہاں عوام کے لیے بت پرستی کا نظام تھا اور بادشاہ بھی خدائی کا دعویدار تھا۔ اہل علم، دانشور، شعراء، خطیب، فنکار سب اس نظام کے مدح خواں، اس کے خادم اور اس نظام کے وظیفہ خوار تھے۔ یونان کے فلاسفہ بشمول ارسطو، ہند کے اشوک کمار کے دور کے علما وفضلا، عظیم روما کے دور کے اہل علم اور دانشور، شعراء اور اہل قلم سب اس حکومتی اور سرکاری استحصالی نظام کے وفادار اور وظیفہ خوار تھے (اور یہ صورت آج کے استحصالی نظاموں کے ہاں بھی ہو بہو اسی طرح موجود ہے فرق صرف اتنا ہے آج میڈیا کے اینکر پرسن اور اس پر جلوہ نمائی کرنے والے اہل قلم اور دانشور حضرات وہی کام کر رہے ہیں۔ آج کا میڈیا اس استحصالی نظام کی حمایت میں پیش پیش ہے)۔

14 ماضی میں عظیم سلطنتوں اور خاندانی بادشاہتوں کے طویل صدیوں پر پھیلے ہوئے اقتدار کا راز کیا ہے؟ اس تسلسل کے معنی کیا ہیں؟ اس تسلسل کے پیچھے کوئی ہاتھ ایسا ہے جو انسانی زندگی کی طرح چند سالوں بعد زوال سے بے نیاز ہے۔

مسلمانوں میں ایسی کوئی مثال ہو تو دلیل کے طور پر 'اللہ' کا تصور موجود ہے اگرچہ مسلمانوں کے ہاں بھی مثالی دور حکومت صرف 30 سال قائم رہا لہٰذا مسلمانوں کے اقتدار کی طوالت کے لیے ظلم کا عنصر بھی ہوگا مگر اصل عامل غیر مسلم دنیا کے پاس کسی انسان دوست نظریہ کا فقدان تھا، ورنہ اللہ تعالیٰ ضرور مسلمان ظالم حکومت کو بھی بدل دیتا۔

تاہم ظلم، استحصال، قتل وغارت، بے انصافی، مسلح افواج کی موجودگی، اسلحہ کی فراوانی، اخلاقی زوال، بے راہ روی کے ساتھ کسی سلطنت کے قائم رہنے کے لیے کیا لازمی ہے اور در پردہ کون سے ہاتھ ہیں جو اس کی حفاظت کرتے ہیں؟ یہ معاملہ بحث طلب ہے۔

15 ماضی میں استحصالی حکومتوں کے استحکام اور اقتدار کی طوالت کا ایک اہم گُر حکومت مخالف لوگوں کو انتہائی درجے میں TORTURE کرنا ہے اور منظّم ظلم کرنا ہے موجودہ مغربی تہذیب اٹھارھویں صدی میں ساری معلوم دنیا کی خشکی اور تری (بحر وبر) پر اپنا اقتدار قائم کر چکی تھی۔ یہ اقتدار دور جدید کے تناظر میں کسی اخلاقی نظریہ یا اقتصادی وسیاسی فلاح کے اصول کے مطابق انسان دوست نہ تھا بلکہ اپنی اصل کے اعتبار سے منظّم اور وسیع پیمانے پر ظلم

کرنے کی مہارتِ تامہ رکھنے والی طاقت کے بل بوتے پر تھا۔مغرب میں دوعشرے قبل 1998ء میں چھپنے والی کتاب 'تہذیبوں کے تصادم' کا مصنف سیموئل پی ہنٹنگٹن لکھتا ہے کہ

''.....1500ء سے 1750ء کے درمیانی عرصے میں پہلی عالمی سلطنت کو قائم کرنے میں مغرب والوں کی کامیابی کا دارومدار ان کی جنگی استعداد میں اضافے پر تھا جس کو 'فوجی انقلاب'' کا عنوان دیا گیا ہے۔مغرب نے دنیا کو اپنے نظریات یا اقتدار یا مذہب میں برتری کی وجہ سے فتح نہیں کیا تھا بلکہ اس وجہ سے فتح کیا تھا کہ منظّم تشدد کرنے میں اس کو برتری حاصل تھی۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کو مغرب کے لوگ تو بھول جاتے ہیں لیکن غیر مغربی لوگ فراموش نہیں کرتے۔''

یونانی حکومتوں اور رومی حکومتوں کے دور میں روا رکھے جانے والے مظالم کی تفصیل پڑھ کر ہی انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہمارے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کو مکہ میں (610ء۔623ء) ذاتی طور پر اور ان کے پیروکاروں کو ان کا ساتھ دینے کی پاداش میں حد درجہ ستایا جا رہا تھا۔حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کو زمین پر لٹا کر چار اونٹوں کے ذریعے ہاتھوں اور پاؤں کو کھینچ کر زندہ ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا اور حضرت خباب رضی اللہ عنہ کو انگاروں پر لٹایا گیا ان واقعات کو سن کر آپ ﷺ نے فرمایا ہم مسلمانوں سے پہلے ایسے لوگ گزرے ہیں جن کو لوہے کی کنگھیوں سے نوچا جاتا تھا اور آدمی کو زندہ زمین میں آدھا گاڑ کر سر پر آرا رکھا جاتا تھا اور زندہ انسان کو دو حصوں میں چیر دیا جاتا تھا۔ یہ حکومتیں ـــــ یونان اور روم کی تھیں۔

آج بھی آپ TORTURE کے نام سے سرچ کریں اور انٹرنیٹ پر یونانی اور رومی حکومتوں کے آلاتِ ایذا رسائی یا آلاتِ تعذیب دیکھیں تو شاید دیکھنا بھی ممکن نہ ہو یہی طور طریقے آج کی مغربی تہذیب نے پوری دنیا پر قبضہ کے لئے اور برطانیہ نے امریکہ میں موجودہ امریکیوں نے مقامی باشندوں کے لئے روا رکھے تھے۔

جنوبی ایشیا میں بھی برطانوی راج اور ظالمانہ سامراج نے یہی طریقے پہلی جنگ عظیم تک استعمال کیے اور امریکی CIA اور دوسری عالمی خفیہ تنظیمیں آج بھی اپنے مخالفین کے لئے یہی طریقے استعمال میں لاتے ہیں۔تاکہ مخالفین کو خاموش کرایا جا سکے۔ ماضی میں بھی اور آج بھی

ظالمانہ حکومتوں کے طول اقتدار اور استحکام کا واحد قابل عمل راستہ یہی ہے۔

16 4000 سال قبل (2000 ق م) حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام آسمانی مذاہب یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے نزدیک انتہائی قابل احترام شخصیت ہیں۔ پہلے حضرت نوح علیہ السلام کے دور میں تاریخ انسانی میں ایک موڑ (TURNING POINT) آیا تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بھیجے ہوئے نامور پیغمبروں (علیہم السلام) کی تعلیمات کا ردّ کرنے والی اقوام اور مسلمانوں پر مظالم ڈھانے والوں کا اپنے خاص حکم (DIVINE INTERVENTION) سے خاتمہ کر دیا اس لئے کہ حق پرست اور اہل ایمان تعداد اور وسائل میں کم تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد تاریخ انسانی میں ایک دوسرا موڑ (TURNING POINT) آیا ہے اب آسمانی ہدایت کے باب میں اللہ تعالیٰ نے یہ طے فرمایا کہ

☆ آئندہ تمام پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں ہی ہوں گے (قرآن مجید 16:57) گویا ایک سے نسل کو تربیت دے کر اعلیٰ انسانی اخلاقی معیار تک لے جانا مطلوب ہے۔ چنانچہ مشرق یا مغرب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہم عصر پیغمبروں حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ السلام کے بعد سارے پیغمبر انہیں کی اولاد میں مبعوث ہوئے اور کتابیں بھی عطا فرمائیں چنانچہ حضرت اسحاق نبی علیہ السلام کی اولاد میں فلسطین اور اس کے ملحقہ علاقوں میں بے شمار پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تشریف لائے۔

☆ آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں مکہ میں مبعوث فرمایا اور سب سے بڑا پیغمبر بنایا اور قرآن عطا فرمایا اور نبوت کو مکمل کرنے اور آئندہ نبی اور رسول مبعوث نہ فرمانے کا اعلان کر دیا۔ قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا ہے (قرآن 09:15)

☆ اس تفصیل سے ہمارا مدعا یہ بات واضح کرنا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اہل ایمان کو تیار کر کے ایک طرف حق کی ایک جماعت تیار ہوئی جو حزب اللہ کہلائی اور حق کے مخالفین اور آسمانی ہدایت کے مخالفین حزب الشیطان کہلائے۔ ان کے درمیان معرکہ آرائی ہوئی۔ فرعون کو تو

اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر (THRU DIVINE INTERVENTION) غرق کر دیا مگر اس کے بعد حضرت محمد ﷺ تک اہل ایمان یعنی حزب اللہ کے ذمے یہ کام لگا یا اب وہ خود انسانی سطح پر کوشش کر کے حزب الشیطان یا انسان دشمن، اخلاق دشمن، علم دشمن اور خدا بیزار قوتوں سے خود مقابلہ کریں گے جنگیں ہوں گی معجزات کم سے کم ہوں گے اور اہل حق کو اللہ تعالیٰ فتح عطا فرمائے گا۔

☆ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے خود فلسطین اور آس پاس کے علاقے فتح کیے پھر حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی عظیم الشان حکومتیں قائم ہوئیں یہ سب کچھ انسانی وسائل اور انسانی سطح پر ہوا ہے اور اب قیامت تک آسمانی ہدایت کے دشمنوں سے مسلمانوں کو خود انسانی سطح پر مقابلہ کرنا ہوگا جو قیامت تک ہوتا رہے گا۔

17 2000 ق م کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی سطح پر حق و باطل کا ٹکراؤ ایک نئے دور میں داخل ہو گیا اور مقابلہ اہل ایمان کے ساتھ جنگوں کی شکل اختیار کر گیا۔

اس تبدیلی سے مراد یہ تھی کہ اب اہل ایمان کی تعداد زیادہ ہوگی اور وہ وسائل اور تعداد کی سطح پر بھی اللہ تعالیٰ کی غیر مرئی مدد کے ساتھ کفر کا مقابلہ کر سکیں گے۔ اگر استحصالی نظام کے حامل لوگ اور حکمران توسیع پسندانہ عزائم کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے تو وہ بھی انسانی سطح پر تھا اور اگر اہل حق اور آسمانی ہدایت کے ماننے والوں کو مقابلہ کرنا ہے تو وہ بھی بظاہر انہیں مادی وسائل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مدد کے بھروسے سے ہی ہوگا۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ 2000 ق م سے 600 ء تک کئی مقتدر حکمران آئے اور وہ وسیع علاقوں بلکہ پورے متمدن علاقے میں پھیل گئے۔

☆ ایک وقت میں فراعنہ مصر حکمران تھے اور ان کا طوطی بولتا تھا۔ انگریزی میں تاریخ کی ایک بڑی کتاب کا نام ہے WHEN BLACKS RULED THE WORLD افریقی اقوام (فراعنہ مصر) کا اقتدار بھی پاکستان کے مغربی علاقے سے لے کر افریقہ کے مغربی علاقے تک تھا۔

☆ یونانی آئے عظیم یونانی سلطنت قائم ہوئی اور ایشیا کے بڑے حصے تک پھیل گئی۔

☆ رومی آئے اور خوب پھیلے پھولے حتیٰ کہ یونانیوں کو شکست دے کر پورے یورپ اور

شمالی افریقہ سمیت مشرق وسطی پر حکمران ہو گئے۔

☆ ایرانی اُٹھے اور پورے علاقے میں حکومت مستحکم کر کے یونانیوں کے گھر مقدونیہ کے قریب پہنچ گئے۔

☆ اسی طرح چین میں 'ہُن' خاندان نے حکومت قائم کی۔

☆ بدھ مت نے فروغ پایا اور جنوبی ایشیا میں عظیم سلطنت بنائی۔ گندھارا تہذیب کا دور عروج مغربی سلطنتوں سے کسی طرح کم نہ تھا۔

18 قوم عاد اور قوم ثمود سے لے کر اور 600ء عیسوی تک جو عظیم سلطنتیں قائم ہوئیں ان کا مطمع نظر سوائے اقتدار، ذاتی منفعت اور اپنے اپنے شاہی خاندان اور شاہی خاندان کے وفادار اعلیٰ عہدیداروں کے لئے وسائل جمع کرنا تھا۔ عوام اور ان کے مفاد سے انہیں کوئی غرض نہیں تھی۔ درآنحالیکہ کہ تاریخ میں حق حکمرانی کی قبیلہ کی سطح پر بھی ابتداء عوام کی بہبود اور فلاح کے نقطۂ نظر سے ہوئی اور عوام نے اسی بنا پر حکمرانوں اور اعلیٰ عہدیداروں کے گھریلو اخراجات ٹیکسوں سے ادا کر کے ان کے اوقات فارغ کیے تھے کہ وہ عوام الناس کے جان و مال عزت و آبرو، عقیدہ ایمان کو تحفظ فراہم کریں گے۔

مگر وقت کے ساتھ ذاتی ملکیّت کے احساس اور استحصالی سوچ نے عوام کے وہ حسین خواب اور معصوم توقعات کا بیڑا غرق کر دیا اور سارے خواب چکنا چور ہو گئے اس لئے کہ حکمران اپنے لیے، اپنے خاندان اور اعلیٰ عہدیداروں کے لیے عیش دوام کا اہتمام کرتے تھے اور عوام کے لئے بھوک، افلاس، آفات سماوی وارضی، موسمی سختیاں اور وسائل کی کمی کی سوغات تھی۔

19 اس دوران تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ آسمانی ہدایت کے تحت اللہ تعالیٰ نے ایسے پیغمبر مبعوث فرمائے اور ایسے حالات پیدا کر دیے کہ جنگوں کے لئے ایک CODE OF ETHICS بنا کر اس پر عمل ہوا اور حکمرانوں کے لئے ضابطہ اور قاعدہ مقرر ہوا اور حکمران کی ذاتی زندگی بھی عوام کے سامنے کھلی کتاب کی طرح کر دی گئی کہ وہ اس پر بھی نہ صرف نگاہ رکھیں بلکہ وہ اتنی پاکیزہ اور شفاف وصاف تھی کہ وہ گویا عوام کے لئے بھی نمونہ اور 'اُسوہ' تھی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت داوٗد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے ذریعے ایک ایسی عظیم

الشان سلطنت بنوادی جو ایک صدی تک خوب پھلی پھولی اور عوام کے لئے امن وسکون، عدل انصاف، احترام جان ومال اور عزت وآبرو کے تحفظ کا سامان ہوگیا۔ یہ دور بھی دنیا کی تاریخ میں بالعموم اور اہل کتاب اور یہود ونصاری کی تاریخ میں سنہری دور ہی شمار ہوتا ہے۔ مگر افسوس کہ اہل کتاب ہی کے ان پیغمبروں علیہم السلام (جن کا ذکر بائبل میں کئی ابواب پر پھیلا ہوا ہے) کو ماننے والے آج مغربی تہذیب کے مقتدر طبقات اپنے پیغمبروں کی زندگیوں کو اپنے لئے اسوہ بنانے اور لوگوں کو اس کے مطابق ڈھالنے کا پابند کرنے کی بجائے ـــــ بائبل کو مانتے ہوئے اپنے لیے استحصالی حکمران اور ظالم وسفاک بادشاہ یونانی تہذیب اور رومی انداز حکمرانی کو مغربی تہذیب کا نصب العین (MOTTO) قرار دیتے ہیں۔ اس سے زیادہ مقام افسوس کیا ہوسکتا ہے۔

آسمانی ہدایت کا مدعا تو لوگوں کو عام زندگی میں رہن سہن اور عبادات کے طریقے سکھانا تھا وہ پیغمبروں کی ذاتی زندگی سے لئے جا سکتے ہیں اور انداز حکمرانی میں صلح و جنگ کے طریقے، قیدیوں سے سلوک، دشمنوں سے سلوک اور حاکم ومحکوم کے لئے دائرہ کار کی وضاحت حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کی حکومت سے اخذ کیے جا سکتے ہیں مگر افسوس کہ دوسروں کو بھی اس نیکی کی دعوت دینے کی بجائے اہل کتاب یہود ونصاری (مذہبی علماء اور حکمران) خود اس کی خلاف ورزی ہی نہیں کر رہے بلکہ اس کا تذکرہ تک کرنا گوارہ نہیں کرتے اور اس کے مخالف کاموں اور سرگرمیوں کو فروغ دے رہے ہیں۔

حیاتِ انسانی کا آغاز اور ارتقائی مراحل (II)

(ل) انسان نے متمدن زندگی اختیار کی تو خاندان (FAMILY) سے برادری، برادری سے قبیلہ تک سفر کیا۔ پھر قبیلے بڑھے، آسائش، وسائل رزق کی فراوانی ہوئی تو چھوٹے بڑے قبیلے وجود میں آئے۔ وسائل رزق کی فراوانی مزید ہوئی تو ایک جگہ کئی قبیلے آباد ہو گئے۔

اس مرحلہ پر بڑی آبادیاں اور شہروں کا تصور سامنے آیا کسی شہر میں کئی چھوٹے قبیلے یا ایک بڑا قبیلہ آباد ہوا۔ پھر شہروں میں ترقی ہوئی تو قصبوں، چھوٹے شہروں، بڑے شہروں اور پھر پانچ دس لاکھ یا اس سے زیادہ بڑی آبادی کے شہروں کا تصوّر سامنے آیا۔

(ب) جب تک انسان دس بیس گھروں پر مشتمل کسی چھوٹی بستی میں رہتا تھا اجتماعی مسائل، شکایات، ظلم، ناانصافی، حق تلفی، حق ملکیّت میں دراندازی، چوری اور لوٹ مار وغیرہ کے مواقع بھی کم تھے اور شکایات بھی کم۔ اس لئے کہ بالعموم ایک ہی برادری کے لوگ آباد تھے۔ بستی ذرا بڑی ہوئی، قصبہ بنا اور چھوٹا شہر بنا تو اجتماعی مسائل بڑھ گئے۔ جب ایک قصبہ یا شہر میں کئی قبیلے جمع ہو گئے تو من دیگرم تو دیگری کے نقطہ نظر سے مسائل بھی بڑھ گئے قبیلوں کے درمیان اختلافات بھی پیدا ہوئے اور مسائل کے حل کے لئے نئی راہیں تلاش کرنا پڑیں۔

متوسّط درجے کے شہر بنے تو کئی قبیلے جمع ہو گئے اور اجتماعی مسائل کے حل کے لئے کسی مشترکہ 'سردار' اور 'حکمران' کا تصور پیدا ہوا۔ یہ سردار یا چیف یا حکمران، قبیلوں کے سرداروں کے لئے قابل قبول ہونا بھی ضروری تھا اور باحیثیت بھی، تاکہ وہ معاملات کو بآسانی چلا سکے۔ بڑے شہروں میں صفائی ستھرائی، گندے پانی کی نکاسی، ضروریات کی فراہمی اور ہوادار ماحول کے لئے

اجتماعی مسائل پیدا ہوئے۔ چوری ڈاکہ سے روکنے کے لئے راتوں کو پہرے کا نظام، جرائم کی روک تھام کے لئے کسی ذمہ دار کا تعین، جرائم کی تفتیش، مجرموں کا تعیّن، گرفتاری، جرم کے متناسب سزا کا تصوّر سامنے آیا سزا و جزا کی ضرورت کے احساس کے ساتھ ہی کئی متفقہ ضابطے، قانون، آئین کی ضرورت پیش آئی۔

بڑے شہروں کی بڑی حکومتوں کے زیر انتظام وسیع علاقوں کے امن وامان کے لئے داخلی طور پر اور دوسری حکومتوں سے بچاؤ اور مقابلے کے لئے ایک 'یوتھ فورس' فوج، اسلحہ اور اس کی ٹریننگ کے مسائل پیدا ہوئے۔

الغرض ـــــ انسانی اجتماعیّت نے خاندان سے آگے بڑھ کر جب بڑی بڑی حکومتوں اور بادشاہوں (جو کئی وسیع علاقوں پر پھیلی ہوئی تھیں) کے بعد شہنشاہوں کے دور میں قدم رکھا۔ یہ شہنشاہ ایک ایسے علاقے کا حکمران ہوتا تھا جو کئی لاکھ میل کے علاقے پر مشتمل ہوتا تھا اور کئی براعظموں پر پھیلا ہوتا ہے۔

یہاں سے پھر بادشاہ شہنشاہ کے نائبین، امراء وزراء، وزائے اعظم، پولیس کا باقاعدہ نظام، حکومتی عہدیدار، عدل کا کوئی معقول نظام، لوکل گورنمنٹ کا تصوّر جو مقامی طور پر صفائی، فراہمی آب ونکاسی آب وغیرہ کے مسائل سے نمٹ سکے۔

وسیع حکومتوں میں پھر حکومتی ایوانوں کا تصوّر پیدا ہوا۔ بادشاہوں کے لئے عالیشان محلات، وزراء اور دیگر اہل کارواں کے لئے درجہ بدرجہ نفیس رہائشیں، نوکر چاکر، خدمت گار، باغ، لان، سیر گاہیں وغیرہ وغیرہ کا تصوّر پیدا ہوا۔ کھیل کود کے لئے میدان، اسٹیڈیم ناچ گانے کے لئے ایمپی تھیٹر، اوپن تھیٹر، کھیلوں کے مقابلہ کے لئے جیمنیزم، اِن ڈور اور آؤٹ ڈور کھیلوں کا تصوّر اور شاہنشاہتوں میں بین الصوبائی اور ملکی سطح کے کھیلوں اور مقابلوں کے انعقاد کی ضرورت اور اس کے لئے شایان شان انتظامات کے لئے ناگزیر تعمیرات، عملہ، وسائل اور تسلسل کے لئے بادشاہ سے لے کر نیچے قصبہ لیول تک ایک انفراسٹرکچر کی ضرورت اور اس کے تقاضے بھی انسان نے محسوس کر لئے اور ان ضروریات کی فراہمی میں مصروف ہو گئے۔

(ج) ابتداء سے سفر کا آغاز کر کے کئی صدیوں بعد جب بادشاہتوں کے تصوّر تک یہ سفر پہنچا اور

کچھ عقل مندوں نے اس سفر میں مقاصد کے حصول، انسانیت کی خدمت اور عوامی بہبود کے نقطۂ نظر سے نفع/ نقصان کا میزانیہ تیار کیا اور کیا کھویا کیا پایا کا حساب جوڑا ـــــ تو معلوم ہوا کہ بلاسوچے سمجھے ایک خاص سمت میں بگٹٹ دوڑنے سے ایک یک رُخی (UNI DIRECTIONAL) ترقی یا ارتقاء تو ہو گیا مگر اس ترقی نے اجتماعی زندگی کے کئی دیگر اہم گوشوں کو دبا دیا بلکہ بعض بنیادی اہداف تو سرے ہی سے حذف ہو گئے اور انسان حقیقی اہداف کو سراسر بھول ہی گیا۔

(ح) اجتماعیت کا پہلے قدم پر ہی پہلا ہدف تو یہ تھا کہ کسی برادری یا قبیلے کے افراد کی تعداد 200 گھرانوں تک ہو جائے تو ایک سردار اور مسائل کے لئے ایک ذمہ دار بنایا جائے جو متفقہ ہو اور باحیثیت سمجھدار ہو، اہل ہو اور اپنی بات کھل کر کر سکتا ہوں اور دلائل سے اپنی بات منوا سکتا ہو۔

آغاز میں یہ عہدہ خاندان کے سربراہ کی طرح اعزازی تھا اور اس کے لئے قبیلہ کے سردار کی ذاتی حیثیت کے مطابق اس کا گھر ہی قبیلے کی تمام اجتماعی سرگرمیوں کا مرکز تصور ہوتا تھا اور قبیلہ کا سردار مخلصانہ طور پر یہ خدمت بلا معاوضہ ادا کرتا تھا اور اس کے ضمیر کو ایک طرح سکون ملتا تھا اور عوام الناس بھی بے حد مطمئن ہوتے تھے، لوگ اپنے ایسے سرداروں پر جان نچھاور کرتے تھے اور ان کی بلا چوں چرا اطاعت کرتے تھے، مسائل حل ہوتے تھے اور جرائم نہ ہونے کے برابر تھے۔

(ط) وقت کے ساتھ بعض ایسے سربراہ اور سردار بھی سامنے آئے جو مالی لحاظ سے کمزور تھے مگر تھے مخلص اور محنتی اور اہل۔ لہٰذا ـــــ عوام نے ایسے لوگوں کی خدمات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ قاعدہ کلیہ بنایا گیا کہ عوام پر ٹیکس لگا کر ـــــ سردار کے لئے ایک سرکاری رہائش گاہ کا انتظام کیا جائے اس کی حفاظت، اس کے انتظام اور اس کے گھریلو اخراجات کے لئے اپنے اپنے زمانے کے مطابق وسائل اکھٹے کئے جائیں اور 'سردار' کو مالی و اقتصادی پریشانیوں سے بے نیاز کر کے عوام کی خدمت کے لئے بالکل فارغ کر دیا جائے۔

آغاز میں چونکہ قبیلے مختصر تھے لوگ ایک برادری کے ہوتے تھے یا نسلوں سے ایک دوسرے کو جاننے والے لہٰذا خلوص تھا اور خدمت کا جذبہ۔ بہترین خدمت اور 'خادم' حکمران اور سردار سامنے آتے رہے۔

(ی) وقت کے ساتھ یہ بات بھی سامنے آئی کہ ایک سردار کے وفات پا جانے یا معذور

ہوجانے پر دوسرا 'سردار' کیسے بنایا جائے گا یا 'سرداری' کسے سونپی جائے گی۔

(ز) اس مرحلہ پر اُن کے علاقے کے لوگوں نے بالعموم جس بات پر اتفاق کیا وہ خاندانی سرداری کا نظام تھا۔ ذرا غور کریں تو یہ بات بادنیٰ تأمّل سمجھ میں آسکتی ہے کہ سرداری، سربراہی، حکمرانی اور بادشاہت کے لیے اہل آدمی کی ضروری QUALIFICATIONS میں ایک اہم اہلیت یہ ہے کہ اُسے مقدمات سننے، اس کا تجزیہ کرنے اور فریقین کو اطمینان دلانے، صحیح فیصلہ تک پہنچنے اور اس فیصلے کے نفاذ کے مراحل واضح بھی ہوں اور وہ سردار اس میں کسی کوتاہی کے عواقب کو جانتا بھی اور اس کے نفاذ کی طاقت بھی رکھتا ہو۔ مدبّر ہو، حلیم الطبع ہو ـــــ اختلافات برداشت کرسکتا ہو ـــــ سب کی کڑوی کسیلی بات سن سکتا ہو۔ بالعموم معاشرے کے عام گھرانوں میں اس مزاج کے لوگ کم ہوتے ہیں اگر ہوتے بھی ہیں تو چھوٹے لیول کے۔ لہٰذا قبیلے کی سرداری کے لئے ہزاروں سال پہلے ہمارے آباء واجداد نے سبکدوش ہونے والے سردار کے خاندان میں سے ہی کسی کو 'سردار' بنانے کی 'رسم' کا آغاز کیا اور یہ رسم ایسی پختہ ہوئی کہ یہ سلسلہ بعد کے مراحل میں بغیر مشورہ کے خاندانی بن گیا اور نئے 'سردار' کے لئے عوام سے کم پوچھا جاتا یا مشورہ ہوتا اور 'سردار' کے خاندان کے لوگ از خود اندرون خانہ باہمی مشورے سے نئے سردار کا اعلان کر دیتے اور عوام اس نئے 'سردار' کی رعیت قرار پاتے اور سر جھکا کر اطاعت میں لگ جاتے اور اس کے خاندان کی عیاشی کے لئے اخراجات کی فراہمی میں اپنا حصہ ڈالنے میں زیادہ محنت سے کام کرنے لگ جاتے۔ جیسے جیسے قبیلہ بڑا ہوجاتا ـــــ 'سردار' کے خاندان میں بھی اضافہ ہوتا جاتا اور یوں عوام پر بھی بوجھ بڑھتا جاتا اس لئے کہ بالعموم سردار کے خاندان کے لئے متوقع 'سردار' کے روپ میں آغاز سے ہی کسی 'کام کاج' اور محنت مشقت کے کام کے عادی نہیں ہوتے تھے۔ اگر کسی کام میں وہ محنت کرتے تھے تو گھڑ سواری، نیزہ بازی، جنگی فنون، سپہ سالاری وغیرہ تھے جو جنگوں کو صورت میں سردار کی حفاظت یا اپنے سرداری کے لئے جنگ کی صورت میں کامیاب اپریشن کی ضمانت سمجھے جاتے تھے۔

(ح) خاندانی سرداری وقت کے ساتھ خاندانی حکومتوں اور خاندانی بادشاہتوں میں بدل گئی اور عوام ـــــ جن کی خدمت کے لئے 'حکمرانی' کا ادارہ وجود میں آیا تھا ـــــ وہ مقصد ساری کہانی میں سے کہیں گم ہوگیا اور ذہنوں سے بھی اوجھل ہوگیا۔

یوں ایک اچھی نیّت سے ایک مقدس سفر کا آغاز کر کے عوام نے اپنی فلاح و بہبود کے خواب چکنا چور کر دیے، اور خود ہی سرداروں اور حکمرانوں کی رعیّت اور رعایا قرار پائے اور ایک بادشاہ کی وفات یا ہٹائے جانے پر دوسرے بادشاہ کی ملکیّت میں دے دیے جاتے۔

اس انداز سے دنیا میں مطلق العنان بادشاہ پیدا ہوئے جو کسی ضابطے، قانون، اصلاح، تنقید اور مشورہ سے اپنے آپ کو مبرّا اور مستغنی سمجھتے تھے اور مشورہ اور تنقید اپنی توہین خیال کرتے تھے۔

ایران کے حکمران، یونان کے حکمران، روم کے حکمران، فراعنہ مصر، نمارد ۂ عراق، ہند کا اشکوک خاندان، چین کا ہن بادشاہ، چنگیز خان، ہلاکو خان سب اسی قبیل کے افراد تھے اور انسان ہوتے ہوئے بھی اپنے جیسے انسانوں کے حکمران بن جاتے اور خدائی کے دعوے دار بن کر اپنے آپ کو سجدے کراتے، دور دراز علاقوں میں اپنے بت بنا کر اس کی تعظیم کا حکم دیتے اور یوں انسانوں پر انسان 'خدا' بن کر مسلط رہتے۔

یہ بادشاہ خدائی کے دعویدار تھے اور یوں آسمانی ہدایت کے دشمن تھے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی جان کے پیاسے، اخلاق دشمن، علم دشمن، انسان دشمن اور وحی دشمن تھے۔ ایسے ہی بادشاہوں کے نامسعود ادوار میں آسمانی ہدایت کے علمبردار شریف النفس، انسان دوست، اخلاق دوست، علم دوست، حق پرست، انصاف پرست، عادل، خادم، اعلیٰ اخلاق کردار کے مالک حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے پیروکاروں پر بے پناہ مظالم ڈھائے گئے اور ان کو غیر انسانی طریقوں سے 'عذاب' دیا گیا، تعذیب کے نت نئے طریقے نکال کر TORTURE کیا گیا۔

اجتماعی معاملات کے ساتھ ساتھ ایسے حکمران اپنے ذاتی کردار اور انفرادی (PRIVATE) لائف میں بھی انتہائی بدکردار، شرابی، بے حیا، بے شرم، بدزبان اور حیوانیت کی سطح پر گرے ہوئے تھے۔

ذیل میں ان مشہور شاہی خاندانوں کے بارے میں تاریخی شواہد میں سے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

1 مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے 'نبیٔ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم' کے نام سے سیرت النبی کی کتاب لکھی ہے۔ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا میں تشریف آوری سے پہلے دنیا کا حال لکھا ہے۔

ایران کے بادشاہوں میں سے دارا(DAREIUS) بہت عادل مشہور ہے اس کا ایک واقعہ حسب ذیل ہے اس سے آپ دوسرے بادشاہوں کے بارے میں خود ہی رائے قائم کر سکتے ہیں۔

☆ آزادیٔ خیال اور اظہارِ رائے (نہ کہ تنقید و نکتہ چینی) وسیع ایرانی سلطنت میں تقریباً مفقود تھی، طبری نے اس سلسلہ میں 'نوشیرواں عادل' کی ایک دلچسپ حکایت بیان کی ہے جس سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ایرانی شہنشاہی میں آزادیٔ رائے اور اظہارِ خیال پر کتنی سخت پابندی تھی اور دربارِ شاہی میں لب کشائی کی قیمت کیا ادا کرنی پڑتی تھی۔ اس واقعہ کو ''ایران بعہدِ ساسانیان'' کے مصنف نے طبری کے حوالہ سے قلم بند کیا ہے۔

''اس نے ایک کونسل منعقد کی اور دبیر خراج کو حکم دیا کہ لگان کی نئی شرحیں بآوازِ بلند پڑھ کر سنائے، جب وہ پڑھ چکا تو خسرو نے دو دفعہ حاضرین سے پوچھا کہ کسی کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟ سب چپ رہے، جب بادشاہ نے تیسری مرتبہ یہی سوال کیا تو ایک شخص کھڑا ہوا اور تعظیم کے ساتھ پوچھنے لگا کہ آیا بادشاہ کا یہ منشا ہے کہ ناپائدار چیزوں پر دائمی ٹیکس لگائے جو بمرورِ زمانہ ناانصافی پر منتہی ہوگا، اس پر بادشاہ للکار کر بولا کہ اے مردِ ملعون و گستاخ! تو کن لوگوں میں سے ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میں دبیروں میں سے ہوں، بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو قلم دانوں سے پیٹ پیٹ کر مار ڈالو اس پر ہر ایک دبیر نے اپنے اپنے قلم دان سے اس کو مارنا شروع کیا یہاں تک کہ وہ بیچارہ مر گیا، اس کے بعد سب نے کہا کہ ''اے بادشاہ! جتنے ٹیکس تو نے ہم پر لگائے ہیں وہ ہمارے نزدیک سب انصاف پر مبنی ہیں''۔ (صف 51)

☆ ''رومی بھی اس معاملہ میں ایرانیوں سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھے، اگرچہ بے شرمی اور تذلیل انسانیت میں یہ بلند درجہ ان کو حاصل نہ تھا، ایک مغربی مؤرخ VICTOR CHOPART اپنی کتاب THE ROMAN WORLD میں لکھتا ہے:

''قیصر معبود سمجھے جاتے تھے، یہ بات موروثی و خاندانی طور پر نہ تھی بلکہ جو بھی تخت و تاج کا مالک ہوتا وہ خدا تسلیم کر لیا جاتا تھا، اگرچہ اس میں ایسی کوئی نشانی اور علامت نہ ہوتی جو اس کو اس درجہ پر فائز ہونے کی طرف اشارہ کرتی۔

AUGUSTUS کا شاہانہ لقب ایک شہنشاہ سے دوسرے شہنشاہ تک دستور و قانون کے بموجب منتقل نہیں ہوتا تھا بلکہ رومی ایوانِ حکومت کا صرف اتنا کام تھا کہ ہر اس حکم پر جو شمشیر کی دھار پر صادر ہو صاد کر دیا کرے۔ یہ شہنشاہی صرف ایک فوجی آمریت (ڈکٹیٹرشپ) کی ایک شکل تھی'' (صف 52)

☆ پانچویں صدی عیسوی کے آغاز میں 'مزدک' ظاہر ہوا اور اس نے مال و دولت اور عورت میں مکمل مساوات اور اشتراک کی کھلی ہوئی دعوت دی اور یہ چیزیں تمام انسانوں کے لئے بلا کسی قید و لحاظ کے جائز کر دی گئیں، اس کی دعوت نے جلد ہی قوت پکڑ لی، حالت یہ ہوگئی کہ لوگ جس کے گھر میں چاہتے بے تکلف گھس جاتے اور اس کے مال و اسباب اور عورتوں پر زبردستی قبضہ کر لیتے، ایک قدیم ایرانی دستاویز میں جو نامہ تنسر کے نام سے موسوم ہے ان حالات کی تصویر کشی کی گئی ہے جو مزدکیت کے عروج اور تسلط و اقتدار کے زمانہ میں نظر آتے ہیں۔

''ناموس ادب کا پردہ اٹھ گیا، ایسے لوگ پیدا ہو گئے جن میں نہ شرافت تھی نہ عمل، نہ ان کے پاس موروثی جاگیر تھی، اور نہ انہیں خاندان اور قوم کا غم تھا، نہ ان میں صنعت تھی نہ حرفت، نہ انہیں کسی قسم کی فکر دامن گیر تھی اور نہ ان کا کوئی پیشہ تھا، چغلی اور شرارت میں مستعد اور دروغ بیانی اور تہمت میں مشّاق تھے، یہی ان کا ذریعہ معاش تھا اور اسی کو وہ تحصیل مال و جاہ کا وسیلہ بناتے تھے'' (صف 37-36)

☆ اس شہنشاہی میں (خاص طور پر ساسانی عہد اقتدار میں چھٹی صدی تک) حالت بہت بگڑ چکی تھی، پورا ملک ان سلاطین کے رحم و کرم پر تھا جو موروثی طور پر تخت و تاج کے مالک بنتے تھے اور اپنے کو عام انسانوں سے بالاتر سمجھتے تھے، بادشاہ آسمانی خداؤں کی نسل سے تسلیم کیا جاتا ہے، خسرو دوم پرویز اپنے نام کے ساتھ حسب ذیل القاب لکھتا ہے:

''خداؤں میں انسانِ غیر فانی اور انسانوں میں خدائے لاثانی، اس کے نام کا بول بالا، آفتاب کے ساتھ طلوع کرنے والا، شب کی آنکھوں کا اجالا'' (صف 38)

ایرانی بادشاہوں کے بارے میں مزید درج ہے کہ

☆ ''ملک کی تمام دولت اور آمدنی کے وسائل ان بادشاہوں کی ملکیت سمجھے جاتے تھے دولت

جمع کرنے، تحائف ونوادر اور قیمتی اشیاء اکٹھا کرنے کے جنون، معیار زندگی کی بلندی اور جدت طرازی، زندگی سے لطف اندوز ہونے اور تفریح وتعیش کے شوق، دولت مند بننے اور دنیا کے مزے اڑانے کی ریس اتنی آگے بڑھ چکی تھی کہ اس پر خیال آرائی اور شاعری کا شبہ ہونے لگتا ہے اور اس کا تصور صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس نے قدیم ایران کی تاریخ اور شعر وادب کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہو اور شہر و مدائن ایوان کسریٰ، بہار کسریٰ (وہ قالین جس پر موسم بہار میں شاہانِ ایران شراب نوشی کیا کرتے تھے) تاج کسریٰ اور ایرانی بادشاہوں سے وابستہ خدم وحشم، بیویوں اور لونڈیوں، خدمت گار لڑکوں، باورچیوں اور خانساماؤں، پرندوں اور درندوں کے سدھانے والے، اور سامانِ شکار اور ظروف وبرتنوں کی ان افسانوی تفصیلات و جزئیات سے واقف وباخبر ہو۔ اس کا اندازہ صرف اس ایک واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ جب اسلامی فتوحات کے نتیجہ میں ایران کا آخری تاجدار یزدگرد اپنے دارالحکومت مدائن سے فرار ہوا تو اس حالت میں بھی اس کے ساتھ ایک ہزار باورچی ایک ہزار مغنّی، ایک ہزار چیتوں کے منتظم اور ایک ہزار شکروں کی دیکھ بھال کرنے والے اور خدم وحشم اور مصاحبین کی ایک بڑی تعداد تھی، اتنے بڑے لاؤلشکر کے باوجود بھی وہ اس تعداد کو کم اور خود کو ایک انتہائی معمولی اور حقیر پناہ گزیں سمجھتا تھا، وہ محسوس کرتا تھا کہ مصاحبین و ملازمین کی تعداد اور تعیش وتفریح کے سامان کی کمی کے باعث اس کی حالت انتہائی قابل رحم ہے''۔ (صف 39-38)

ہندوستان میں عوام کس حال میں تھے اور حکمران طبقہ کیا کرتا تھا اس کے بارے میں شاید آپ کو یاد نہ ہو ____ پڑھیے۔

☆ ''ہندوستان اپنے پڑوسیوں اور دنیا کے دوسرے ملکوں کی برادری میں طبقاتی عدمِ مساوات اور انسانوں کے درمیان فرق وامتیاز میں بہت آگے تھا۔ یہ ایک سخت اور بے رحمانہ نظام تھا جس میں نرمی اور لچک کی کوئی گنجائش نہ تھی، اس امتیازی سلوک کو مذہب اور عقیدہ کی سند اور پشت پناہی حاصل تھی اور آرین حملہ آوروں کی مصلحت اور مذہب اور تقدس کے اجارہ دار برہمنوں کے مفاد کا بھی یہی تقاضا تھا، یہ نظام ان پیشوں کی بنیاد پر قائم تھا جو مختلف

برادریوں اور ذاتوں میں نسلی طور پر چلے آرہے تھے۔اس کے پیچھے اس ملکی، سیاسی اور مذہبی قانون کی طاقت تھی جس کو ان ہندو قانون سازوں نے وضع کیا تھا جو مذہبی حیثیت کے بھی مالک تھے، یہ قانون بلاکم وکاست پورے معاشرہ پر نافذ تھا اور اس کو زندگی کا دستور العمل سمجھا جاتا تھا، اس نے ہندوستان کے باشندوں کو چار طبقوں میں تقسیم کر دیا تھا:

1۔ مذہب کے اجارہ دار اور پروہت جن کو برہمن کہا جاتا تھا۔

2۔ سپاہی اور فوج میں بھرتی ہونے والے افراد یعنی ''چھتری''۔

3۔ زراعت پیشہ اور تجارت کرنے والے یعنی ویش۔

4۔ نوکر چاکر اور خدمت گار یعنی ''اچھوت''

یہ آخری طبقہ (جو سب سے بڑی تعداد میں تھا) پستی کی آخری منزل میں تھا، اس کے متعلق یہ تصور تھا کہ وہ خالق کائنات کے پاؤں سے پیدا ہوا ہے اس لئے اس کا کام صرف ان تینوں طبقوں کی خدمت کرنا اور ان کو آرام وراحت پہنچانا ہے۔

اس قانون نے برہمنوں کو اتنے حقوق دے دیے تھے اور ان کو اتنا بلند رتبہ عطا کیا تھا جس میں کوئی دوسرا ان کے برابر نہ تھا، برہمن کے سارے گناہ معاف تھے خواہ وہ تینوں دنیاؤں کو اپنے گناہوں اور بدکرداریوں سے گندہ اور تباہ و برباد کردے۔ اس پر کوئی ٹیکس نہیں لگایا جاسکتا تھا، اس کو کسی صورت میں بھی سزائے موت نہیں دی جاسکتی تھی، اس کے برعکس اچھوت نہ کچھ کما سکتے تھے نہ جمع کر سکتے تھے، نہ کسی برہمن کے قریب بیٹھ سکتے تھے نہ اس کے بدن کو چھو سکتے تھے نہ مقدس کتابوں کا پڑھنا ان کے لئے جائز تھا'' (صف 41-40)

2 تاریخ یورپ کا عبرت کدہ : محسن فارانی

(اردو ڈائجسٹ جنوری 2011ء)

☆ یونانی اخلاقیات کے گھناؤنے پہلو

یونان ایک طرف حکمت وفلسفہ کا معلم تھا تو دوسری طرف بداخلاقی کی اتھاہ گہرائیوں میں بھی غرق تھا۔ عصمت فروشی یونانی مذہب کا جزو بن گئی تھی۔ محبت کی دیوی' ایفروڈائٹ

کے مندر کی پجارنیں بدکار عورتیں تھیں۔ مشہور نقاش پرکزتیلس نے اپنی آشنا' فرائنی کا بت تیار کر کے اپالو کے مندر میں رکھ دیا تھا۔ دعوتوں میں کنیزیں مادرزاد ننگی ہو کر مہمانوں کو کھانا کھلانے آتی تھیں۔ مردوں میں خلافِ وضعِ فطری بدکاری عام تھی۔ رواقیہ اخلاقی فلسفہ کا بانی زینو اس لت میں مبتلا تھا۔ مشہور نقاش ایپلس نے سکندر اعظم کی معشوقہ لائس کا مجسمہ بناتے ہوئے اس سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔ سکندر کو خبر ہوئی تو اس نے بلا تکلف اپنی معشوقہ ایپلس کے حوالے کر دی۔ سپارٹا میں قانون تھا کہ بوڑھے مرد کی جوان بیوی کسی جوان کو دے دی جاتی تا کہ مضبوط نسل پیدا ہو سکے۔

'عظیم فلسفی' ارسطو کا قول تھا: ''یونانیوں کے لئے غیر ملکیوں کے ساتھ وہی برتاؤ واجب ہے جو وہ حیوانات کے ساتھ کرتے ہیں۔'' چنانچہ سکندر اعظم نے لبنان کے شہر صور (ٹائر) میں بیس ہزار آدمی پکڑ کر قتل کرا دیے اور تیس ہزار غلام بنا کر بازاروں میں فروخت کر ڈالے۔

☆ رومیوں میں بدکاری اور درندگی کا چلن

بدچلنی اور زناکاری میں روم نے یونان کو بھی مات کر دیا۔ مؤرخ لیکی لکھتا ہے:

''مختلف علاقوں سے رومی فاتح لوگوں کو اسیر کر کے اپنے ہاں لانے لگے تو روما کی حالت عصمت فروشی کے بازار جیسی ہو گئی۔ یونانی اور اسکندریہ کے غلام حسن و جمال میں لاجواب ہوتے۔ زہرہ دیوی (VENUS) کے مندروں میں بدکاری مباح تھی۔ دوسری صدی عیسوی میں بدکار ملکہ فوسٹینا نے اپنے متعدد عاشقوں کو سلطنت کے اعلیٰ عہدوں پر ترقی دی رومی سینیٹ کی منظوری سے اسے دیوی کا درجہ مل گیا حتیٰ کہ روم کے مندروں میں جونو' وینس (زہرہ) کیرس اور دیگر دیوتاؤں کے ساتھ فوسٹینا کا بت بھی پوجا کے لئے رکھ دیا گیا یونان کے مانند روم میں بھی اسقاطِ حمل کوئی مجرمانہ فعل نہ تھا۔

رومی سلطنت میں باپ کو اپنی اولاد مار ڈالنے کا اختیار تھا۔ اس سے کوئی باز پرس نہیں ہوتی تھی لہٰذا اعلانیہ اولاد کشی کا کثرت سے رواج تھا۔ اکھاڑوں (ایمفی تھیٹروں) میں دو یا متعدد شخص تلواریں وغیرہ لے کر باہم لڑتے یہاں تک کہ ایک شخص دوسرے کو جان سے مار ڈالتا۔ لڑنے کے لئے پیشہ ور تلوَریوں کو چاندی کی تلواریں مہیا کی جاتیں۔ شہنشاہ

ٹائبیریس (14ء تا37ء) کے عہد میں ایک منڈوے کی عمارت (ایمفی تھیٹر) گرنے سے بیس ہزار آدمی دب کر مر گئے۔ لوگ مردہ عزیزوں کی روحوں کو خوش کرنے کی غرض سے جنازے کے ساتھ تلوَریوں کے جوڑلڑوانا کارِثواب سمجھتے تھے۔

غلاموں کے معاملے میں رومی اس قدر ظالم تھے کہ ایک مرتبہ شاہ فلامینیس نے اپنے مہمان کی تفریح کے لئے اسے ایک غلام ذبح کیے جانے کا تماشا دکھایا۔ جبکہ ویڈیسی بولیونامی رومی سردار اپنی پالتو مچھلیوں کو اپنے غلاموں کا گوشت کھلایا کرتا تھا۔ بروٹسی نے اپنے ایک مقروض کو بھاری سود ادا نہ کرنے کے جرم میں قید کرادیا اور جیل میں اسے بھوکہ مرواڈالا۔

رومی حکمران اس قدر سنگدل تھے کہ گیارہ لاکھ انسانوں کا خون جولیئس سیزر کی ہوسِ فتوحات کی نذر ہوا۔ رومیوں نے نیرو کے باغ کی روشنی کا تماشا نہایت دلچسپی سے دیکھا جو عیسائی قیدیوں کے کرتوں پر تیل چھڑک کر آگ لگانے سے پیدا ہوئی تھی اور جس سے وہ مظلوم جل کر مر گئے۔ شاہ گیلرس اور ہیلیو گیوس کھانے کھاتے وقت یہ تماشا دیکھا کرتے تھے کہ جنگلی جانور قیدیوں کو چیر پھاڑ رہے ہیں۔

☆ رومی اکھاڑے میں انسان اور درندے

رومی حکمرانوں نے روم میں ایک بہت بڑا گول اکھاڑہ 'کولوسیم' (COLOSSEUM) بنایا جس میں نیم کروی سیڑھیوں پر 50ہزار تماشائی بیٹھ سکتے تھے۔ اس کی تعمیر کا آغاز بادشاہ ویسپاسین کے دور میں 75ء کے لگ بھگ ہوا۔ ٹائٹس اور ڈومیٹین کے زمانے میں اس کی تکمیل ہوئی۔ اکھاڑے میں مسلح جنگجوؤں اور وحشی درندوں کے مابین مقابلے ہوتے۔ نہتے باغیوں اور غلاموں کو اکھاڑے میں دھکیل کر ان پر بھوکے شیر اور چیتے چھوڑ دیے جاتے۔ رومیوں کی یہ تفریح انسانی خونریزی اور ظلم وشقاوت کی بدترین شکل ہے۔

مقتدر طبقات اور سفّاک بادشاہتوں کے دوام کے لیے دو نئی جہتوں (DIMENSIONS) کا اضافہ

1۔ بے چاری انسانیت اور لاچار عوام پر انسان دشمن اور اخلاق دشمن بادشاہ اور ان کے اَعوان و انصار (FEUDAL LORDS)، راجے مہاراجے اور علاقائی سرکاری منصب دار (جیسے عصر حاضر کا تھانیدار اور پٹواری کلچر) ہی عوام کا خون چوسنے کے لیے کم نہ تھے کہ حکمرانوں کے پروردہ دانشوروں، عقلمندوں اور فلسفیوں نے اپنی ابلیسی منطق سے دو اور جہتوں (DIMENSIONS) کا اضافہ کر دیا۔ عوام کے کمزور و نحیف جسموں کو مزید ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا دی گئیں کہ وہ کبھی بیدار نہ ہو سکیں اور کوئی موسیٰؑ اور ہارونؑ اپنے وعظ و نصیحت اور معجزات سے (جنھیں وہ جادو کے مظاہر کہتے تھے) اور کہیں کوئی لوطؑ اور شعیبؑ اپنے استدلال سے عوام کو مظلومیّت کا احساس نہ دلا سکیں۔

دورِ حاضر کے مغربی تصوّرات کا ابتدائی خاکہ (BLUE PRINT) انھیں صدیوں میں تیار ہوا ہے۔ یہ اشعار آج سے چار ہزار سال پہلے کے انسانوں اور معاشروں کی بھی اتنی ہی صحیح عکاسی کرتے ہیں جتنے آج کے معاشروں کی

؎ خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

؎ ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
اقبال جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

فرعون کی طرح محکوموں کے بچوں کا قتل ناحق ہو، عصر حاضر کی نئی تعلیم کے نصاب کے

ذریعے انسانیت کا نظریاتی قتل عام ہو یا ارسطو کا ایک بُت کے نام پر LYCEUM کے تعلیمی ادارے کی داغ بیل ڈالنا یہ سب اقدامات در پردہ عوام پر حکمرانوں کی گرفت مضبوط کرنے کی خواہش تھی۔ اس لیے کہ آج کی طرح اُس زمانہ کے دانشور اور فلاسفہ یا اخلاق کے معلّمین سب کے سب اسی استحصالی نظام کے ٹکڑوں پر پلنے والے تھے۔

اکبرالہ آبادی نے فرمایا تھا:

؎ یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

2۔ مقتدر طبقات نے خاندانی سرداروں (CHEIFS) اور مطلق العنان، خدائی کے دعویدار بادشاہوں کے اقتدار کو لازوال بنانے کے لیے دو ایسے اقدامات کیے جو ان دانشوروں کی فکری چالاکی اور ابلیسی حکمت کے تو شاہکار ہیں مگر اس پیش رفت سے انسانیت کے دُکھوں کا مداوا ہونے اور زخموں پر کسی درجے میں مرہم رکھے جانے کے احساس کے بجائے مظلوم و مقہور عوام اور بادشاہوں کے درمیان مزید خلیجیں حائل ہوگئیں اور حکمرانوں تک عوامی آواز کے پہنچنے کے راستے مسدود ہوگئے۔ وہ دو اقدامات یہ تھے:

1 شہری ریاستوں (CITY STATES) کا قیام

2 جمہوری اداروں یعنی اسمبلی اور سینٹ جیسے اداروں کا قیام

ان اداروں کے قیام کے موقع پر اور آج تک تین ہزار سال سے مقتدر قوتوں اور استحصالی طبقہ کی طرف سے ان اداروں کی جمہوری رُوح اور عوامی نمائندگی کے گُن گائے جا رہے ہیں مگر درحقیقت ـــــ یہ قدم عوام کو حکمرانوں تک رسائی دینے کے راستے کی رکاوٹیں تھیں یعنی صحیح فیصلوں اور عوامی دباؤ کو ٹالنا اور حکمرانوں کی مرضی کے فیصلے حاصل کرنے اور قانون سازی کر کے عوام کا استحصال جاری رکھنے کا دوسرا نام تھا اور آج بھی ہے۔

اس لیے کہ 99% عوام کو کسی قسم کا RELIEF دینے پر جو مالیاتی اور اقتصادی بوجھ حکومت کے سر آئے گا اس کا پچاسواں (50th) اور سوواں (100th) حصہ بھی عوام کے نمائندے یعنی (0.01%) ایک اقل قلیل تعداد (MINUTE MINORITY) پر خرچ کر کے ان مقتدر

طبقات کی خوشنودی کے لیے عوام کو کچھ نہ دے کر بھی بہلایا جاسکتا ہے۔(آج بھی جمہوری ملکوں میں الیکشن کے موقع پر سیاست دان طبقہ جس طرح رقم الیکشن مہم (COMPAIGN) پر خرچ کرتے ہیں وہ ان کو قبول ہے نہ کہ عوام کی بہبودی کے لیے کوئی WEL FARE کا کام کرنا)

سینٹ اور اسمبلی میں کیا ہوتا تھا اس کے لیے صفحہ 83 پر

VICTOR CHOPART کا اقتباس ہی کافی ہے

بادشاہتوں کے قیام پر عوامی سطح پر اور اہل علم کے نزدیک ظلم کے خلاف آواز اُٹھانا مشکل ضرور ہو گیا تھا مگر ناممکن نہیں تھا۔ جبکہ مطلق العنان اور وسائل پر قابض حکمرانوں اور عوام کے درمیان شہری ریاستوں کے قیام اور سینٹ وغیرہ کے قیام سے بادشاہوں کے وظیفہ خوار شاعروں، ادیبوں، دانشوروں اور فلسفیوں نے اس کے حق میں مبالغہ آرائی کے ساتھ فیوض و برکات کے تذکرے کا ایسا عوامی سماں باندھ دیا کہ عوام دھوکا کھا گئے اور دوسری طرف جمہوریت کے نام پر عوامی رائے کے ساتھ عوامی نمائندوں کا چناؤ عوامی سطح پر ایک ایسی سکون آور (مُسکن) اور نیند آور دوائی (SLEEPING PILL) ثابت ہوئی کہ عوام اپنی مظلومیّت کو بھول گئے اور اقتدار میں شرکت کے گمراہ کُن تصور سے استحصالی پہلو کو فراموش کر بیٹھے۔

3۔ ان دو اقدامات سے ہمارے نزدیک اس استحصالی نظام کو طول دینے اور بادشاہوں کے ہمہ پہلو اقتدار اور عوامی وسائل کی لوٹ مار کے عمل کو 'مقدس گائے' بنا کر پیش کیا گیا اور عوامی بیداری کے عمل اور قوموں میں اُٹھنے والے مصلحین (REFORMERS)، مخالفین (OPPOSITION) اور آسمانی ہدایت کے نمائندوں (PROPHETS) کے مخلصانہ اور بے لوث کاموں کے راستے میں سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کانٹے بچھا دیے گئے۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

ظلم کے خلاف بولنے والے مصلحین
(انبیاء کرام علیہم السلام) کا قتل

1۔ خوب سے خوب تر کی تلاش کے اس سفر انسانیت کا آغاز تو بڑا معصومانہ اور مخلصانہ تھا اور ابتدائی کچھ حصہ بھی بڑا حوصلہ افزا اور جذبوں کو جلا بخشنے والا تھا مگر خود غرضی، دھوکا، بد نیتی اور اپنے جیسے دوسرے انسانوں کو لوٹ کر اپنے لئے وسائل جمع کرنے اور دوسروں کے استحصال کی خواہش نے ہر مقتدر طبقہ کو ایسا مسحور کر دیا کہ سارے انسانی معاشرے ابلیسیت، حیوانیت، درندگی، بے حیائی، بے لباسی، فحاشی اور بداخلاقی سے بھر گئے۔

حکمران طبقے نے اپنی ہوس اور بری خواہشات کی تسکین کے لئے بڑی سلطنتوں کو شہنشاہتوں کا روپ دھار لیا اور ذاتی انا کی تسکین کے لئے انسانیت تذلیل کا راج ہو گیا۔

2۔ انسانوں کی اکثریت شخصی ملکیت اور استحصال کے تحت اپنی ناگزیر ضرورتوں کے عوض مقتدر طبقات کی غلام بن کر رہ گئی۔ یہ طرزِ فکر اور اندازِ حکومت ہر چہار طرف پھیل گیا اور ذرائع آمد و رفت اور علم کی ترویج کے ذرائع کی کمی کے باوجود ابلیس کے اشتراک کی وجہ سے انسانیت سے حیوانیت کا روپ دھار لیا۔ انسانوں کی یہ آبادیاں، شہر، حکومتی ایوان، فوجیں اور شاہی خدمت گار سب لٹیرے اور غاصب بن گئے اور عوام بے چارے بے دست و پا، وسائل زندگی سے محروم بلکہ زندگی کے حقیقی مفہوم سے نا آشنا ان انسانی خداؤں کی خدمت و پوجا میں مست رہنے لگے کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نگاہوں کے سامنے تھا ہی نہیں۔

3۔ اس دوران انسانیت کی محرومیوں میں اضافہ اور مجبور و مقہور انسان کے زخموں پر نمک ڈالنے کا کام کیا ہے ایک اور طبقہ نے۔ یہ طبقہ بظاہر مسیحا اور دوست بن کر آئے، ہمدردی کے روپ میں اٹھے مگر مقتدر طبقہ کے ساتھ ایسا گٹھ جوڑ پیدا کر لیا اور حق حکمرانی میں مشارکت (شرک) اور

وسائل رزق میں مشارکت (شرک) کر کے دکھوں کے معالج کے روپ میں ڈاکو اور ڈاکوؤں کے سرپرست بن گئے۔

4۔ یہ حقیقت کہ اس کائنات کو ایک علیم وخبیر، قادر مطلق و مدبر، بے انتہا ذہین، زیرک، و منطقی صلاحیتیں رکھنے والے ربّ نے تخلیق کیا ہے اور وہی اس کو چلا رہا ہے۔ ہزاروں سال سے انسانوں میں سے ایک طبقے کے مسلسل انکار کے باوجود دن بدن زیادہ عیاں و آشکار ہوتا جا رہا ہے۔ اس خالق ورب ہستی نے اس کائنات میں انسانوں کو پیدا فرمایا اور اس کی رہنمائی کے لئے پیغمبر علیہم السلام بھیجے آسمانی ہدایت اتاری آسمانی ہدایت اترتی رہی صحیفے اور کتابیں عطا ہوئیں۔ اس حقیقت کو بھی آج کے سیکولر ولبرل بلکہ روشن خیال وخدا بیزار ___ وحی دشمن واخلاق دشمن وعلم دشمن تہذیب کی عالمگیریت کے باوجود تاریخ انسانی سے محو نہیں کیا جا سکتا ہے اور آج کے انسانوں کے ذہن سے مٹایا نہیں جا سکتا ہے۔

5۔ آسمانی ہدایت کے مطابق یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں خیر کی قوتوں کے ساتھ شر کی ایک قوت (شیطان اور ابلیس) بھی موجود ہے اور اس حقیقت کا اعتراف آسمانی ہدایت (عیسائیت اور یہودیت) کے لٹریچر اور عقائد سے DELETE کرنا بھی ممکن نہیں۔ عین دن کے بارہ بجے نصف النہار پر سورج نظر آنے کے باوجود انکار کی طرح آسمانی ہدایت سے انکار کیا جا سکتا ہے یہ انسان کا اختیار ہے۔

انسانی تاریخ کا ایک المیہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات گرامی قدر کی تشریف آوری پر جب تاریخ انسانی ایک اہم موڑ لے رہی تھی ذرائع آمد ورفت میں تیزی کے ساتھ لکھنے پڑھنے کا فن، کاغذ کی ایجاد اور کتابوں کا دور آنے کی شروعات ہو رہی تھیں اور اللہ تعالیٰ نے دنیا کے مہذب علاقوں میں علیحدہ علیحدہ علاقائی (REGIONAL) نبی اور رسول بھیجنے کی بجائے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کے لئے نبوت اور آسمانی کتب مختص کر دیں تاکہ ایک ہی گروہ امت مسلمہ کو مسلسل اور لمبی تربیت دے کر آئندہ دور میں شر کی قوتوں کا انسانی سطح پر مقابلہ کرنے کے لئے تیار کیا جائے۔ گویا حزب الشیطان کے مقابلے میں حزب اللہ تیار ہونے کا وقت آ گیا تھا اور اب ہدایت دشمن اور وحی دشمن قوتوں کے مقابلے معجزات اور آسمانی وزمینی ناگہانی آفات کا عمل دخل (معجزات) آہستہ آہستہ کم کر کے انسانی سطح پر انسانی ابلیسی قوتوں کا مقابلہ انسانی حزب اللہ کے

ذریعے ممکن بنایا جانے کا فیصلہ ہوا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو باپ نے مکہ میں آباد کیا اور کعبہ کی تعمیر کی۔ جب کہ دوسرے اور چھوٹے بیٹے اسحاق علیہ السلام کو فلسطین میں آباد کیا ان کی اولاد میں حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت ہارون علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام کے علاوہ بے شمار نبی تشریف لائے اور ان میں سے آخری حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دو بعثتیں تھیں ایک فرعون کی طرف اور دوسری بنی اسرائیل کی طرف، فرعون پر اتمام حجت ہوا تو اس کو اللہ تعالیٰ نے سمندر میں غرق کر دیا۔ جب کہ بنی اسرائیل کی تربیت ہوتی رہی جہاد کا حکم ہوا ــــــ انکار پر بھی 40 سال کی صحرانوردی کی سزا سنائی گئی مگر مزید تربیت (TRAINING) کا وقت دیا گیا تا آنکہ تین صدیوں بعد حضرت طالوت کے ہاتھوں جہاد کے ذریعے سلطنت کی داغ بیل پڑی اور حضرت داؤد علیہ السلام پہلے بادشاہ ہوئے جو نبی بھی تھے۔ ان کا دور حکومت چالیس سال ہے۔ پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نبی اور بادشاہ ہوئے ان کا دورِ حکومت بھی چالیس سال تھا۔

یہ دور حکومت دنیا کا اصطلاح میں تو بادشاہت تھی مگر اس کا نقشہ قرآن مجید کے بیان کے مطابق بڑا عوامی ہے کہ جھگڑا کرنے والے اور فیصلے لینے والے رات کو حضرت داؤد علیہ السلام کے حجرۂ عبادت میں قضیئے لے کر پہنچ جاتے تھے اور وہ فیصلے کر دیتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے آسمانی ہدایت دنیا میں بادشاہتوں کے فروغ کے زمانے میں ایک مثالی، عوام دوست، اخلاق دوست اور خدا شناس علم دوست بادشاہت کا ایک صدی (1000 ق م سے 900 ق م) کا نمونہ دکھا کر انسانیت کو آسمانی ہدایت کے تابع ہو کر اس طرح کی بادشاہت اختیار کرنے کا اشارہ (GUIDELINE) تھا۔

6۔ تاریخی المیہ

(ا) تاریخ انسانی کا یقینی طور پر سب سے بڑا المیہ اور تاریک باب ہے کہ حزب اللہ بننے کے لئے اللہ تعالیٰ برگزیدہ پیغمبروں اور پاک سیرت ہستیوں کی نگرانی میں پرورش پانے والی جماعت میں ایک ایسے شریر عنصر کی شمولیت ہوگئی اور صدیوں کے تعامل سے اس شریر گروہ کی تعداد

(کثیر) اور اہل حق اور حقیقی معنی میں حزب اللہ قلیل رہ گئی۔

قرآن مجید میں اس 'کایا پلٹ' اور بنی اسرائیل کے اندر ایک ابلیسی گروہ کی موجودگی، پرورش اور پھیلنے کے عوامل پر کئی جگہ تبصرے کیے گئے اور تورات، انجیل اور زبور کے متون کی طرف بھی اشارے ہیں۔

اس ابلیسی گروہ اور بگڑے بنی اسرائیل کے بڑے حصے کے جرائم قرآن مجید میں پہلے ہی پارے میں گنوائے گئے ہیں اور اس گروہ کی شر انگیزی اور بعد کی صدیوں میں نسل انسانی پر ابلیسی اور غیر انسانی اثرات سے متنبہ بھی کیا گیا ہے اور ان کا مقابلہ کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔

اس ابلیسی گروہ (جو حزب اللہ بنتے بنتے بدنیتی، دنیا پرستی اور خود غرضی کی وجہ سے حزب الشیطان بن گیا) کے جرائم تو بہت زیادہ ہیں مگر دو جرائم بڑے بنیادی اور اہم ہیں

(i) اپنے آپ کو پیغمبروں کی اولاد (PROFHETIC GENES) کے حوالے سے دنیا کے منتخب لوگ (CHOSEN PEOPLE OF THE LORD) جبکہ غیر بنی اسرائیلی جانور یا غیر مہذب انسان (GOYEMS & GENTILES) کہتے ہیں اور یوں انسانی حقوق اور شرفِ انسانی کے حقدار صرف بنی اسرائیل ہیں اور دوسرے انسان نما مخلوق (GOYEMS & GENTILES) ہیں، اُن پر جو ظلم، تعدی، ناانصافی اور لوٹ کھسوٹ اور قتل ہو، اس کا اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی بنی اسرائیل سے کوئی حساب (ACCOUNTABILITY) نہیں ہے۔

(ii) دوسرے یہ کہ اس شریر گروہ نے آسمانی ہدایت کے ماننے والے ہونے اور انبیاء علیہم السلام کی اولاد کے دعویدار ہونے کے باوجود آسمانی ہدایت لانے والے برگزیدہ ہستیوں کا انکار کیا، نافرمانی کی، سختی کی اور بات بڑھی تو پیغمبروں کو قتل کر دیا اور یہ روایت اتنی بڑھی کہ انہوں نے 600 ق م سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک سینکڑوں نبی قتل کر دیے۔ بنی اسرائیل کا یہ جرم ایسا خوفناک ہے کہ اس سے آسمانی ہدایت سے دشمنی اور خدا بیزاری کا اشارہ ملتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس گروہ کو شریر اور برا اور 'مغضوب علیھم' فرمایا ہے۔

(ب) اسی گروہ نے جب آسمانی ہدایت سے دشمنی کی، پیغمبروں کو قتل کر دیا تو موجودہ آسمانی کتب سے بھی بغض پیدا ہوا اور ان کی بدعملی پر یہ کتب ثبوت اور ریفرنس بنتی تھیں اور علماء یہود ان سے محاسبہ کرتے تھے لہٰذا ـــــ اس گروہ نے ایک منصوبہ بندی کے تحت تورات، زبور اور انجیل

تینوں کتب کے اصل نسخے غائب کر دیے اور ان کی جگہ خود لکھوا کر اصل کتاب BIBLE کے نام سے عام کر دی۔ بائبل کے مصنّفین کون کون ہیں؟ کس زمانے میں اس کے مختلف حصے لکھے گئے اور کس جگہ لکھے گئے ہیں یہ سب سوالات ایسے ہیں جس کا جواب عیسائیت اور یہودیت دینے سے قاصر ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے ہاں ان کتابوں کی صورت میں انتہائی قیمتی اثاثے کی گمشدگی پر تاریخ میں کوئی مقدمہ، عدالتی کارروائی تفتیش، مجرمین کا تعین وغیرہ قسم کی کوئی کارروئی کسی معلوم کتاب میں درج نہیں ہے اور نہ عام ہے۔

(iii) اس پر مزید بس نہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد اللہ تعالیٰ نے 600 سال تک کوئی نبی نہیں اٹھایا لہٰذا ____ 600 ق م سے 600ء تک (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آغاز 610ء میں مکہ میں ہوا) دنیا میں آسمانی ہدایت کا خلا تھا۔ پہلے نبی قتل کر دیے گئے اور آسمانی ہدایت پر مبنی کتب گم کر دی گئیں لہٰذا ____ انسانیت کی رہنمائی کے لئے علمی طور ہر کوئی ہدایت یا نمونہ موجود نہیں تھا۔

بنی اسرائیل دنیا کے لئے (تورات، زبور اور انجیل کو ہاتھ میں لے کر) نمونہ بن سکتے تھے مگر وہ اس راستہ کو چھوڑ کر وحی دشمن اور ہدایت دشمن بن گئے۔ اور المیہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل وحی دشمن فلسفوں اور نظریات کو ایجاد کر کے فروغ دینے والے فلاسفہ اور دانشوروں کے سرپرست اور دوست بن گئے اور یوں دنیا آسمانی ہدایت سے محروم اور ابلیسی فلسفوں اور نظریات کی آماجگاہ بن گئی اور آسمانی ہدایت کے نمونے اور اجتماعی زندگی میں ریاستی حکومتی سطح پر حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو دنیا نے بھلا کر خدا بیزار، وحی دشمن اور علم دشمن اور اخلاق دشمن فلسفوں کے زیر اثر انسانیت ____ کو جبراً یونانی اور رومی حکومتوں کے افکار و نظریات کی طرف دھکیل دیا گیا۔

انسانیت کی محرومی اور سیاہ بختی پر 600 ق م سے 600ء تک کا یہ عرصہ آنسو بھی بہا رہا ہے اور منہ بھی چڑا رہا ہے اور اس سیاہ بختی کا ذمہ دار صرف اور صرف بنی اسرائیل کا ایک بڑا موثر طبقہ تھا جو پہلے انبیاء کرام علیہم السلام کو قتل کرتا رہا اور آسمانی کتب غائب کر دیں اور اب انسانی ذہن کے تراشیدہ فلسفوں کو رواج دے کر دنیا میں بے سکونی، بے انصافی اور بدامنی کا مُوجب ہے۔

باب 3

☆ اللہ تعالیٰ کا احسانِ عظیم

سیّدنا حضرت محمد ﷺ کی بعثت 97

☆ سیّدنا محمد ﷺ کی حیاتِ طیبہ ایک نظر میں 100

☆ سیّدنا محمد ﷺ کی حیاتِ طیبہ

عظیم مسلم سیرت نگاروں کی نظر میں 101

☆ غیر مسلم زعماء کا خراجِ عقیدت

سرورِ کائنات ﷺ کے حضور 109

اللہ تعالیٰ کا احسانِ عظیم
سیّدنا حضرت محمد ﷺ کی بعثت

☆ خالق کائنات نے انسانیت کے لیے جو رول (ROLE) طے کر رکھا ہے اور اس بڑے رول میں (جو صدیوں پر محیط اور بامقصد تخلیق ہے) اس میں ہر انسان کو جو اپنے حصے کا کام کرنا ہے وہ معیّن ہے ہر انسان (مرد ہو یا عورت) کے اپنے حصّے کے کام کا پہلا حصّہ وہ ہے جس کی پہچان انسان کے باطن اور ضمیر میں INBUILT موجود ہے۔ اور دوسرا حصہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً انبیاء کرام علیہم السلام کے ذریعے اتارتا رہا ہے تا آنکہ انسانیت نے فکری بلوغت (INTELLECTUAL MATURITY) کے دور میں قدم رکھا تو خالق کائنات نے آخری اور مکمل ہدایت قرآن مجید اتار دی حضرت محمد ﷺ کے اُسوہ کی شکل میں ہدایت کا عملی نمونہ آشکار ہوا اور سنت کی صورت میں انسان کی ہدایت و رہنمائی کا یہ پہلو بھی محفوظ و مامون بنا دیا گیا۔ ختم نبوت ـــــ دراصل اللہ تعالیٰ کا انسان کے اندر الہامی طور پر ڈالی گئی صلاحیتوں پر اعتماد کا اظہار تھا کہ اب قرآن مجید کی صورت میں تحریری ہدایت، سنت رسول ﷺ کی شکل میں قرآن مجید کا عملی نمونہ اور سیرتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی صورت میں انسانی سطح پر عملی زندگی کے بقیہ گوشوں میں ہدایت کی مکمل رہنمائی کر دی گئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اگر کسی توجیہ کی ضرورت یا پرانی بات کو نئے الفاظ اور بدلی ہوئی صورت حال میں بیان کرنے کے لئے ایک طرف اللہ تعالیٰ نے مجددین اُمت کا انمول سلسلہ جاری فرمایا تو دوسری طرف علماء وصلحائے اُمت کے ذریعے اجتہاد کی گنجائش قائم کر دی تا کہ اللہ تعالیٰ کی منشا و مرضی ہر دور کے انسانوں پر ان کے سامنے انہیں کی زبان و محاورہ میں لوگ بیان

کر کے اِتمامِ حجت کرتے رہیں اور انسان اس پر عمل درآمد کر کے اپنے لئے بھی آخرت میں 'حسنات' کا ذخیرہ کرلیں اور ان برگزیدہ بندوں کے حسنات کا دنیاوی زندگی میں فائدہ و برکات کے زیرِ سایہ ایک ایسا عمومی ماحول فراہم کر دیا جائے کہ کمزور ایمان کے لوگ بھی مشکل سے مشکل حالات کے باوجود دین و ایمان کے تقاضے پورے کرسکیں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے فرستادہ سیّدنا حضرت محمد ﷺ کی اطاعت کا دامن سمین ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔

☆ سابقہ آسمانی کتب تورات، زبور اور انجیل کی عطا کردہ ہدایت اور حضرات انبیائے بنی اسرائیل کی زندگی کے پاکیزہ نمونے اگر رُو بعمل لائے جاتے اور ان پر عمل درآمد کیا جاتا تو انفرادی زندگی کے ساتھ ساتھ اجتماعی سطح پر بھی سرداری اور حکومت کے تقاضے بھی عین منشائے خداوندی کے مطابق پورے ہوتے۔

ہمارے نزدیک سچی بات یہی ہے کہ بالفرض بنی اسرائیل آسمانی ہدایت کو انسانی پہنچ سے (چھپا کر) دُور نہ کرتے اور عملی زندگی میں اجتماعی سطح پر حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے اُسوہ اور نمونہ کو تھامے آگے بڑھتے تو انسانیت عملاً ساتویں صدی عیسوی میں مختلف تجربات سے گزر کر وہیں کھڑی ہوتی جہاں حضرت محمد ﷺ کی تشریف آوری نے قرآن مجید کے بیان کردہ 'صراطِ مستقیم' کی نشاندہی اور نمونہ فراہم کر کے پہنچایا۔ لیکن اس صورت میں یہ بہت بڑا فرق سامنے ہوتا کہ اجتماعی زندگی میں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کی محلات والی زندگی میں سادہ اور تکلّفات سے پاک، ذاتی اعراض سے پاک اور استحصال سے پاک زندگی کے نمونے آہستہ آہستہ محلات سے سادگی کی طرف منتقل ہوجاتے۔ اس لیے کہ جب بادشاہ یا حکمران نے محل میں رہ کر بھی لوٹ کھسوٹ سے پاک اور اخلاق کے اعتبار سے بھی اعلیٰ زندگی گزارنی ہے تو محل کا فائدہ، سادہ رہائش ہی کافی ہے؛ لہٰذا انسانیت سادگی کا یہ سفر اپنے باطنی تجربے اور ضمیر کی آواز اور ایمان کی پکار کے تحت طے کرتی تو حضرت محمد ﷺ کی تشریف آوری پر آپ کے عطا کردہ نمونے کو آگے بڑھ کر قبول کرتے اور یوں تمام اولادِ ابراہیم باقی دنیا کے لئے مثال اور رول ماڈل (ROLE MODEL) بن جاتی۔ مگر افسوس کہ عملاً بنی اسرائیل کے ایک بڑے حصے کی شرارت، انبیاء علیہم السلام کی نافرمانی، آسمانی ہدایت سے رُوگردانی، قتلِ انبیاء، آسمانی کتابوں کو چھپانے کا جرم، پھر عملی زندگی میں

نمونہ اور اُسوہ (ROLE MODEL) کے اس خلا کو پر کرنے کے لئے لامحالہ آسمانی وحی کے بارہ صدیوں کے خلا میں پروان چڑھنے والی خدابیزار، اخلاق دشمن اور حیوانی سطح پر زندگی گزارنے والے یونانی، ایرانی اور ہندی فلاسفہ کے سیکولر نظریات اور تعلیمات کا سہارا لینے کی عظیم خطا کے نتیجے میں انسانیت کا یہ سفر ابلیس نے صحیح سمت میں جاری رہنے کے عمل کو بنی اسرائیل کی بدنیتی اور بےعملی کے ذریعے DERAIL کر دیا اور انسانیت بالعموم اور بنی اسرائیل بالخصوص آخری آسمانی ہدایت کو نہ پہچان سکے اور نہ قبول کر سکے۔ فَیَا اَسَفَا .....

قال بل سولت لکم انفسکم امرا

فصبر جمیل

واللہ المستعان علی ماتصفون

سیّدنا محمد ﷺ کی حیاتِ طیبہ ایک نظر میں

سیرتِ نبوی ﷺ ماہ وسال کے آئینہ میں

ولادت نبی ﷺ:	9 ربیع الاول، 1 عام الفیل، مطابق 22 اپریل 571ء بروز دوشنبہ
بعثت نبوی ﷺ:	9 ربیع الاول 41 ولادت نبوی، 12 فروری، 610ء بروز دوشنبہ
معراج:	27 رجب، 10 نبوت، ..... بروز دوشنبہ
ہجرت:	27 صفر، 13 نبوت، مطابق 12 ستمبر 622ء بروز چہارشنبہ
غارِ ثور سے روانگی:	یکم ربیع الاول 13 نبوت، مطابق 16 ستمبر 622ء دوشنبہ
مدینے میں آمد:	12 ربیع الاول 1ھ مطابق 27 ستمبر 622ء بروز جمعہ
غزوۂ بدر:	17 رمضان 2ھ، مطابق 16 مارچ 624ء بروز شنبہ
غزوۂ اُحد:	6 شوال، 3ھ، مطابق 21 مارچ 625ء بروز شنبہ
غزوۂ احزاب:	28 شوال، 5ھ، مطابق 23 مارچ 627ء
صلح حدیبیہ:	ذی القعدہ، 6ھ، مطابق 628ء
سلاطین کے نام خطوط:	یکم محرم، 7ھ، مطابق 14 مئی 628ء بروز چہارشنبہ
غزوۂ خیبر:	آخر محرم، 7ھ، مطابق جون 628ء
عمرۃ القضاء:	ذی القعدہ، 7ھ، مطابق 629ء
فتح مکہ:	20 رمضان، 8ھ، مطابق 12 جنوری 630ء بروز پنجشنبہ
غزوہ حنین:	11 شوال، 8ھ، مطابق یکم فروری 630ء بروز چہارشنبہ
غزوہ طائف:	13 شوال، 8ھ، مطابق 3 فروری 630ء بروز جمعہ
غزوہ تبوک:	رجب تا رمضان، 9ھ، مطابق اکتوبر/دسمبر 630ء
حجۃ الوداع:	9 ذی الحجہ، 10ھ، مطابق 9 مارچ 631ء بروز جمعہ
وصال:	12 ربیع الاول، 11ھ/8 جون 632ء بروز دوشنبہ

(ماخوذ از شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا)

سیّدنا محمد ﷺ کی حیاتِ طیبہ
عظیم مسلم سیرت نگاروں کی نظر میں

کتبِ سیرت سے اقتباسات

1 رسولِ رحمت ﷺ

مولانا ابوالکلام آزاد

نیا زاویۂ نگاہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اس سلسلے میں ایک قدم آگے بڑھایا۔ وہ اپنی کتاب ''عہدِ نبوی کے میدانہائے جنگ'' کی تمہید میں لکھتے ہیں:

> عہدِ نبوی کی جنگیں تاریخ انسانی میں غیر معمولی طور سے ممتاز ہیں۔ اکثر دگنی، تگنی اور بعض وقت دس گنی قوت سے مقابلہ ہوا اور قریب قریب ہمیشہ ہی فتح حاصل ہوئی۔ دوسرے، چند محلوں پر مشتمل شہری مملکت سے جو آغاز ہوا وہ روزانہ دوسو چوہتر سے بھی زیادہ مربع میل کے اوسط سے وسعت اختیار کرتی ہے اور دس سال میں جب آنحضرت ﷺ کی وفات ہوئی تو دس لاکھ سے بھی زیادہ مربع میل کا رقبہ آپ کے زیر اقتدار آچکا تھا۔ اس تقریباً ہندوستان کے برابر وسیع علاقے کی فتح میں، جس میں یقیناً ملیونوں آبادی تھی، دشمن کے صرف ڈیڑھ سو آدمی قتل ہوئے اور مسلمان فوج کا مشکل سے اس دس سال میں ماہانہ ایک سپاہی شہید ہوتا رہا۔ انسانی خون کی یہ عزت تاریخ عالم میں بلاخوفِ تردید بے نظیر ہے۔ (ص 756)

مرقّع عبرت آپ نے رحمۃٌ للعالمین ﷺ کی ناخواستہ جنگوں کے اعداد ملاحظہ فرمالیے، جنھیں زیادہ سے زیادہ بڑھا کر بھی آٹھ نو سال میں تین ہزار تک پہنچایا جاسکتا ہے۔ اب داعیان تہذیب کی رزم آرائیوں کا پورا مرقع نہیں، بلکہ اس کی صرف چند جھلکیاں دیکھ لیجیے:

☆ ''سی سالہ جنگ'' 1618ء سے 1648ء تک تیس سال جاری رہی، جس میں جرمنی، فرانس، آسٹریا، سویڈن وغیرہ نے حصہ لیا، اس میں صرف جرمنی کے ایک کروڑ بیس لاکھ آدمی مارے گئے۔

☆ امریکی خانہ جنگی 1861ء سے 1865ء تک جاری رہی۔ اس میں ایک فریق شمالی ریاستیں اور دوسرا فریق جنوبی ریاستیں تھیں اور جنگ کا سبب غلامی کا مسئلہ تھا۔ اس میں تین لاکھ آدمی شمالی ریاستوں کے اور پانچ لاکھ جنوبی ریاستوں کے مارے گئے۔ چوہتر کروڑ پونڈ خرچ ہوئے۔ اس رقم سے دنیا بھر کے غلام ایک قطرۂ خون بہائے بغیر آزاد کرائے جاسکتے تھے۔ امریکہ میں غلامی قانوناً ختم ہوچکی ہے، لیکن اس کی تمام لعنتیں آج بھی وہاں مکروہ ترین صورت میں موجود ہیں۔

☆ پہلی عالمی جنگ میں ایک کروڑ آدمی مارے گئے تھے اور دو کروڑ مجروح ہوئے تھے۔ خدا جانے ان میں سے کتنے لولے، لنگڑے، اندھے اور اپاہج ہوئے اور کتنوں نے ہسپتالوں میں جانیں دیں۔ پھر اس جنگ ہی سے انفلوئنزا شروع ہوا، جس میں مزید ایک کروڑ آدمی مر گئے، ایک انسانیت دوست صاحب علم کا اندازہ ہے کہ اس جنگ پر اسّی ارب پونڈ خرچ ہوئے۔ اس رقم سے فرانس اور بلجیم کی نہ صرف زمین بلکہ ہر چیز پانچ پانچ مرتبہ خریدی جاسکتی تھی۔

☆ دوسری عالمی جنگ دوسری عالمی جنگ کے صرف مقتولین کی فہرست پر ایک نظر ڈال لیجیے:

چین	1310224	فرانس	200000
جرمنی	6300000	صرف فضائی بمباری سے	500000
جاپان	535795	بم باری سے	241309
یونان	415000	برطانیہ	353652

ان اعداد کی میزان قریباً ایک کروڑ بنتی ہے لیکن ان میں بہت سے شرکائے جنگ کے مقتولین شامل نہیں۔ مثلاً چیکوسلواکیا، پولینڈ، روس، فن لینڈ، یوگوسلافیا، بلغاریا، ناروے، ڈنمارک، ہالینڈ، اٹلی وغیرہ۔ پھر مختلف ملکوں کے ان گروہوں کا جانی نقصان معلوم نہ ہوسکا، جنھیں ہٹلر کی فوجیں جبری مزدوری کے لیے جرمنی لے گئے تھیں اور جنگ کے اختتام تک وہ لوگ واپس نہ ہوسکے۔ یہ تمام اعداد جمع کیے جائیں تو دوسری عالمی جنگ کا نقصان دو کروڑ افراد سے بھی

بڑھ جائے گا۔

آتش ریز اور آتش خیز بموں سے شہر، قصبے، کارخانے، کھیتیاں، زمینیں، گاؤں، بندرگاہیں، بجلی اور پانی کے مرکز جس طرح تباہ ہوئے ان کا اندازہ کون کرسکتا ہے؟ ہیروشیما اور ناگاساکی میں ایٹمی بموں سے جو قیامت برپا ہوئی، اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن ہی نہیں۔ (ص 783)

2۔ نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

گویا معلّم و مبلّغ، مربّی و مزکّی، مبشّر و منذر اور داعی و شاہد کی جملہ حیثیتیں مشترک ہیں آنحضور ﷺ اور جملہ انبیاء و رُسل علیہم السلام میں اگرچہ ان اعتبارات سے بھی ع ''ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است'' کے مصداق ہر نبی اور ہر رسول کا اپنا ایک منفرد رنگ بھی ہے، اور اس گلدستے میں بھی ایک امتیازی شان اور بلند و بالا مقام ہے سیّد الاوّلین والآخرین ﷺ کا! تاہم بحیثیت خاتم النّبیین و آخر المرسلین جن پر نبوت و رسالت کا اختتام ہی نہیں اِتمام و اِکمال بھی ہوا ہے۔ آپ ﷺ کے مقصد بعثت کی امتیازی شان کچھ اور ہی ہے جس کا بیان آگے آئے گا! (ص 25)

آخری بعثت کے لیے وقت کی تعیین و انتخاب میں حکمت

مزید غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ختم نبوت اتمام نعمت شریعت اور تکمیل دین حق کے لیے وقت کے انتخاب میں جو حکمت الٰہی کارفرما ہے اس کی جانب بھی انہیں دو الفاظ سے رہنمائی ملتی ہے۔ اس لیے کہ بعثت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا زمانہ نوع انسانی کی تاریخ کا وہ دور ہے جس میں دو ہی اعتبارات سے نسل انسانی گویا عہد طفولیت سے نکل کر بلوغ کو پہنچی تھی:

1۔ ایک اس اعتبار سے کہ عقل انسانی اپنی پختگی کو پہنچ گئی تھی اور انسان بحیثیت انسان جو کچھ سوچ سکتا تھا سوچ چکا تھا۔ یا یوں کہہ لیں کہ نسل انسانی عقلی و فکری اعتبار سے بالغ ہوگئی تھی۔ محترم پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم و مغفور جنہوں نے مذاہب عالم، فلسفہ، تصوف اور علم کلام کا

نہایت وسیع مطالعہ کیا، گواہی دیتے ہیں کہ تاریخ انسانی کے بارہ سو سال یعنی چھ سو سال قبل مسیح سے چھ سو سال بعد مسیحؑ تک کا عرصہ فکر انسانی کے عہد طفولیت سے نکل کر عقل وشعور کی پختگی تک پہنچنے کا زمانہ ہے، چنانچہ اس عرصے کے دوران میں تمام مذاہب عالم بھی پیدا ہو چکے تھے اور تمام مکاتب فلسفہ بھی وجود میں آ چکے تھے۔ اس کے بعد مادی علوم نے ضرور ترقی کی ہے اور انسانی معلومات کا دائرہ یقیناً نہایت وسیع ہوا ہے لیکن فکر کے میدان میں ہرگز کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ چنانچہ نہ کوئی واقعتاً نیا مذہب وجود میں آیا ہے نہ حقیقتاً جدید مکتب فکر یا مدرسہ فلسفہ اور فلسفہ جدید کے نام سے بھاری بھرکم عنوانات اور اصطلاحات کے ساتھ جو مکاتب فکر سامنے آئے ہیں ان کی حیثیت نئی بوتلوں میں پرانی شراب کے سوا اور کچھ نہیں ـــــ اب اگر یہ صحیح ہے، اور یقیناً صحیح ہے تو صاف سمجھ میں آتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی ہی موزوں ومناسب تھی اس کے لیے کہ ع ''نوع انساں را پیام آخریں!'' یعنی قرآن حکیم ''الہدیٰ'' بنا کر نازل کر دیا جاتا اور اس کی ابدالآباد تک حفاظت کا اہتمام وانتظام بھی کر دیا جاتا کہ نوعِ انسانی کی فکری رہنمائی کا مستقل سامان ہو جائے۔ (ص 32)

3۔ محسن انسانیت ﷺ

مولانا نعیم صدیقی

انقلابی کلمۂ حق پیغمبر انسانیت ﷺ نے کسی اعتقاد، کسی نظریہ اور کسی نقشہ فکر کے بغیر اصلاح وتعمیر کا کام یونہی شروع نہیں کر دیا۔ محض ایک مبہم جذبہ نہ تھا کوئی جنونِ خام نہ تھا، بلکہ حضور ﷺ کون ومکان کی عظیم ترین سچائی کی مشعل لے کر اٹھے انتہائی حساس قلب کے ساتھ برسوں حضور ﷺ نے زندگی کے معمے پر کاوشیں کی تھیں۔ غار حرا کی خلوتوں میں مدتوں اپنے اندرون کا بھی مطالعہ کیا اور بیرونی علم پر بھی غور کیا۔ تمدن کے صلاح وفساد کے اصولوں کو سمجھنے میں بھی دماغ کھپایا ـــــ لیکن عملی اقدام اس وقت تک نہیں کیا جب تک کہ علم الٰہی نے آپ ﷺ کے قلب کو حقیقت سے منور نہیں کر دیا اور سب سے بڑی سچائی پوری طرح آپ کے سامنے بے نقاب نہیں ہوگئی۔ سب سے بڑی سچائی یہ ہے کہ کائنات کا ایک خدا ہے اور انسان اس کا بندہ ہے! یہی کلمہ حق حضور ﷺ کے انقلاب کا بیج تھا۔ اس بیج سے صالح زندگی اور صحت مند تمدن کا وہ شجرۂ طیبہ نمودار ہو سکتا تھا جس کی شان یہ ہے کہ اس کی جڑیں زمین میں گہری اتری ہوئی ہیں اور

اس کی شاخیں فضا کی بلندیوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔

حضور ﷺ کا کلمہ حد درجہ کا انقلابی کلمہ تھا۔ ''لا الٰہ الا اللہ'' لفظی پہلو سے انتہائی مختصر معنوی لحاظ سے بے حد عمیق ''ایک اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ صرف وہی ایک الٰہ ہے۔'' الٰہ اس طاقت یا ہستی کو کہتے ہیں جس کی غلامی کی جائے، جس پر آدمی والہانہ طور ہر فدا ہو جس کی عظمت مان کر پرستش کرے، جس کی تحمید و تقدس کرے، جس کے گن گائے، جس کی تسبیح کرے، جس کو نذر پیش کرے، جس سے بھلائی کی امید لگائے، اور جس کی گرفت سے ڈرے، جس سے نیکی کی جزا کا امیدوار ہو اور جس سے برائی کی سزا کا اندیشہ رکھے، جس کو اپنا مالک و مختار سمجھے، جس کو فرماں روا اور قانون ساز مانے، جس کے مطالبوں کو پورا کرے اور جس کے منع کردہ امور سے باز رہے، جس کے دیے ہوئے اصولوں کو بنائے زندگی بنائے، جس کی مقررہ حدوں کی پابندی کرے، جس کے ضابطہ حلال و حرام کو بے چون و چرا مانے، جس کو اپنے لیے سرچشمہ ہدایت تسلیم کرے جس کی مرضی کے مطابق نظامِ حیات کی تشکیل کرے، جس کے پسندیدہ لوگوں کا احترام کرے اور جس کے مخالفوں کی مخالفت کرے، جس کے اشاروں پر تن من دھن کی بازی لگائے اور جس کی رضا کو زندگی کا نصب العین قرار دے۔ الوہیت کا یہ وہ وسیع مفہوم تھا جو ایک لفظ میں پنہاں تھا۔

الوہیت کے یہ حقوق خدائے واحد سے الگ کر کے بہت سی انسانی طاقتوں نے پارہ پارہ کر کے بانٹ رکھے تھے اور بے شمار آلہہ تمدن پر سوار تھے۔ انسان کا اپنا نفس اور اس کی خواہش، خاندان اور برادری کی رسمیں، نسلی، قومی اور قبیلوں وحدتوں کی روایات، جاگیردار اور پجاری طبقوں کی بالادستی شاہی خاندانوں اور درباری اشراف کی کبر پسندی، یہ مختلف طبق برطبق الوہیتیں تھیں جن کے نیچے عام آدمی پس رہا تھا ''لا الٰہ الا اللہ'' کی شاہ ضرب ان سب پر یکدم پڑتی تھی۔ اس کلمے کا کہنے والا گویا یہ اعلان کرتا تھا کہ خدا کے سوا کسی کی عظمت مجھے تسلیم نہیں کسی کی بالادستی قبول نہیں، کسی کا بنایا ہوا ضابطہ و قانون منظور نہیں، کسی کے حاصل کردہ فوق الانسانی حقوق جائز نہیں، کسی کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا جائے گا، کسی کی رضا جوئی اب نہ کی جائے گی اور کسی کے اشارۂ ابرو پر اب زندگی کا نظام نہیں چلے گا، خدا کے سوا ہر دوسری خدائی توڑ دی جائے گی۔ یہ کلمہ کی سچی آزادی کا اعلان تھا۔ لا الٰہ ضرب است و ضربِ کاری است

اس کلمہ کے دوسرے جز میں یہ اقرار شامل تھا کہ انسانی ہدایت اور تمدن کی اصلاح کے لیے واحد ذریعہ وہ سلسلہ نبوت ورسالت ہے جو اللہ نے قائم کیا ہے، زندگی کا اصل علم وہ ہے جو وحی کے ذریعے آیا اور اسی سے عقل انسانی کو سوچنے کے لیے رہنما اصول ملتے ہیں۔ پھر یہ کہ محمد ﷺ اس سلسلۂ رسالت کی تکمیل فرمانے والے ہیں اور اب زندگی کی رہنمائی اس ہستی کے واسطے حاصل ہوسکتی ہے اور اس ہستی کی قیادت میں قافلہ انسانیت فلاح وارتقاء کی راہ پر گامزن ہوسکتا ہے۔

اس کلمے کی یہی اہمیت تھی کہ جس کی وجہ سے اس کا اقرار اسلام میں داخلہ کی شرط اوّل ٹھہرا اس کلمے کو مؤذنوں نے بلند آواز سے پکارا۔ اس کلمے کو نماز میں شامل کیا گیا۔ اسے افضل الذکر قرار دیا گیا اور ہر لحاظ سے یہ کلمہ تحریک اسلامی کا طغریٰ یا سلوگن بن گیا۔

حضور ﷺ کا انقلابی کلمہ حق جس دل میں اترا اس کی کایا پلٹ دی جس زندگی میں داخل ہوا اس کا نقشہ بدل دیا اور اس بیج سے نئی انسانیت پیدا ہوئی اور نشوونما پانے لگی۔ (ص 28)

4۔ نبیٔ رحمت ﷺ

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی

عالمگیر فساد ..... بعثت محمدی ﷺ کے زمانہ میں پوری انسانیت خودکشی کے راستہ پر تیزی کے ساتھ گامزن تھی، انسان اپنے خالق اور مالک کو بھول چکا تھا اور خود اپنے آپ کو اور اپنے مستقبل اور انجام کو فراموش کر چکا تھا، اس کی اندر بھلائی اور برائی اور زشت وخوب میں تمیز کرنے کی بھی صلاحیت باقی نہیں تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انسانوں کے دماغ ودل کسی چیز میں کھو چکے ہیں۔ ان کو دین وآخرت کی طرف سر اٹھا کر دیکھنے کی بھی فرصت نہیں، اور روح وقلب کی غذا، اخروی فلاح، انسانیت کی خدمت اور اصلاحِ حال کے لئے ان کے پاس ایک لمحہ خالی نہیں، بسا اوقات پورے پورے ملک میں ایک شخص ایسا نظر نہ آتا جس کو اپنے دین کی فکر ہو، جو خدائے واحد کی پرستش کرتا ہو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراتا ہو، جس کے جگر میں انسانیت کا درد ہو اور اس کے تاریک و ہولناک انجام پر کچھ بے چینی ہو، یہ صورت حال اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی ہو بہو تصویر تھی کہ

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَیْدِی النَّاسِ لِیُذِیْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِیْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ

''خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب فساد پھیل گیا ہے، تا کہ خدا ان کو ان کے بعض عملو کا مزہ چکھائے، عجب نہیں کہ وہ باز آجائیں۔'' (ص45)

5۔ مقدمہ سیرۃ الرسول ﷺ

پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری

اس دور میں احیائے اسلام اور ملت کی نشاۃ ثانیہ کی جس قدر علمی و فکری تحریکیں منصۂ شہود پر آئی ہیں ان کی تعلیمات سے جو تصور مسلمانوں کی نوجوان نسل کے ذہنوں میں پیدا ہو رہا ہے یہی ہے کہ اسلام کو بحیثیت نظامِ حیات قبول کر لینا اور حضور ﷺ کی سیرت و تعلیمات پر عمل پیرا ہونا ہی کمالِ ایمان اور محبت رسول ﷺ ہے۔ اس اتباع کے علاوہ جناب رسالت مآب ﷺ کی ذات ستودۂ صفات سے خاص قسم کا قلبی، عشقی اور جذباتی لگاؤ مقصودِ ایمان ہے نہ تعلیم اسلام، بلکہ یہ جاہلانہ شخصیت پرستی کی ایک صورت ہے جو توحید خالص کے منافی ہے۔

اس نام نہاد روشن خیالی سے ہماری حیاتِ ملّی پر جو مضر اثرات مرتب ہوئے محتاجِ بیان نہیں ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ سیرت النبی ﷺ کے ذریعے عشق رسول ﷺ کے اصل تصور کو اس طرح اجاگر کیا جائے کہ آج کی نوجوان نسل جو تلاشِ حقیقت میں سرگرداں ہے اس آفاقی حقیقت سے باخبر ہو کر پھر سے اپنے آقا و مولا ﷺ کے ساتھ وہ تعلق جبی استوار کر لے کہ اس کی نظروں کو دانش فرنگ کے جلوے کبھی خیرہ نہ کر سکیں۔

بقول اقبال خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوہ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

اور انھیں دین حق کی اس کامل تعبیر کی صحیح معرفت نصیب ہو جسے اقبال نے اس شعری قالب میں ڈھال دیا ہے:

؎ بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باُو نرسیدی تمام بولہبی است

(جلد اول، ص25-26)

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے
حکمران اور عوام سب برابر تھے

سب اسلام کے حکم بردار بندے سب اسلامیوں کے مددگار بندے
خدا اور نبی کے وفادار بندے یتیموں کے رانڈوں کے غمخوار بندے
رہ کفر و باطل سے بیزار سارے
نشے میں مئے حق کے سرشار سارے

جہالت کی رسمیں مٹا دینے والے کہانت کی بنیاد ڈھا دینے والے
سر احکامِ دیں پر جھکا دینے والے خدا کے لیے گھر لُٹا دینے والے
ہر آفت میں سینہ سپر کرنے والے
فقط ایک اللہ سے ڈرنے والے

نہ کھانوں میں تھی واں تکلف کی کلفت نہ پوشش سے مقصود تھی زیب و زینت
امیر اور لشکر کی تھی ایک صورت فقیر اور غنی سب کی تھی ایک حالت
لگایا تھا مالی نے اِک باغ ایسا
نہ تھا جس میں چھوٹا بڑا کوئی پودا

خلیفہ تھے اُمت کے ایسے نگہباں ہو گلہ کا جیسے نگہبان چوپاں
سمجھتے تھے ذِمی و مسلم کو یکساں نہ تھا عبد و حر میں تفاوت نمایاں
کنیز اور بانو تھیں آپس میں ایسی
زمانے میں ماجائی بہنیں ہوں جیسی

مسدّس حالی الطاف حسین حالی

غیر مسلم زعماء کا خراجِ عقیدت
سرورِ کائنات ﷺ کے حضور

سرورِ کائنات ﷺ غیر مسلم مفکّرین کی نظر میں

خواجہ ظفر نظامی نوشہروی
(بشکریہ نقوش، رسول نمبر، جلد 4)

اَلْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ (بے شک بزرگی اور فضیلت وہی ہے جس پر دشمن اور اعدائے اسلام گواہی دیں) مشرق و مغرب کے بڑے بڑے محقق، اصحابِ فراست و لیاقت نے اس بات کو تسلیم کرلیا ہے کہ حضور انور ﷺ کا درجہ اور مرتبہ دنیا کے بڑے بڑے لوگوں میں سب سے اُونچا اور بلند ہے اور غیر مسلم محققین نے آپ ﷺ کی تہذیب، دیانت، امانت داری، غریبوں پر رحم و کرم، مساوات بین الاقوام اور انسانی صفات کا مکمل نمونہ آپ کو مان لیا ہے۔ لہٰذا ان مفکرین نے اپنے تحریروں میں سرورِ کائنات ﷺ کے متعلق جو اعترافِ حقیقت کیا ہے انہی کے الفاظ میں پیشِ خدمت ہے۔ البتہ ان عطر بیز الفاظ سے جو خوشبو پیدا ہوتی ہے ان کے مطابق عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔

1۔ سب سے زیادہ کامیاب پیغمبر

''تمام پیغمبروں اور مذہبی شخصیتوں میں محمد (ﷺ) سب سے زیادہ کامیاب ہیں۔''

(مقالہ نگار انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا)

2۔ پیکر شرافت

''حضرت محمد (ﷺ) کا اخلاق وہی تھا جو ایک شریف عرب کا ہوسکتا ہے۔ آپ ﷺ

امیر وغریب کی یکساں عزت کرتے تھے اور اپنے گرد وپیش لوگوں کی خدمت کا بہت خیال رکھتے تھے۔'' (مغربی فاضل مارکس ڈاڈ)

3۔ مصلح اعظم ﷺ

''آپ ہر شخص سے ہر وقت ملنے کے لیے تیار رہتے تھے۔آپؐ کی فیاضی وسیر چشمی غیر محدود تھی۔اصلاحِ قوم کی فکر میں ہمہ وقت مصروف ومنہمک رہتے تھے۔آپؐ نے قوم کے لیے بہترین مثال پیش کی۔مزاج میں تمکنت ونخوت نام کو بھی نہ تھی۔یہاں تک کہ آپؐ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تعظیم وتکریم کے رسمی آداب سے بھی منع فرمادیتے تھے۔'' (ڈاکٹر گلیوڈیا)

4۔ دنیا کے بہترین اُستاد

''پیشوائے دین اسلام محمد (ﷺ) کی زندگی دنیا کو بے شمار قیمتی سبق پڑھاتی ہے۔اور آپؐ کی ہر حیثیت اور آپؐ کی زندگی کا ہر پہلو دنیا کے لیے بہترین سبق ہے۔بشرطیکہ کوئی دیکھنے والی آنکھ، سوچنے والا دماغ اور محسوس کرنے والا دل رکھتا ہو۔'' (از بحر نبوت، مصنفہ مہاتما ستیہ دہاری)

5۔ قابل عزت ہستی

''محمد (ﷺ) کے سوانح نگاروں کا ایک ایسا طویل سلسلہ ہے جس کا ختم ہونا ناممکن ہے لیکن اس میں جگہ پانا قابل عزت ہے۔'' (از محمد ﷺ صفحہ 1، مصنفہ پروفیسر مارگیولیس)

6۔ سب سے سچی زندگی

''اس میں کچھ شبہ نہیں کہ تمام مصنفوں اور فاتحوں میں ایک بھی ایسا نہیں جس کی سوانح حیات محمد (ﷺ) کی سوانح حیات سے زیادہ مفصل اور سچی ہو۔'' (از اپالوجی فار محمد ﷺ اینڈ دی قرآن، مصنفہ جان ڈیون پورٹ)

7۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے افضل

''باوجود یکہ محمد (ﷺ) اور عیسیٰ (علیہ السلام) کی ابتدائی زندگی میں کچھ مشابہت پائی جاتی

ہے لیکن بہت سے امور بالکل مختلف ہیں۔عیسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لانے والے بارہ حواری ناخواندہ، بے سمجھ اور کم حیثیت لوگ تھے۔ برعکس اس کے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لانے والے سوائے غلام زید رضی اللہ عنہ اور حبشی بلال رضی اللہ عنہ کے سب کے سب معزز طبقہ کے لوگ تھے اور بعض ان کے خاندان کے بزرگ بھی تھے جنہوں نے بحیثیت خلیفہ اور سپہ سالار اسلام کی وسیع سلطنت کا نظم ونسق بہترین طریقہ سے انجام دیا۔'' (مسٹر گاڈفری ہیگنس)

8۔عظیم الشان مصلح

''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان عظیم الشان مصلحین میں سے ہیں جنہوں نے اتحادِ اُمم کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ان کے فخر کے لیے یہ بالکل کافی ہے کہ انہوں نے وحشی انسانوں کو نورِ حق کی جانب ہدایت کی، اور ان کو ایک اتحادی وصلح پسندی اور پرہیزگاری کی زندگی بسر کرنے والا بنا دیا، اور ان کے لیے ترقی وتہذیب کے راستے کھول دیے اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اتنا بڑا کام صرف ایک فردِ واحد کی ذات سے ظہور پذیر ہوا۔'' (رومی فلاسفر کاؤنٹ ٹالسٹائی)

9۔اعلیٰ اخلاق کے پاکیزہ معلم

''میں دنیا کے مذاہب کا مطالعہ کرنے کا عادی ہوں میں نے اسلام کا بھی مطالعہ کیا ہے بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلیٰ اخلاق کی پاکیزہ تعلیم دی ہے۔جس نے انسان کو سچائی کا راستہ دکھایا اور برابری کی تعلیم دی ہے۔میں نے قرآن مجید کا ترجمہ بھی پڑھا ہے۔اس میں مسلمانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ سب کے لیے مفید باتیں اور ہدایتیں ہیں۔'' (مہاتما گاندھی)

10۔عظیم الشان ملکی اور تمدنی نظام کے بانی

''جب ہم اس زمانہ پر غور کرتے ہیں، جس میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت اور رسالت کا علم بلند کیا اور جس میں ایک ایسا کامل مجموعہ قوانین تیار کیا گیا ہے جو دنیا کی ملکی، مذہبی اور تمدنی ہدایتوں کے لیے کافی ہے تو ہم نہایت حیران ہوتے ہیں کہ ایک ایسا عظیم الشان ملکی اور تمدنی نظام جس کی بنیاد کامل اور سچی آزادی پر ہے، کس طرح قائم کیا گیا ہے؟ پس ہم دل سے اقرار کرتے ہیں کہ اسلام ایک ایسا مجموعہ قوانین ہے جو ہر لحاظ سے بہترین ہے''۔

(موسیو اوجیل کلوفل)

11۔موجودہ مصائب کے نجات دہندہ

''موجودہ انسانی مصائب سے نجات ملنے کی واحد صورت یہی ہے کہ محمد (ﷺ) اس دنیا کے ڈکٹیٹر (رہنما) بنیں''۔(جارج برنارڈ شا)

12۔روشن چراغ اور صاحب خلق عظیم

''ہم تسلیم کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ ایک روشن چراغ تھے۔ رحمۃ للعالمین اور صاحب خلقِ عظیم تھے کہ ان کے اوصاف سے آخران کی کوشش بارآور اور سعی مشکور ہوئی۔

آنحضرت ﷺ کی صفات حمیدہ وفضائل حسنہ، خلقِ عظیم، شرافت ونجابت بلکہ منصب رسالت کا انکار بھی محال ہے۔ ہمارا یقین ہے کہ وہ ایک عظیم الشان، ذی قدر اور بلند مرتبہ انسان تھے، مامور من اللہ تھے۔ اوران میں وہ الٰہی روشنی اور حقیقی نور پرتو فگن تھا، جو دنیا میں آکر ہر شخص کو منور کرتا ہے اور یہ کچھ ہمیں پر موقوف نہیں، بلکہ بیشتر غیر مسلم مصنّفین باوجود مخالفت و دشمنی کے آپ ﷺ کی خوبیوں کا اقرار کرنے پر مجبور ہوگئے۔ یہاں تک کہ بعضوں نے صاف الفاظ میں ان کا مامور من اللہ اور رسول اللہ ہونا تسلیم کیا ہے۔'' (از قرآن السعیدین، ص58 وص84، مصنفہ مسیحی عالم بحوالہ حقانیت اسلام)

13۔معاشرتی بین الاقوامی انقلاب کے بانی

نبی عربی ﷺ اس معاشرتی اور بین الاقوامی انقلاب کے بانی ہیں۔جس کا سراغ اس سے قبل تاریخ میں نہیں ملتا۔انہوں نے ایک ایسی حکومت کی بنیاد رکھی جسے تمام کرۂ ارض پر پھیلنا تھا اور جس میں سوائے عدل اور احسان کے اور کسی قانون کو رائج نہیں ہونا تھا۔ ان کی تعلیم تمام انسانوں کی مساوات، باہمی تعاون اور عالمگیر اخوت تھی۔(ریمنڈ لیروگ)

14۔تعلیمات جمہوریت کا سرچشمہ

عرب جہاں ایک خدا نے اونٹ والے ﷺ کو پیغام بھیجا۔جس نے وہ تعلیمات دیں۔ جو جمہوریت کا سرچشمہ کہی جاسکتی ہیں۔ان ﷺ کے متعلق یہ صحیح طور پر کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے

لوگوں کو صحیح مساوات اور اخوت کے ایک رشتہ میں جکڑ دیا اور وہ واقعی طور پر بہترین تعلیمات تھیں''۔(بلبل ہند سروجنی نائیڈو۔سابق صدر کانگرس)

15۔بہترین اوصاف کے حامل

رسول عربی ﷺ کی سوسخ عمری بہترین اوصاف اور خوبیوں کا مجموعہ ہے۔آپ ﷺ کا دل عجز وانکسار،نرمی اور رحم دلی،محبت والفت سے لبریز تھا۔آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ میری شان انسان کی شان سے زیادہ نہیں، مجھے اللہ کا نوکر کہہ کر پکارو۔ جب آپ ﷺ کا مرید آپ سے استفسار کرتا ہے۔آپ ان لوگوں پر لعنت کیوں نہیں بھیجتے جو آپ پر ایمان نہیں لاتے۔تو جواب میں فرماتے ہیں مجھے لعنت بھیجنے کے لئے نہیں بھیجا گیا بلکہ مجھے انسانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔''(شکتی اشرام راجپور سندھ کے پروفیسر ایل وسوانی)

16۔محسن انسانیت

''اسلام کے داعی محمد (ﷺ) تاریخ کے صفحات پر نہایت صاف روشنی میں کھڑے ہیں۔حالانکہ ان کے مقابلہ میں مسیح (علیہ السلام) کی تاریخ دھندلی ہے اور بدھ کی ان سے زیادہ دھندلی ہے۔انہوں نے بت پرستی اور دوسرے مکروہ مروّجات کو باطل قرار دے کر خالص سامی وجدان کے ساتھ وحدانیت الٰہی کا اعلان کیا۔ وہ اللہ کے ایک سچے بندے اور اس کے فرمانبردار پیغام رساں تھے۔محمد رسول اللہ نے دنیا کے ساتھ اتنا احسان کیا ہے کہ کسی دوسرے انسان نے نہیں کیا۔''
(مدراس کے ہندو فاضل،مسٹر ونکٹا رتنام)

17۔وحدت کی لڑی میں پرونے والے مہاپرش

''وحشی جنگجو عربوں کو وحدت کی لڑی میں پرونے اور ایک زبردست قوم کی صورت میں کھڑا کر دینے کے لیے ایک مہاپرش (عظیم انسان) کا ظہور ہوا۔اندھی تقلید کے کالے پردے پھاڑ کر اس نے تمام قوموں کے دلوں پر واحد خدا کی حکومت قائم کی۔ وہ انسانی لعل کون تھا؟ محمد (ﷺ)''۔(پنڈت شیونرائن)

18۔رہبرانِ بنی نوع انسان میں ممتاز

''مجھے یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ میرے دل میں پیغمبر اسلام کے لیے نہایت عزت ہے۔ میری رائے میں ہادیانِ دین و رہبرانِ بنی نوع انسان میں ان کا درجہ بہت بلند ہے''۔
(مشہور مورخ، لالہ لاجپت رائے)

19۔ یتیموں کے مربی

''آپؐ نے یتامیٰ کی بدحالت کو درست کرنے کی طرف جو توجہ کی اور ان کی بہتری کا جو فکر رکھا وہ قابل تعریف ہے۔ یتیموں کو ستانے والوں کی نسبت آپ ﷺ کا سخت ملامت سے کام لینا ظاہر کرتا ہے کہ آپ ﷺ اس برائی کی اصلاح کی سخت تڑپ رکھتے تھے۔'' (مشہور مسیحی فاضل، ویری)

20۔ عورتوں کے محسن

''محمد (ﷺ) نے عورتوں کے حقوق کی ایسی حفاظت کی کہ اس سے پہلے کسی نے نہ کی تھی اس کی قانونی ہستی قائم ہوئی، جس کی بدولت وہ مال وراثت میں حصہ کی حقدار ہوئی۔ وہ خود اقرار نامے کرنے کے قابل ہے اور برقعہ پوش مسلمان خاتون کو ہر ایک شعبۂ زندگی میں وہ حقوق حاصل ہوئے جو آج بیسویں صدی میں اعلیٰ تعلیم یافتہ آزاد عیسائی عورت کو حاصل نہیں ہیں''۔ (مسٹر پیٹر کریٹس)

21۔ پکے راست باز اور سچے ریفارمر

''اس میں شک نہیں کہ حضرت محمد (ﷺ) بڑے پکے راست باز اور سچے ریفارمر تھے۔ اگر وہ ایسے نہ ہوتے تو ہرگز اپنے مقدس مشن میں آخر تک مستقل اور ثابت قدم نہ رہ سکتے تھے۔ وہ ڈگمگا جاتے اور ان کو لغزش ہو جاتی۔'' (مسٹر اے۔ فری مین)

22۔ جانوروں کے لیے بھی باعث رحمت

''حضرت محمد (ﷺ) کی دردمندی کا دائرہ انسان ہی تک محدود نہ تھا بلکہ جانوروں پر بھی ظلم وستم توڑنے کو سخت برا کہا ہے۔'' (مشہور انگریز مصنف ڈی۔ ایس مارگولیوتھ)

23۔ مقدس ذات اور سچے رسول

''میں نے اپنی تحقیقات میں کوئی ثبوت ایسا نہیں پایا جس سے حضرت محمد (ﷺ) کے دعویٰ رسالت میں شبہ ہو سکے یا ان کی مقدس ذات پر مکر وفریب کا الزام لگایا جا سکے''۔(مسٹر سیل)

24۔ پُرنور وحدانیت کی بشارت

''محمد (ﷺ) ایک نبی تھے جو دنیائے جہاں کو دعوت حق دینے کے لیے مبعوث ہوئے۔اور نبی بھی ایسے کہ ہستی باری تعالیٰ کی پرنور وحدانیت کی ایک بشارت تھے''۔(اتھارٹی ان ریلیجز، ص 17۔مصنفہ جے۔ایچ لیکی)

25۔ گمراہوں کے بہترین ہادی

''بے شک حضرت محمد (ﷺ) نے گمراہوں کے لیے ایک بہترین راہِ ہدایت قائم کی۔اور یقیناً آپ کی زندگی نہایت پاک صاف تھی۔آپ ﷺ کا لباس اور آپ ﷺ کی غذا بہت سادہ تھی۔آپ کے مزاج میں بالکل تمکنت نہ تھی۔یہاں تک کہ وہ اپنے متبعین کو تعظیم وتکریم کے رسمی آداب سے منع فرماتے تھے۔آپ ﷺ نے اپنے غلام سے کبھی وہ خدمت نہ لی جس کو آپ ﷺ خود کر سکتے تھے۔آپ ﷺ بازار جا کر خود ضرورت کی چیزیں خریدتے، اپنے کپڑوں میں پیوند لگاتے، خود بکریوں کا دودھ دوہتے اور ہر وقت ہر شخص سے ملنے کے لیے تیار رہتے تھے۔آپ ﷺ بیماروں کی عیادت کرتے تھے اور ہر شخص سے مہربانی کا برتاؤ فرماتے تھے۔آپ ﷺ کی خوش اخلاقی، فیاضی اور رحم دلی محدود نہ تھی۔غرض آپ ﷺ قوم کی اصلاح کی فکر میں ہر وقت مشغول رہتے تھے۔آپ ﷺ کے پاس بے شمار تحائف آتے تھے لیکن بوقت وفات آپ ﷺ نے صرف چند معمولی چیزیں چھوڑیں اور ان کو بھی مسلمانوں کا حق سمجھتے تھے۔''(ڈاکٹر جی۔ویل)

26۔ فصاحت وبلاغت میں یکتائے روزگار

''عالم الٰہیات، فصاحت وبلاغت میں یکتائے روزگار، بانی مذہب، آئین ساز، سپہ سالار، فاتح اصول، عبادت الٰہی میں لاثانی، دینی حکومت کے بانی۔یہ ہیں محمد رسول اللہ ﷺ، جن کے سامنے پوری انسانیت ہیچ ہے۔''(از ہسٹری لاٹرکی۔مصنفہ الفریڈ۔ڈی لمرٹائن، فرانسیسی ادیب)

27۔ پیغمبر مساوات واخوّت

''دنیا میں پیغمبر مساوات حضرت محمد (ﷺ) تشریف لائے۔تم پوچھتے ہو کیا ان کا مذہب اچھا ہے؟ اگر ان کا مذہب اچھا نہ ہوتا تو وہ پھر زندہ کیسے رہتا؟ صرف اچھے اور نیک انسان ہی کو حیاتِ دوام ملتی ہے۔محمد (ﷺ) مساوات اور انسانی اخوّت کے علمبردار تھے۔'' (دی گریٹ ٹیچرز آف دی ورلڈ۔مصنفہ سوامی وی ویکانند)

28۔بلند مرتبہ سیاسی مدبر

''حضرت محمد (ﷺ) ایک صحیح دماغ رکھنے والے انسان اور بلند مرتبہ سیاسی مدبر تھے۔ انہوں نے جو سیاسی نظام قائم کیا وہ نہایت شاندار تھا۔'' (از میثاقِ ملی۔مصنفہ روسو، بانی انقلابِ فرانس)

29۔اعلیٰ صفات کے مالک

''ہم نہیں جانتے کہ محمد (ﷺ) اپنی زندگی میں کبھی کسی رذیل حرکت کے مرتکب ہوئے ہوں۔البتہ نہایت اعلیٰ صفات کے مالک تھے۔'' (مسٹر جان آرکس)

30۔جمعیۃ الاقوام کے بانی

''پیغمبر اسلام ﷺ نے جس جمعیۃ الاقوام کی بنیاد ڈالی، اس نے قوموں کے اتحاد اور انسانوں کی اخوت کو ایسی وسیع بنیادوں پر قائم کر دیا جس سے دوسری اقوام کو شرمندہ ہونا چاہئے۔حقیقت یہ ہے کہ جمعیۃ الاقوام کے تخیل کی طرف جس طریق سے مسلمان اقوام نے پیش قدمی کی ہے اس سے بہتر مثال دوسری اقوام پیش نہیں کر سکتیں۔'' (از دی مسلم ورلڈ آف ٹوڈے۔مصنفہ پروفیسر ہرگونجے)

31۔صادقِ عظیم

''پیغمبر اسلام ﷺ کی صداقت کا یہی بڑا ثبوت ہے کہ جو آپ کو سب سے زیادہ جانتے تھے وہی آپ پر سب سے پہلے ایمان لائے۔حضرت محمد (ﷺ) ہرگز جھوٹے مدعی نہ تھے۔اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام میں بڑی خوبیاں اور باعظمت صفات موجود ہیں۔پیغمبر اسلام ﷺ نے ایک ایسی سوسائٹی کی بنیاد رکھی جس میں ظلم اور سفاکی کا خاتمہ کیا گیا۔'' (از آؤٹ لائن آف ہسٹری۔مصنفہ پروفیسر ایچ۔جی۔ویلز)

32۔ پاکیزہ فاتح

''حضرت محمد (ﷺ) اپنے آبائی شہر مکہ میں جب فاتحانہ داخل ہوئے اور اہل مکہ جو آپ کے جانی دشمن اور خون کے پیاسے تھے ان سب کو معاف کر دیا۔ یہ ایسی فتح تھی اور پاکیزہ فاتحانہ داخلہ تھا جس کی مثال ساری تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔'' (از مقدمہ پیغمبر اسلامؐ پر تقریریں۔ مصنفہ، سٹینے لین پول)

33۔ فخرِ عالم

''اے شہر مکہ کے رہنے والے! اور بزرگوں کی نسل سے (پیدا ہونے والے)! اے آباو اجداد کے مجد و شرف کو زندہ کرنے والے! اے سارے جہاں کو غلامی کی ذلت سے نجات دلانے والے! دنیا آپ ﷺ پر فخر کر رہی ہے اور خدا کی اس نعمت کا شکر ادا کر رہی ہے۔ اے ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی نسل سے! اے وہ کہ جس نے عالم کے لیے اسلام کی نعمت بخشی! تمام لوگوں کے قلوب کو متحد کر دیا اور خلوص کو اپنا شعار بنایا۔ اے وہ کہ جس نے اپنے دین میں (اِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّیَّات) ''اعمال کا انحصار نیتوں پر ہے'' کی تعلیم دی! ہم آپ کا بہت ہی شکریہ ادا کرتے ہیں اور بہت ہی مرہونِ منت ہیں۔'' (از لائف آف دی ہولی پرافٹ۔ مصنفہ ڈاکٹر ایسٹن)

34۔ ایشیا کے لیے قابلِ فخر

''محمد (ﷺ) انسانیت کے سب سے بڑے خیر خواہ و محسن تھے۔ ایشیا جبکہ اولاد پر فخر کرتا ہے تو اس وحید الدہر و اکبر الرجال شخص کی ذات والا صفات پر فخر کرنا واجب اور ضروری ہے۔ محمد (ﷺ) کی بعثت میں شک کرنا گویا اس قدرت الٰہی میں شک کرنا ہے جو کہ تمام کائناتِ عالم پر مشتمل ہے۔'' (از پرافٹ نمبر۔ مضمون نگار۔ مسٹر جان)

35۔ تاریخ عالم کے انقلابی

''کولمبس نے جب نئی زمین دریافت کی، اس سے ایک ہزار سال قبل مکہ میں ایک بچہ کا ظہور ہوا، جس کو اللہ تعالیٰ نے تاریخ عالم میں انقلاب برپا کرنے کے لیے چن لیا تھا۔ محمد (ﷺ)

اوّل شخص ہیں جنہوں نے جزیرۂ عرب کے تمام قبائل کو ایک کر دیا۔ آپؐ ایسے مناسب وقت میں تشریف لائے جبکہ عرب کو اجنبیوں کے ہاتھوں سے خلاصی کی سخت ضرورت تھی۔ آپؐ اپنی محنتوں و کوششوں میں بشارتوں وخوشخبریوں کی وجہ سے کامیاب ہوئے۔'' (مسٹر لائل ٹامس، امریکی)

36۔ بت شکن نبی

''محمد (ﷺ) نبی تھے۔ بت پرستی کو بالکل غلط اور لغو جانتے تھے۔ انہوں نے اپنی قوم کو وحشیانہ مذہب اور پست اخلاق سے نجات دلائی۔ ممکن نہیں کہ ہم انؐ کے قلبی اخلاص اور دینی حمیّت کا انکار کریں۔'' (پرنسپل ایڈورڈ ساؤتھ)

37۔ سب سے اکمل اور افضل

''محمد (ﷺ) گزشتہ اور موجودہ لوگوں میں سے اکمل اور افضل تھے۔ اور آئندہ ان کا مثال پیدا ہونا محال اور قطعاً غیر ممکن ہے۔'' (ڈاکٹر شیلے)

38۔ جلیل القدر اور عظیم الشان رسول

''بلا کسی شک وشبہ کے کہا جا سکتا ہے کہ محمد (ﷺ) نبی اور اللہ قادر مطلق کے رسول تھے اور نہ صرف رسول بلکہ جلیل القدر اور عظیم الشان رسول تھے جنہوں نے ملت اسلامیہ کی بنیاد رکھی۔'' (مسٹر کسلوزان)

39۔ مشیتِ الٰہی کے مبلغ

''محمد (ﷺ) نے دین اسلام کی بنیاد عبادت اور تہذیبِ نفس پر رکھی۔ کل تعلیمات کا قدر مشترک یہی ہے کہ نفس کو مغلوب اور مہذب بنایا جائے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے لوگوں کو اس بات کی دعوت دی کہ وہ اپنے کل ارادوں کو خدائے قدوس کی مشیت پر چھوڑ دیں۔'' (فرانس کا مشہور فلسفی فالیسٹر)

40۔ سچے، امین اور پاکباز

''محمد (ﷺ) سچے اور امین تھے پاکباز اور غمگسار تھے۔ نہایت متقی اور پرہیزگار تھے۔ آپؐ واقعی نبی ہیں اور دشمنوں کے ہر اتہام سے بری اور کوسوں دور ہیں۔ رعونت اور تکبر کا تو آپؐ

میں نام تک نہ تھا۔ آپؐ باوجود برگزیدہ نبی ہونے کے ہر وقت مغفرت کی دعا مانگتے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے اور ڈراتے رہتے۔'' (کاونٹ ہنری)

41۔ ضعیف ومحتاج کے لیے رحمت

''محمد (ﷺ) کی تاریخی زندگی کی تعریف ان معجزانہ الفاظ سے بہتر ہوسکتی ہے کہ آپؐ ہر ضعیف اور محتاج کے لیے سب سے بڑی رحمت تھے۔ یتیموں، مسافروں، ضعیفوں، فقیروں، بے کسوں اور مجبوروں کے لیے واقعی اور حقیقی رحمت اور نعمت تھے۔ عورت جو تمام عالم کے نزدیک ذلیل تھی، وہ آپؐ کی رہین منّت ہے۔'' (پروفیسر لیک)

42۔ صائب الرائے اور بے مثال مفکر

''نبی آخر الزماں محمد (ﷺ) بلند ترین اخلاق کے حامل مفکر بے مثال اور بہت ہی صائب الرائے تھے۔ آپؐ کی گفتگو معجزانہ ہوا کرتی تھی۔ آپ ﷺ بہت بڑے بزرگ اور مقدس ترین نبی تھے۔'' (از لائف آف محمدؐ۔ مصنفہ مورخ آرونگ)

43۔ پوپ اور قیصر سے طاقت ور

''مذہب اور حکومت کے رہنما اور گورنر کی حیثیت سے پوپ اور قیصر کی دو شخصیتیں حضرت محمد (ﷺ) کے ایک وجود میں جمع تھیں۔ آپؐ پوپ تھے مگر پوپ کی ظاہر داریوں سے پاک، آپؐ قیصر تھے مگر قیصر کے جاہ وحشم سے بے نیاز۔ اگر دنیا میں کسی شخص کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ اس نے باقاعدہ فوج کے بغیر، محل شاہی کے بغیر اور لگان کی وصولی کے بغیر، صرف خدا کے نام پر دنیا میں امن وانتظام قائم رکھا تو وہ صرف حضرت محمد (ﷺ) ہیں۔ آپؐ کو اس ساز وسامان کے بغیر ہی سب کی سب طاقتیں حاصل تھیں۔'' (مشہور عیسائی مؤرخ ریورنڈ باسورتھ سمتھ)

44۔ انسانی ترقی کے رہنما

''میں پیغمبر اسلامؐ کی عزت و احترام میں نہایت ہی مسرت سے اپنے مسلمان احباب کے ساتھ شریک ہوتا ہوں۔ آپؐ نے انسانی ترقی کے لیے جس قدر کوششیں فرمائیں، وہ بالکل غیر فانی ہیں۔ ان کوششوں کے باعث دنیا ہمیشہ تک آپؐ کی احسان مند رہے گی۔''

(پروفیسر روچی رام، ممبر پنجاب کونسل)

45۔ متحدہ اقوام کے سردار

''پیغمبر اسلام محمد (ﷺ) کو اپنے مشن کے رائج کرنے میں جو کامیابی ہوئی، وہ سچ مچ حیرت انگیز ہے۔ ناشائستہ، خونخوار، کینہ ور، جنگجو عربوں کے قبیلوں کو جو بت پرستی اور توہم پرستی میں غرقاب تھے، آپس کے جھگڑوں اور جوابازی میں محو تھے۔ حضرت محمد (ﷺ) کی تعلیم کے پاک اثر نے آناً فاناً خدا پرست بنا دیا۔ تمام قبیلے ایک سردار کے جھنڈے کے نیچے آ گئے اور ایک متحدہ قوم بن گئے۔'' (لالہ رام چند ایڈووکیٹ لاہوری)

46۔ دنیا کے بہت بڑے محسن

''محمد (ﷺ) کے سوانح حیات سب کے لیے نمونہ ہیں اور ان کی تعلیمات سے ہر دھرم اور قوم کے لوگ خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ محمدؐ صاحب نے اخوت اور مساوات کی بے بہا تعلیم دے کر دنیا پر ایک بہت زبردست احسان کیا ہے۔ انہوں نے دوسرے دھرم کے لوگوں کے ساتھ رواداری برتنے کی تعلیم بھی دی ہے اور اسلام کی اشاعت کا اصلی سبب اس کی یہی پر اوصاف تعلیم اور اس کے بانیؐ کی پاک صاف اور قابل تقلید زندگی ہے''۔ (سوامی بھوانی دیال سنیاسی)

47۔ سچی زبان کی تاثیر والے

''محمد (ﷺ) کی سچائی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ آپؐ کی زبان میں اثر تھا کہ آپ کے صرف ایک زبانی حکم نے عرب میں شراب خوری تو کیا اور کتنے ہی افعالِ بد ایک قلیل مدت میں بالکل ہی نیست و نابود ہو گئے۔ مجھے یہ کہنے میں کچھ باک نہیں کہ بے شک محمد (ﷺ) ایک سچے پیغمبر تھے۔ سچے محمد (ﷺ) کے متعلق اس سے پہلے میرے دل میں جس قدر بدگمانیاں تھیں میں روح محمد (ﷺ) سے ان کی معافی چاہتا ہوں۔ اور بلا مبالغہ اور علی الاعلان کہتا ہوں کہ آج دنیا میں ایک شخص کی بھی یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ حضرت محمد (ﷺ) کے کیرکٹر پر ایک سیاہ دھبہ بھی لگا سکے۔'' (ڈپٹی انسپکٹر مدارس ضلع کورگ۔ مسٹر بی۔ ایس، کشالپہ بی۔ اے۔ ڈی۔ ای، لندن)

باب 4

☆ کامل انقلاب کی واحد مثال

انقلابِ محمدی ﷺ 123

☆ اجتماعی زندگی کا حسن 136

عکس سیرت 137

☆ خلافت راشدہ

طرزِ حکمرانی ___ اندازِ جہاں بانی اور شانِ جہانگیری

کی دلکش و روح پرور مثال 139

کامل انقلاب کی واحد مثال

انقلابِ محمدی ﷺ

(ڈاکٹر اسرار احمد ۔ منہج انقلابِ نبوی ﷺ)

انقلاب کے یہ سات مراحل (1+3+3) میں نے سیرتِ محمدی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) سے اخذ کیے ہیں، اس کے سوا میرے نزدیک ان کا کوئی اور ماخذ نہیں ہے کیونکہ کامل اور ہمہ گیر انقلاب کا منہاج اور نقشہ صرف سیرت محمدی ﷺ سے ہی مل سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تاریخ انسانی میں کامل انقلاب (TOTAL REVOLUTION) صرف اور صرف حضرت محمد عربی ﷺ نے برپا کیا ہے۔ باقی دنیا کے جو انقلابات مشہور ہیں وہ جزوی انقلاب تھے۔ فرانس کے انقلاب سے صرف سیاسی ڈھانچہ بدلا، معاشی نہیں بدلا، معاشرتی نہیں بدلا، روحانی و اخلاقی نہیں بدلا، عقائد نہیں بدلے۔ روسی انقلاب سے صرف معاشی ڈھانچہ بدلا، سیاسی ڈھانچہ میں جزوی تبدیلی یہ آئی کہ صرف ایک پارٹی کے نمائندوں پر مشتمل حکومت کا نظام قائم ہو گیا ــــ البتہ انسانی زندگی کے چھ کے چھ گوشوں یعنی عقائد، عبادات اور سماجی رسوم کے علاوہ معاشرتی نظام، معاشی و اقتصادی نظام اور سیاسی نظام کو تاریخ انسانی میں صرف ایک مرتبہ بدلا گیا ہے اور یہ بدلا ہے حضرت محمد ﷺ نے۔ پس جسے کامل، ہمہ گیر، گھمبیر اور TOTAL REVOLUTION کہا جائے تو وہ ہے ہی صرف ایک، اور وہ ہے رسول آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کا برپا کیا ہوا انقلاب ــــ حضور ﷺ کے لائے ہوئے انقلاب میں ڈھونڈے سے بھی کوئی چیز ایسی نہیں ملے گی جو یکسر تبدیل ہو کر نہ رہ گئی ہو۔ ”مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ“ کی جدوجہد، سعی و کوشش، محنت و مشقت اور ایثار و قربانی کے نتیجہ میں لکھوکھا مربع میل زمین کے ایک ملک کے رہنے والوں کی زندگیوں میں ایک ایسا

انقلابِ عظیم برپا ہوگیا کہ ان کی سوچ بدل گئی، ان کا فکر بدل گیا، ان کے عقائد بدل گئے، ان کی اقدار بدل گئیں، ان کے عزائم بدل گئے، ان کے مقاصد بدل گئے، ان کی آرزوئیں بدل گئیں، ان کی تمنائیں بدل گئیں، ان کے دن بدل گئے، ان کی راتیں بدل گئیں، ان کی صحبتیں بدل گئیں، ان کی شامیں بدل گئیں، ان کی زمین بدل گئی، ان کا آسمان بدل گیا۔ یہاں تک کہ اگر پہلے انہیں زندگی عزیز تھی تو اب موت عزیز تر ہوگئی۔ جو رہزن تھے وہ رہبر بن گئے۔ جو امی محض تھے وہ متعدد علوم وفنون کے موجد بن گئے۔ جو بے شمار ذمائم اخلاق میں مبتلا تھے وہ مکارمِ اخلاق کے معلم و داعی بن گئے۔ جو زانی اور نفس پرست تھے، وہ عصمت وعفت کے محافظ بن گئے۔ جو بے قید حصولِ معاش کے عادی اور اسراف وتبذیر کے خوگر تھے وہ مال و دولت کے امین بن گئے ـــــ یہ تھی گھمبیرتا، ہمہ گیری اور برکت اس انقلاب کی جو محمدِ عربی ﷺ نے برپا فرمایا۔

پھر صرف یہی بات قابل ذکر نہیں ہے کہ کسی ایک انسانی زندگی میں انقلابی عمل کی تکمیل دنیا میں صرف ایک بار ہی ہوئی ہے بلکہ سب سے زیادہ اہم اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ انقلابی عمل کے یہ تمام کے تمام سات مراحل آپ کو یک فردِ واحد کی زندگی میں نظر آجائیں، یہ ممکن ہی نہیں۔ اس کی کوئی نظیر ہی نہیں سوائے خاتم النّبیین سیّد المرسلین جناب محمد ﷺ کے۔ ایک فردِ واحد 610 عیسوی میں ایک انقلابی دعوت لے کر کھڑا ہوتا ہے اور 630ء میں کل بیس برس میں عرب میں انقلاب تکمیل پاجاتا ہے۔ باقی دو سال اس انقلاب کی توسیع کے عمل میں گزرے ہیں۔ 06ھ میں صلح حدیبیہ کے بعد مختلف سربراہانِ مملکت کو دعوتی خطوط ارسال کیے گئے تھے اور سفارتیں بھیجی گئی تھیں۔ 08ھ میں مکہ فتح ہوگیا۔ اس کے بعد کے دو سال کے عرصہ میں جنگ موتہ ہوئی جس میں سلطنت روما جیسی وقت کی سپر طاقت کے ساتھ مسلح تصادم ہوا۔ اس کے بعد 09ھ میں خود نبی اکرم ﷺ کی قیادت میں سفرِ تبوک ہوا۔ اس موقع پر تیس ہزار جان نثار حضور ﷺ کے جلو میں تھے ـــــ پھر یہ کہ حضور ﷺ کی وفات سے چند دن قبل حضرت اسامہ بن زید کی سربراہی میں شام کی طرف ایک مہم کے لیے لشکر ترتیب فرمایا۔ وہ لشکر ابھی روانہ نہیں ہوا تھا کہ مرض نے شدت اختیار کی اور ربیع الاوّل 11ھ میں نبی اکرم ﷺ نے "اَلرَّفِیْقُ الْاَعْلٰی" کی طرف مراجعت فرمائی۔

اندازہ کیجیے کہ اکیس بائیس برس کے لگ بھگ مختصر ترین عرصہ میں نبی اکرم ﷺ نے

ایک ہمہ گیر اور ہمہ جہتی انقلاب کی از ابتداء تا انتہا بنفس نفیس تکمیل فرما دی۔ جس کی دنیا میں کوئی نظیر نہ پہلے موجود تھی نہ تا قیامِ قیامت ملے گی۔ دنیا کے دوسرے دو انقلابات مشہور ہیں یعنی انقلابِ فرانس اور انقلابِ روس۔ ایک طرف تو یہ انقلابات جزوی تھے اور دوسری طرف قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان انقلابات کا فکر دینے والے کوئی اور تھے اور انقلاب برپا کرنے والے کوئی اور ـــــ پھر انقلابی فکر پیش ہونے اور اس کے نتیجہ میں عملاً انقلاب برپا ہونے میں اچھا خاصا زمانی فصل ہے۔ انقلابِ فرانس اس فکر کا نتیجہ میں رونما ہوا جو وولٹیئر اور روسو جیسے بے شمار مصنفوں کی کتابوں کے ذریعے کافی عرصہ تک پھیلتا رہا ـــــ اسی طرح انقلابِ روس کی اساس کارل مارکس کی کتاب ''داس کیپیٹل'' پر قائم ہوئی لیکن خود مارکس کی زندگی میں ایک گاؤں میں بھی انقلاب کے عملاً برپا ہونے کا امکان تک پیدا نہ ہو سکا۔ مارکس جرمنی کا رہنے والا تھا لیکن انقلاب روس میں آیا اور اس کی موت کے قریباً پچاس سال بعد لینن جیسی فعال شخصیت کے ہاتھوں آیا۔ اور وہ بھی اس لیے کہ روس کے داخلی معاملات اس حد تک بگڑ گئے تھے کہ وہ بالشویک انقلاب کے لیے سازگار ہو گئے تھے۔ مگر اکیس بائیس برس کے لگ بھگ ایک مختصر سے عرصہ میں ایک عالمگیر انقلاب کی تکمیل جس میں انقلاب کے جملہ مراحل کی تکمیل دنیا کی تاریخ میں صرف ایک بار ہوئی وہ حضرت محمد ﷺ کے دستِ مبارک سے ہوئی ہے۔ بعد میں رونما ہونے والے انقلابات میں اصل راہنمائی سیرتِ مطہرہ سے ہی لی گئی ہے۔ بقول علامہ اقبال

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آنکہ از خاکش بروید آرزو!
یا ز نورِ مصطفیٰؐ اُو را بہاست!
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است

یعنی نبی اکرم ﷺ کے سعید و مبارک دور کے بعد دنیا نے جو کچھ سیکھا ہے وہ حضور ﷺ سے ہی سیکھا ہے یا پھر انسان ٹھوکریں کھا کھا کر چار و ناچار اسی منزل کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے کہ جس منزل پر پہنچایا تھا محمد رسول اللہ ﷺ نے ـــــ لہٰذا یاد رہے کہ انقلابی عمل کے مراحل کے استنباط کے لیے میرا ماخذ صرف اور صرف سیرت النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام ہے۔

انقلابِ نبوی ﷺ کا اساسی نظریہ : توحید

اب ہم سیرت النبی ﷺ کا جائزہ لیتے ہیں کہ وہاں یہ چھ قدم کس ترتیب سے اُٹھائے گئے۔ پہلا قدم ہوتا ہے ایک انقلابی نظریہ، فکر اور فلسفہ سے متعلق۔ انقلابِ محمدی ﷺ اور دوسرے انقلابات کے مابین اس اعتبار سے فرق کیا ہے؟ یہ کہ دنیا کے دونوں مشہور و معروف انقلابات کے لے نظریہ، فکر اور فلسفہ انسانی ذہنوں کی پیداوار تھا جبکہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو وہ نظریہ، فکر اور فلسفہ وحی کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا۔ پہلا عظیم ترین فرق تو یہ ہے کہ یہ نظریہ ہے ''توحید''۔ کامل ترین اور خالص ترین توحید، جس کی بنیاد ہے قرآن حکیم۔ اس قرآن کے ذریعہ سے یہ انقلابی نظریہ لوگوں کے سامنے آنا شروع ہوا۔ اس حقیقت کو نہایت سادہ اور سلیس الفاظ میں مولانا حالی نے بیان کیا ہے ؎

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اِک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا
وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی

اور نہایت پرشکوہ الفاظ میں بیان کیا علامہ اقبال نے ؎

در شبستانِ حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید

انقلابی نظریۂ توحید کی بنیاد قرآن ہے ـــــ یعنی دعوت قرآن کی، تبلیغ قرآن کی، انذار قرآن سے، تبشیر قرآن سے، تذکیر قرآن سے حتیٰ کہ تزکیہ یعنی تربیت بھی قرآن سے ـــــ حاصل کلام یہ کہ نبی اکرم ﷺ کی دعوت کا مرکز و محور اور منبع و سرچشمہ ہے قرآنِ مجید، فرقانِ حمید!!

دوسری بات بہت ایک اہم نکتہ ہے جسے لوگ بالعموم سمجھ نہیں پاتے۔ وہ یہ کہ حضور ﷺ کی دعوت کو جہاں تک ''نظریہ'' کہا جائے گا تو اس انقلابی نظریہ کے تین حصے شمار کیے جائیں گے:
1۔ توحید 2۔ رسالت 3۔ معاد یا آخرت۔ ان میں سے جہاں تک ''نظام'' کا تعلق ہے وہ درحقیقت نظریۂ توحید پر ایمان لانے سے ہے۔ آخرت پر ایمان انسان کی سیرت و کردار کی تربیت

اور صحیح تعمیر کی بنیاد بنتا ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ اصل میں اسی تربیتی مراحل کی چیزیں ہیں۔ اشخاص کی سیرت و کردار کو اس خاص سانچہ میں ڈھالنا کہ جس ڈھانچے میں ڈھلے ہوئے کارکنوں کے ذریعہ سے اسلامی انقلاب آسکے، اس تربیت کا پروگرام ان چیزوں پر مشتمل ہے۔ دل میں چھپے ہوئے اَمراض اور روگوں کا مداوا اور علاج بھی قرآن اور اس تربیتی پروگرام ہی سے ہوتا ہے، جس کے لیے دینی اصطلاح تزکیہ ہے۔ الغرض ایمان بالآخرت انسان کے جذبۂ عمل کو متحرک (MOTIVATE) کرنے کا نہایت مؤثر عامل ہے ـــــ جبکہ رسالت پر ایمان کا تعلق قانون سے ہے۔ حضور ﷺ کو دل و جان سے رسول تسلیم کرنے اور آپ ﷺ کی دی ہوئی تمام خبروں کی تصدیق کا نام ہی دراصل ایمان ہے۔ اس کے بغیر ہم نہ توحید کو صحیح معنوں میں جان سکتے ہیں، نہ آخرت کو مان سکتے ہیں، اور نہ ہی اعمالِ صالحہ اور افعالِ سیّئہ کو صحیح طور پر پہچان سکتے ہیں۔ یہی مطلب و مفہوم اور مقصود ہے نبی اکرم ﷺ کے اس ارشاد مبارک کا:

لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى يَكُونَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَّا جِئْتُ بِهِ

''تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہو ہی سکتا جب تک اس کی خواہشِ نفس اس ہدایت کے تابع نہ ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں۔''

نظریۂ توحید کے متضمّنات

جناب محمد رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو انقلابی نظریہ یا دعوت لے کر تشریف لائے وہ درحقیقت توحید ہے۔ لہٰذا اس انقلابی فکر اور فلسفہ کے متضمنات (COROLLARIES) اس کے مضمرات، اس کے مقتضیات، اس کے بدیہی نتائج و عواقب کو سمجھنا ضروری ہے جس کے بغیر توحیدِ کامل اور توحیدِ خالص کے انقلابی پہلو کو صحیح ادراک و شعور مشکل ہے۔ اس پہلو سے تین چیزیں نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔

1) انسانی حاکمیّت کی بجائے خلافت

توحید کے متضمنات میں سب سے پہلی چیز حاکمیت انسانی کی کلی نفی ہے۔ یہ سب سے بڑا، سب سے عظیم انقلابی نظریہ ہے جس تک انسان کا اپنا ذہن رسائی کر ہی نہیں سکتا۔ اس کا علم

صرف وحی الٰہی کے ذریعے ہی سے حاصل ہونا ممکن ہے۔اس بات کو پہلے بھی مشرکین نے مانا اور آج بھی تسلیم کرتے ہیں کہ کائنات کی تکوینی حاکمیت صرف اللہ کی ہے۔لیکن توحید کا تقاضا یہ ہے کہ دنیا میں تشریعی حاکمیت، مطلقہ بھی صرف اللہ کے لیے ہو۔اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ اوراَلَا لَہُ الۡخَلۡقُ وَ الۡاَمۡرُ اورتَبَارَکَ الَّذِی بِیَدِہِ الۡمُلۡکُ اورلَہُ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ـــ گویا

سروری زیبا فقط اُس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری

اس نظریہ کو نہایت شدومد سے محکم دلائل و براہین کے ساتھ قرآن مجید ہی نے پیش کیا ہے۔ یہ موضوع اگرچہ تفصیل کا متقاضی ہے،لیکن یہاں چند اشارات ہی پر اکتفا کریں گے۔غور کیجیے کہ فرانس کے انقلاب نے کیا کیا تھا۔صرف اک ہی چیز میں تبدیلی کی تھی کہ حاکمیت کسی خاندان یا فرد کی نہیں ہے بلکہ عوام کی ہے ـــ گویا حاکمیت ایک خاندان یا فرد کے ہاتھ سے لے کر جمہور کو دے دی گئی۔صرف یہی تبدیلی رونما ہوئی اور تو کوئی نہیں۔اس انقلاب کا لب لباب یہی ہے کہ ''حاکمیت (SOVEREIGNTY) کسی مخصوص فرد یا کسی شاہی خاندان کے ساتھ متعلق نہیں ہے، بلکہ فی الحقیقت حاکمیت کا تعلق عوام کے ساتھ ہے۔''

یہی نظریہ ہے جمہوریت کا۔ سارا جھگڑا اور سارا فساد اسی کا ہے کہ حاکمیت کس کی؟ اختیار کس کا؟ قانون بنانے اور دینے کا مجاز کون؟ یہ ہے اصل میں سارے بس کا گانٹھ۔اور یہ انقلاب کہ حاکمیت کو افراد اور خاندانوں سے نکال کر عوام میں لے آنا تو اس کے لیے کتنا خون دینا پڑا ہے۔فرانس کا انقلاب بڑا ہی خونیں انقلاب تھا۔شیر کے منہ سے نوالہ نکالنا کوئی آسان کام ہے؟ جن لوگوں نے یورپ کی تاریخ پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ وہاں DIVINE RIGHTS O F THE KING کا سکہ جاری تھا۔یعنی بادشاہوں کو تو خدائی اختیار حاصل ہیں انہیں کون چیلنج کرسکتا ہے؟

اب آپ سوچیے کہ انسانی سطح پر حاکمیت کی تبدیلی یعنی ایک فرد یا ایک خاندان کی حاکمیت کے بجائے عوام کی حاکمیت لانے کے لیے کتنے پاپڑ بیلنے پڑے،تو وہ کتنا بڑا انقلاب ہے جو برپا فرمایا جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے۔ جسے یوں تعبیر کیا علامہ اقبال نے کہ

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں!

یہ عظیم ترین انقلابی نظریہ ہے: اللہ کی حاکمیتِ مطلقہ۔ اللہ کے سوا کوئی حاکم مطلق نہیں ہے۔ نہ کوئی فرد، نہ کوئی خاندان، نہ کوئی قوم، نہ پوری نوعِ انسانی۔ انسان کے لیے حاکمیت کی نفی مطلق ہے۔ انسان کے لیے تو خلافت ہے۔ اور وہ بھی عوامی خلافت۔ یعنی خلیفہ بھی آسمان سے مقرر نہیں ہوتا بلکہ عام میں سے منتخب ہوتا ہے۔ اہل سنت اور اہل تشیع کے تصورِ خلافت و امامت میں اساسی و بنیادی فرق اختلاف یہی ہے کہ اہل تشیع کے نزدیک امامت صرف ایک خاندان کا حق ہے اور ان کے نزدیک امام مامور من اللہ ہوتا ہے، لہٰذا مطاعِ مطلق بھی ہوتا ہے اور معصوم عن الخطاء بھی۔ ہمارا تصور و عقیدہ اس کے بالکل برعکس ہے ہمارے نزدیک مامور من اللہ ہونا اور معصومیت خاصۂ نبوت و رسالت ہیں۔ جنابِ محمد رسول اللہ ﷺ پر نبوت ختم ہوئی اور رسالت کی تکمیل ہوگئی۔ لہٰذا معصومیت بھی ہمیشہ ہمیش کے لیے ختم ہوگئی۔ کوئی خلیفہ یا امام مامور من اللہ نہیں۔ کوئی معصوم نہیں ہے اور نہ تا قیامِ قیامت ہوسکتا ہے۔ ہمارے عقیدہ کے مطابق مسلمانوں کے لیے خلافت ہے، خلافت عامہ ــــ یعنی عوام الناس اپنی رائے سے جس کو چاہیں خلیفہ چن لیں۔ گویا کہ وہ اپنے حق خلافت کو تفویض (DEDIGATE) کر رہے ہیں ایک شخص کو کہ وہ ان کا سربراہ ہے۔

خلافت راشدہ درحقیقت تتمہ اور ضمیمہ تھی دورِ نبوت کی ــــ وہ مشن جو حضور ﷺ کو دیا گیا تھا: ''هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ'' اس کی توسیع اور عالمی سطح پر اس کی تکمیل کے لیے دراصل یہ خلافت کا نظام قائم کیا گیا تھا کہ ایک ملک میں اللہ کے دین کو بنفس نفیس نبی اکرم ﷺ نے غالب اور قائم فرما دیا اور پھر پورے کرۂ ارض پر اسے غالب کرنے کا کام اُمت کے حوالے فرما دیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ مشن دے کر حضور ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے۔ لہٰذا یہ خلافت علی منہاج النبوۃ تھی اسی لیے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پہلے خلیفۂ راشد نے اپنے لیے ''خلیفۃ رسول اللہ'' کا لفظ اختیار کیا۔ لیکن آئندہ مستقل طور پر اسلامی خلافت کا سربراہ خلیفۃ المسلمین یا امیر المؤمنین کہلائے گا۔ یعنی اصل میں تو تمام مسلمان خلافت کے اہل اور حامل ہیں لیکن وہ جب اپنے رائے سے کسی کو خلافت کی ذمہ داری تفویض کریں گے تو وہ مسلمانوں

کا خلیفہ ہوگا۔ یہ ہے نظریۂ توحید کا سب سے پہلا انقلابی تصور جس کا تعلق سیاسی ڈھانچے سے ہے۔

2) ملکیت کی بجائے امانت

اسی نظریۂ توحید کا بدیہی نتیجہ جسے اس دور میں پوری طرح کھول کر بیان کرنے اور واضح کرنے کی ضرورت ہے۔ انسان کی ملکیت مطلقہ کی نفی کامل ہے۔ جیسے کوئی حاکمِ مطلق نہیں ویسے ہی کوئی مالک مطلق نہیں۔ حاکمِ حقیقی بھی اللہ ہے اور مالکِ حقیقی بھی اللہ ہے۔ قرآن مجید میں جس طور پر مختلف اسالیب سے اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ مطلقہ کا اثبات کیا گیا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ملکیت مطلقہ کی بھی مختلف اسالیب سے اثبات کیا گیا ہے۔ (لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ) اور (لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ) کے الفاظ اللہ کی اسی ملکیت مطلقہ کا اظہار کے لیے قرآن مجید میں متعدد بار آئے ہیں۔ یہاں ''لِلّٰہِ'' اور ''لَہٗ'' میں حرفِ جار لام کے متعلق تمام مفسرین کا اجماع ہے کہ یہ لام تملیک بھی ہے اور لام استحقاق بھی۔ پھر سورۂ آل عمران میں (وَ لِلّٰہِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْض) اور سورۃ المنافقون میں (وَلِلّٰہِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) فرما کر مسئلہ کو بالکل واضح کر دیا گیا کہ جس طرح حاکم حقیقی صرف اللہ ہے اسی طرح کائنات کی ہر شے کا مالک حقیقی بھی صرف اللہ ہے۔ شیخ سعدی نے اس مفہوم کو بڑے دل نشین اسلوب سے ادا کیا ہے ؎

ایں امانت چند روزہ نزدِ ما ست
درحقیقت مالکِ ہر شے خدا است

اسی مفہوم کو علامہ اقبال یوں ادا کرتے ہیں ؎

بندۂ مومن امیں ، حق مالک است
غیرِ حق ہر شے کہ بینی ہالک است

حاصل کلام یہ ہوا کہ جیسے حاکمیت کے باب میں حاکمیت کے بجائے خلافت ہے، ویسے ہی ملکیت کے ضمن میں ملکیت کے بجائے امانت ہے۔ جو کچھ انسان کے پاس ہے اس کے حصول پر قدغنیں ہوں گی۔ ناجائز طریقہ سے حاصل کرلے گا تو ضبط کرلیا جائے گا اور تأدیب کا سزاوار ٹھہرے گا۔ لیکن انسان جائز طریقہ سے جو کچھ حاصل کرے گا تو وہ اس کے پاس اللہ کی

امانت ہے۔اس میں تصرف بھی صرف جائز طریقہ سے کیا جاسکے گا، ناجائز طریقہ سے تصرف ہوگا تو تصرف کا اختیار بھی ساقط ہوجائے گا یہ بھی بہت بڑاانقلابی نظریہ ہے۔ایک وہ تصور ہے کہ ذاتی ملکیت کا حق بڑا مقدس ہے۔میری شے ہے، میں جس طرح چاہوں استعمال کروں، میرا اختیار مطلق ہے میں جو چاہوں کروں۔ملکیت کا مطلب تو یہی ہے کہ میری بکری ہے میں جب چاہوں ذبح کر دوں،تم کون ہو پوچھنے والے؟ میرا پیسہ ہے میں جس طرح چاہوں اسے INVEST کروں، میں نے شراب خانہ کھولا ہے، میں نے کسی کو مجبور نہیں کیا جو آکر پینا چاہے پیئے۔میں نے کسی پر جبر نہیں کیا، میں بھی آزاد ہوں وہ بھی آزاد ہے۔میں نے قمار خانہ،قحبہ خانہ، نائٹ کلب اور انہی قبیل کے کاموں میں اپنا سرمایہ لگایا ہے،کوئی ان میں دلچسپی لے یا نہ لے، میں کسی کو مجبور نہیں کرتا۔لیکن یہ تصور اسلام میں نہیں ہے۔اسلام میں امانت کا تصور ہے۔امانت کے مالک نے جس حد تک اور جن پابندیوں کے ساتھ تصرف کا حق دیا ہے اس حد تک تصرف کر سکتے ہو۔اس سے تجاوز کرو گے تو مجرم شمار ہو گے۔غور کیجیے کہ معاشی سطح پر یہ کتنا عظیم انقلاب ہے۔بقولِ علامہ اقبال

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
مُنعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس عقیدۂ توحید کا جو تیسرا انقلابی پہلو ہے اس کو بیان کرنے سے قبل چند اہم باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔اس توحید کا ایک اعتقادی پہلو ہے۔یعنی کسی اور کی عبادت اور پرستش نہ ہو سوائے اللہ کے: (لَا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ) کسی کو رکوع و سجدہ نہ کیا جائے سوائے اللہ کے۔کسی سے دعا نہ کی جائے سوائے اللہ کے (لَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا) اس کا کوئی ند، اس کی کوئی ضد، اس کی کوئی اولاد نہیں ہے۔اس کا کوئی کفو، اس کا کوئی ہمسر نہیں: (فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا) اور (قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ O اَللّٰهُ الصَّمَدُ O لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَد O وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ) اس کے سوا کوئی حاجت روا، دستگیر اور پشت پناہ نہیں ہے۔(اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِی وَكِيْلًا) نذر و نیاز، قربانی الغرض کوئی بھی تعبدی عمل اس کے سوا کسی اور کے لیے نہیں ہے: (اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ وَ مَحْيَایَ وَ مَمَاتِی لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِين) یہ تمام امور یقیناً عقیدۂ توحید کے مظاہر اور اس کے لوازم ہیں۔ان میں ذرا سی اونچ نیچ اور کمی بیشی ہوئی تو توحید ختم ہوئی اور شرک لازم ہو گیا۔پھر تو معاملہ وہ

ہو جائے گا جس کی طرف سورۂ یوسف کی اس آیت مبارکہ میں توجہ دلائی گئی ہے: (وَ مَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُھُمْ بِاللّٰہِ اِلَّا وَ ھُمْ مُّشْرِکُوْن)

الغرض توحید کا پوری انسانی زندگی پر محیط ہونا ایمان کا لازمی تقاضا ہے ـــــ توحید کی چھاپ تو پوری زندگی پر ہونی لابدمنہ ہے ـــــ لیکن اس وقت کی اور اس دور کی شدید ضرورت ہے کہ عقیدۂ توحید نے اجتماعی زندگی کے ان تین گوشوں یعنی معاشرتی، معاشی اور سیاسی گوشوں میں جو عظیم انقلاب برپا کیا ہے، اسے نہایت وسیع پیمانے پر محکم دلائل کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ اسی کے ذریعہ سے موجودہ باطل اور مادہ پرستانہ تمام نظریات اور نظام ہائے زندگی کا ابطال اور اسلام کی حقانیت کا احقاق ہو سکے گا۔

3) کامل معاشرتی مساوات

انسانی تاریخ کا یہ المیہ رہا ہے کہ جہاں ایک طبقہ خدائی اختیارات کا مدعی رہا ہے اور جہاں انسان ملکیت مطلقہ کی ضلالت میں مبتلا رہا ہے وہاں وہ اس گمراہی میں بھی ٹھوکریں کھاتا رہا ہے کہ انسانوں میں ذات پات اور اُونچ نیچ کی تقسیم ہے۔ جبکہ توحید کا تیسرا تقاضا یہ ہے کہ دنیا کے تمام انسان برابر ہیں۔ کوئی اُونچا نہیں، کوئی نیچا نہیں، کوئی اعلیٰ نہیں، کوئی ادنیٰ نہیں۔ یہ برہمن اور شودر کی تقسیم، یہ رنگ و نسل کی بنیاد پر افتخار انسان کے اپنے ذہن کے تراشے ہوئے فلسفے ہیں ـــــ یہ انسان کے تنگ ذہن اور قلب کے تراشیدہ اصنام ہیں۔ معاشرتی سطح پر توحید کا انقلابی تصور یہ ہے:

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّ خَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَ بَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّ نِسَآءً (01:04)

''اے نوعِ انسانی! تقویٰ اختیار کرو اپنے اس مالک اور پروردگار کا جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا، پھر اس (ایک جان) سے اس کا جوڑا بنایا اور پھر اس جوڑے سے (دُنیا میں) کثیر تعداد میں مرد و عورت کو پھیلا دیا۔''

یعنی پوری نوعِ انسانی ایک ہی جوڑے (آدم و حوّا) کی اولاد ہے ـــــ بدقسمتی سے توحید کے ماننے والوں میں بھی مرورِ زمانہ اور دوسروں کی دیکھا دیکھی اُونچ نیچ کی تقسیم آ گئی ہے۔ چنانچہ سیّد زادہ، وہ چاہے واقعی سیّد زادہ ہو یا بنا ہوا سیّد ہو، وہ چاہے زانی اور شرابی ہو، اس کے گھٹنے کو احترام کے

ساتھ ہاتھ لگایا جائے گا۔ یہی صورت حال اور یہی تقسیم وڈیروں، زمینداروں اوران کے مزارعین اور پیروں اوران کے مریدوں کے مابین دیکھنے میں آتی ہے۔ یہ سب کہاں سے آیا؟ ایک طرف نسلی امتیاز کی نفی اور دوسری طرف نسل پرستی کا یہ عالم!___ اگر کامل سماجی مساوات نہیں ہے تو وہ معاشرہ کسی درجہ میں اسلامی معاشرہ کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔

یوں تو سیّد بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو؟

یہ ساری تقسیمیں غلط ہی نہیں بلکہ موجب فساد بھی ہیں۔ کوئی اُونچا اور کوئی نیچا نہیں۔ اس لیے کہ سب کا خالق ایک اللہ ہے اور سب ایک انسانی جوڑے آدم اور حوّا کی اولاد ہیں۔ تو کون اُونچا اور کون نیچا! کون اعلیٰ اور کون ادنیٰ! نبی اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع میں اعلانِ عام فرمادیا:

یَا أَیُّهَا النَّاسُ، أَلَا اِنَّ رَبَّکُمْ وَاحِدٌ، وَاِنَّ أَبَاکُمْ وَاحِدٌ، أَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلَی عَجَمِیٍّ ، وَلَا لِعَجَمِیٍّ عَلَی عَرَبِیٍّ، وَلَا لِأَحْمَرَ عَلَی أَسْوَدَ، وَلَا لِأَسْوَدَ عَلَی أَحْمَرَ، اِلَّا بِالتَّقْوَی (مسند احمد)

''لوگو! آگاہ رہو کہ تمہارا رب ایک ہے تمہارا باپ بھی ایک ہے۔ جان لو کہ نہ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت حاصل ہے اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر۔ نہ کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت حاصل ہے اور نہ ہی کسی کالے کو کسی گورے پر۔ بنائے فضیلت صرف تقویٰ ہے۔''

فضیلت اگر کوئی ہے تو وہ خدا ترسی اور اعلیٰ سیرت و کردار کی بنا پر ہے اور وہ معاملہ آخرت میں ہوگا۔ تمام انسان اس دنیا میں کامل سماجی مساوات رکھتے ہیں۔

غور کیجیے کہ اس سماجی و معاشرتی مساوات کا تعلق بھی توحید ہی سے ہے۔ چونکہ تمام انسانوں کا پیدا کرنے والا اللہ ہے لہٰذا سب برابر ہوگئے۔ کوئی چھوٹا خدا کسی ایک کا پیدا کرنے والا ہوتا اور کوئی بڑا خدا کسی دوسرے کا پیدا کرنے والا ہوتا تو اُونچ نیچ ہوجاتی۔ یا جیسے ہندوؤں میں اونچ نیچ کا یہ تصور ہے کہ برہمن تو ایشور کے سر سے پیدا ہوا ہے اور شودر اُس کے پاؤں سے پیدا ہوا ہے۔ انھوں نے ایک ایشور ہی میں یہ تقسیم کردی۔ توحید یہ ہے کہ ایک ہی اللہ سب کا پیدا کرنے

والا ہے اور انسان ایک ہی انسانی جوڑے کی اولاد ہیں:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ (13:49)

''لوگو! ہم نے تم سب کو ایک ہی مرد و عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہارے (جداجدا) خاندان، قبیلے (اور قومیں) بنائیں تو باہم شناخت اور تعارف کے لیے (نہ فخر و تکبر کے لیے) بے شک تم میں سب سے زیادہ عزت دار تو اللہ کے نزدیک وہی ہے جو سب سے زیادہ خداترس اور پرہیزگار ہے۔ بے شک اللہ (سب کچھ) جاننے والا اور باخبر ہے۔''

الغرض اسلام کا انقلابی نظریہ ہے توحید ـــــ اس کی دعوت پر مشتمل ہے قرآن مجید۔ لہٰذا دعوت، تبلیغ، تذکیر، انذار اور تربیت و تزکیہ، یہ سب کام ہوں گے بذریعہ قرآن ـــــ ان تمام کاموں کے لیے ''انذارِ آخرت'' نہایت اہم ہے۔ لیکن یہ انذارِ آخرت دراصل انسان کی انفرادی اعلیٰ سیرت کی تعمیر کے لیے بنیادی پتھر ہے، جس پر ایک بندۂ مومن کا کردار اور سیرت پروان چڑھے گی۔ آخرت پر یقین، محاسبہ پر یقین، جزا و سزا پر یقین کے بغیر اس سیرت کی تعمیر محال ہے جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے ـــــ اس تعمیر سیرت کے پروگرام کی تقویت کے لیے ذرائع کے طور پر نماز ہے، روزہ ہے، حج اور زکوٰۃ ہے، دوام ذکر الٰہی ہے۔ یہ تمام چیزیں درحقیقت انسان کی انفرادی سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے ہیں ـــــ البتہ انقلابی نظریۂ توحید کی یہ تین COROLLARIES یعنی تین لوازم و نتائج ہیں جو اوپر بیان ہوئے۔

پس اسلامی انقلاب کے لیے اصل میں ان چیزوں کو EMPHASIZE کرنا ہوگا۔ ان کی اہمیت کو واضح، نمایاں اور اُجاگر کرنا ہوگا۔ اگر ان کو نظرانداز کر کے زور ہو جائے محض نماز اور روزے وغیرہ پر تو درحقیقت انقلابی عمل کا آغاز نہیں ہوگا۔ کچھ مذہبی اور اخلاقی اصلاح کا کام ہو جائے گا، کچھ لوگ اچھے مسلمان بن جائیں گے، اور ایسے دوسرے کچھ اچھے کام ہو جائیں گے، اس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن انقلابی عمل کا آغاز ہی نہیں ہو سکے گا۔

گویا کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کے لیے طرزِ حکمرانی کا جو نمونہ انسانیت کو ملا وہ درویش بادشاہیت کا تھا جس میں حکمران اور حکمران طبقہ کے کوئی ذاتی مفادات نہ تھے۔ صرف خدمت خلق

کا جذبہ تھا اور ذاتی اغراض کا دور دور تک نام ونشان نہیں تھا جس کا عملی مظہر یہ تھا کہ عوام کی خدمت کا منطقی نتیجہ بھی یہ سامنے آیا کہ حکمران طبقے کا طرزِ بود و باش بھی عوام کے طرز بود و باش کی طرح سادہ اور تکلّفات سے پاک تھا۔ ایک طرف باشاہت کہ لوگوں کے درمیان خصومات اور جھگڑوں کے فیصلے ہو رہے ہیں۔ اربوں روپوں کے عوامی مفادات کے فیصلے ہو رہے ہیں لوگوں سے ناجائز دولت لے کر خزانے میں جمع کرائی جا رہی ہے ساری محاصل ہزاروں اروبوں روپے ہیں مگر ذاتیات یا ذاتی منفعت کا کوئی احساس نہیں اپنے اور اپنی اولاد کے لیے صرف وہی کچھ ہے جو عوام میں سے ایک عام مزدور یا اوسط درجے کا مستری (SKILLED LABOURE) وصول کرتا ہے یا کما رہا ہے۔

وراثتِ محمدی ﷺ

رسول اللہ ﷺ نے جب اس دنیا سے پردہ فرمایا تو اس وقت پورا جزیرۃ العرب آپ کے زیرنگیں تھا، دنیا کے سلاطین واُمراء آپ سے ڈرتے تھے، آپ کے اصحاب کرام رضی اللہ عنہم آپ پر اپنی جان و اولاد اور مال و متاع سب نثار کرنے پر تیار رہتے تھے، اس سب کے باوجود آپ دنیا سے اس حال میں تشریف لے گئے کہ آپ نے ایک دینار یا درہم، ایک غلام یا لونڈی اور کوئی چیز بھی اپنے پیچھے نہیں چھوڑی، صرف ایک سفید خچر تھا، آپؐ کے ہتھیار (نوتلواریں، زرہ وغیرہ) تھے اور ایک قطعۂ زمین، جس کو آپ نے صدقہ کر دیا تھا۔

(نبیٔ رحمت ﷺ)

اجتماعی زندگی کا حُسن

اس ضمن میں کردار کی پاکیزگی کے نمونے انسان کی بے غرض اور حرص و ہوا سے پاک طرزِ زندگی کو ظاہر کرتے تھے۔ اجتماعی زندگی میں یہ کارنامے کرنے والے حضرات کا ذاتی طرزِ بود و باش اور رہن سہن انتہائی سادہ تھا اور اس عالمی حقیقت کا مظہر تھا کہ سادگی میں اپنا ایک فطری حسن ہے، میک اپ (MAKE-UP) اور مصنوعی 'رنگ و روغن' سے سجاوٹ کا حسن عارضی ہی نہیں ہوتا بلکہ جذبات اور خلوص کی دولت سے بھی تہی دامن ہوتا ہے۔

حکمرانوں اور مؤثر و مقتدر طبقات کا سادہ طرزِ زندگی کا صاف مطلب ہے کہ عوامی وسائل عیاشیوں اور حکومتی کارندوں کے گھروں اور تقریبات کے پروٹوکول میں ہی نہیں انڈیلے جا رہے بلکہ وہ حقیقی عوامی ضروریات اور خدمت خلق و عوامی بہبود (PUBLIC WELFARE) پر خرچ کیے جا رہے ہیں۔ لہٰذا عوام میں ایک اطمینان کی لہر پیدا ہو جاتی ہے اور معاشرے میں بالعموم سادگی، شرافت، شرم و حیا، اعلیٰ اخلاقی اقدار، احترام باہمی اور اطمینان کی فضا پرورش پاتی ہے کہ اگر عوام سادہ زندگی گزار رہے ہیں اور وسائل سے تہی دست ہیں تو کوئی بات نہیں کہ حکمران بھی تو اسی سطح پر زندگی گزار رہے ہیں، حکمرانوں کے بچے بھی انہیں سکولوں میں پڑھ رہے ہیں انہی ہسپتالوں میں علاج کرا رہے ہیں اور یہ اطمینان اور باہمی اعتماد ـــــ لوٹ کھسوٹ، جھوٹ، فریب، بددیانتی اور بے حیائی کے ماحول میں اربوں روپے خرچ کر کے بھی خریدا نہیں جا سکتا۔

عکس سیرت

مسٹر کونسٹن ویرژیل

جب انصار، منافقین اور یہودیوں کے نام ارسال کردہ مراسلات سے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوئے تو قبیلہ قریش نے پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف معاشی حربہ استعمال کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

قبیلہ قریش کے سبھی ارکان سوداگر تھے اور اقتصادی محاذ آرائی کے لیے سوداگروں کا مؤثر ہتھیار اقتصادی بائیکاٹ یا معاشی ناکہ بندی ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا قبیلہ قریش نے جزیرۃ العرب کے شمال میں واقع تجارتی راستوں کو اپنی گرفت میں لے لیا اور مدینہ کو کچھ اس طرح اقتصادی محاصرے میں جکڑ دیا کہ ہر قسم کی اشیائے ضرورت مدینہ پہنچنا بند ہوگئیں۔

اگر یہ واقعہ مکہ کے بارے میں رونما ہوتا تو وہاں کے سارے باشندے بھوک کی شدت سے ہلاک ہوجاتے کیونکہ مکہ میں نہ تو زراعت ہوتی تھے اور نہ ہی باغات پائے جاتے تھے لیکن مدینہ کے مضافات میں کھیت اور باغات موجود تھے جہاں سے اشیائے اکل مدینہ پہنچتی رہتی تھیں۔ اس کے باوجود مدینہ کے شہری اشیائے خوردونوش کی قلّت کا شکار ہوگئے اور مدینہ میں اشیائے ضرورت کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔

حضرت محمد ﷺ مسجد مدینہ کے قریب اپنے گھر میں جو درحقیقت مختصر سی کوٹھڑی تھی، رہائش پذیر تھے اور انہیں مدینہ کی معاشی ناکہ بندی پر بہت افسوس تھا۔ اس کے علاوہ انہیں یہ بھی احساس تھا کہ قریش نے صرف ان کی دشمنی میں ایک شہر کے باشندوں کو بھوکا رہنے کی سزا دے رکھی ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ مدینہ میں انتہائی سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کا گھر کھجور کے

درخت کی لکڑی اور اس کے پتوں سے بنا ہوا تھا اور اس لیے کہ کوئی رہ گزر گھر کے اندر نہ جھانکے اور اہل خانہ کی بے پردگی نہ ہو تو کھجوروں کے تنوں پر کھال چڑھا دی گئی تھی۔ پیغمبر اسلام ﷺ اپنے سادہ گھر میں بھیڑ کی کھال بچھا کر زمین پر سوتے تھے اور ان کی خوراک کبھی خرما اور کبھی گندم کی روٹی پر مشتمل ہوتی تھی لیکن انھوں نے کبھی بھی خرما اور نان یکجا تناول نہیں کیے۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی زوجہ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ جب مدینہ اقتصادی ناکہ بندی سے دوچار تھا اور کھانے پینے کی چیزیں بھاری قیمت پر فروخت ہو رہی تھیں تو ان دنوں ہمارے گھر میں کھانا پکانے کی غرض سے آگ نہیں جلتی تھی اور وہ ایسا زمانہ تھا کہ ہم کبھی بھی آگے پیچھے (متواتر) دو دن روٹی نہیں کھائی۔

پیغمبر اسلام ﷺ اگرچہ شادی شدہ تھے لیکن گھریلو کام انجام دینے میں عار نہیں محسوس کرتے تھے۔ وہ اپنے ہاتھوں سے جھاڑو دیتے اور جس دن ان کے ہاں کھانا پکایا جاتا تو وہ اپنے ہاتھوں سے آگ بھی جلاتے تھے۔ آپ کے گھر میں پکنے والی غذا ایک قسم کی حلیم ہوتی تھی اور چونکہ پیغمبر ﷺ کی زوجات گوشت کھانے کی شوقین تھیں تو کبھی کبھار ان کے ہاں گوشت بھی پکا لیا جاتا تھا۔

پیغمبر اسلام ﷺ اپنے کپڑے خود سیتے، اپنی نعلین کی مرمت بھی خود ہی کرتے تھے۔ چونکہ وہ بہت صفائی پسند تھے لہٰذا اپنے کپڑے خود دھوتے اور دن میں کئی مرتبہ مسواک کے ذریعے دانتوں کی صفائی بھی کرتے تھے۔ انہی کا یہ قول ہے ''صفائی اور پاکیزگی آدھا ایمان ہے''۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی میں تجمل کی یگانہ علامت، کہ جس کا ذکر سارے مؤرّخین نے کیا ہے، یہ تھی کہ ان کے پاس ایک رومال تھا جس سے وہ کھجوریں وغیرہ تناول کرنے کے بعد ہاتھ پونچھتے تھے۔ اس کے علاوہ پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے دکھاوا یا تجمل کہا جا سکے۔

جب مدینہ کی معاشی ناکہ بندی نے شدت اختیار کر لی اور عام لوگ اشیائے ضرورت کی قلّت کے باعث پریشان رہنے لگے تو پیغمبر اسلام ﷺ کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ مذہبی رہنما کے علاوہ ایک سیاسی پیشوا کے فرائض بھی سنبھال لیں۔

خلافت راشدہ

طرزِ حکمرانی ___ اندازِ جہاں بانی اور شانِ جہانگیری کی دلکش و روح پرور مثال

خلافت راشدہ انسانیت کے اجتماعی ضمیر اور تاریخ کے صدیوں کے اس طویل محرومیوں کے سفر میں ایک آرزو سے بڑھ کر ایک حسین خواب کی حیثیت سے ہر انسان (مسلم و غیر مسلم) کے قلب پر نقش ہے۔ ہر محروم شخص کی کسمپرسی اور حیرانی میں کھلی آنکھیں درحقیقت اسی طرز حکمرانی اور اندازِ جہاں بانی کے ان نمونوں کی متلاشی اور ان انسانوں کو پہنچاننے کی کوشش میں سرگرداں ہوتی ہیں کہ انسانیت اسی میں ماری ماری روز و شب گزار رہی ہے۔

خلافت راشدہ کے حکمرانوں کے حقیقی واقعات آج بھی دنیا کے کسی کونے میں رہنے والے انسانوں کو سنا دو تو انسان لپک کر اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ غیر مسلم دنیا میں اسلام کی طرف رجحان اسی تلاش اور کوشش کا مظہر ہے۔

خلفائے راشدین، ان کے مشیر، سرکاری اہل کار، علاقائی گورنر، مرکزی و صوبائی مشیران گرامی اور گرم محاذوں پر دشمنوں سے برسرپیکار فوجوں میں سپہ سالار سے لے کر عام فوجی تک اسی کردار کا مجسم نمونہ تھے اور عوام کے 'محبوب' اور 'ڈھول سپاہی' اسی لیے تھے کہ ان میں ہمارے آقا حضرت محمد ﷺ کی سیرت کا کوئی نہ کوئی عکس موجود تھا۔

خلافت راشدہ اور مشہور بادشاہوں کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو کسی استاد کے بغیر ہر مسلک و مذہب کا انسان یہ نتیجہ نکال سکے گا ___ کہ حکمرانی ہے تو یہ ہے اور انداز جہانگیری و پیشوائی ہے تو یہ۔

یونان کے حکمران، روم کے خدائی منصب پر براجمان قیصر، ایران کے کسریٰ، مصر کے

فراعنہ اور عراق و ہند و چین کے مغرور و سرکش بادشاہوں اور شہنشاہوں کی رہائشیں آج ہزاروں سالوں بعد بھی آثارِ قدیمہ کے طور پر دنیا میں معروف ہیں ان کے محلات، باغات، سیر گاہیں، رہائش گاہیں اور دربار ـــــ اس بات کو برملا کہہ رہے ہیں کہ کبھی ان جگہوں پر ایسے لوگ حکمران تھے اور آباد تھے جو اپنے اقتدار کو دائمی سمجھتے تھے اور اپنے اقتدار کی طوالت کے لیے ہزاروں لاکھوں لوگوں کو تہ تیغ کرنے اور صفحۂ ہستی سے مٹانے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے اور اپنی موت اور اقتدار کے خاتمے کا لفظ بھی کسی سے سننا گوارا نہ تھا ـــــ مگر آج وہ کہاں ہیں؟ شاید ان کی قبروں کے کتبے بھی تاریخ کی دھول میں کہیں گم گئے ہیں۔

اس کے برعکس درویش حکمران اور خلافت راشدہ کے نمونے دینے والے لوگ سادہ اور خلوص و محبت سے آراستہ طرزِ زندگی کے پس پردہ ایسا نقشِ جاوداں دلوں پر جما گئے ہیں کہ ان کی یادیں آج بھی دلوں کو ستاتی ہیں اور آنکھوں کو نم کر دیتی ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سادگی کے چند واقعات

1۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نہایت متواضع اور خاکسار تھے اور کسی کام سے ان کو عار نہ تھا، اکثر بھیڑ بکریاں تک خود ہی چرا لیتے اور محلّہ والوں کی بکریاں دوھ دیتے تھے۔ چنانچہ منصب خلافت کے لیے جب ان کا انتخاب ہوا تو سب سے زیادہ فکر محلّہ کی ایک لڑکی کو لاحق ہوئی اور اس نے تاسف آمیز لہجے میں کہا: ''اب ہماری بکریاں کون دوہے گا؟'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سنا تو فرمایا: خدا کی قسم! میں بکریاں دوہوں گا، اُمید ہے کہ خلافت مجھے مخلوق کی خدمت گزاری سے باز نہ رکھے گی۔ (سیر الصحابہ، مولانا شاہ معین الدین ندوی)

2۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے وسیع کنبے کے لیے بیت المال سے صرف دو درہم روزانہ لیتے تھے اور تکلیف و عسرت کے ساتھ بسر کرتے تھے۔ ایک دفعہ حج میں اسّی درہم صرف ہو گئے تو اس کا افسوس ہوا اور اسے اِسراف تصور کیا۔ کپڑے پھٹ جاتے لیکن اس خیال سے کہ بیت المال پر بار نہ پڑے اسی میں پیوند پر پیوند لگاتے جاتے تھے۔ حضرت حسنؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جمعہ کے روز خطبہ دے رہے تھے کہ میں نے شمار کیا تو ان کے تہبند پر بارہ پیوند لگے ہوئے تھے۔

ایک دفعہ دیر تک گھر میں رہے، باہر آئے تو لوگ انتظار کر رہے تھے، معلوم ہوا کہ پہننے کو کپڑے نہ تھے اس لیے ان ہی کپڑوں کو دھو کر سوکھنے کو ڈال دیا تھا، خشک ہوئے تو وہی پہن کر نکلے۔

ایک مرتبہ حضرت عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما نے کہا: امیر المومنین! اب خدا نے مرفہ الحال کیا ہے، بادشاہوں کے سفراء اور عرب کے وفود آتے رہتے ہیں، اس لیے آپ کو اپنے طرزِ معاشرت میں تغیر کرنا چاہیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا، افسوس، تم دونوں اُمہات المومنین ہو کر دنیا طلبی کی ترغیب دیتی ہو، عائشہ! تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حالت کو بھول گئیں کہ تمہارے گھر میں صرف ایک کپڑا تھا جس کو دن کو بچھاتے تھے اور رات کو اوڑھتے تھے۔ حفصہ تم کو یاد نہیں ہے کہ ایک دفعہ تم نے فرش کو دہرا کر کے بچھا دیا تھا، اس کی نرمی کے باعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات بھر سوتے رہے۔ بلال نے اذان دی تو آنکھ کھلی، اس وقت فرمایا: ''حفصہ! تم نے یہ کیا کیا کہ فرش کو دہرا کر دیا کہ میں صبح تک سوتا رہا، مجھے دنیاوی راحت سے کیا تعلق؟ اور اس فرش کی نرمی کی وجہ سے تو نے مجھے غافل کر دیا''۔

غذا بھی عموماً نہایت سادہ ہوتی تھی۔ معمولاً روٹی اور روغن زیتون دسترخوان پر ہوتا تھا۔ ..... حفص بن ابی العاص اکثر کھانے کے وقت موجود ہوتے تھے لیکن شریک نہیں ہوتے تھے، ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وجہ پوچھی تو کہا کہ آپ کے دسترخوان پر ایسی سادہ اور معمولی غذا ہوتی ہے کہ ہم لوگ اپنے لذیذ اور نفیس کھانوں پر اس کو ترجیح نہیں دے سکتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں قیمتی اور لذیذ کھانا کھانے کی مقدرت نہیں رکھتا؟ قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر قیامت کا خوف نہ ہوتا تو میں بھی تم لوگوں کی طرح دنیاوی عیش و عشرت کا دلدادہ ہوتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ راتوں کو گشت کرتے تھے کہ عام آبادی کا حال معلوم ہو، ایک دفعہ گشت کرتے ہوئے مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر مقام حرار پہنچے، دیکھا کہ ایک عورت پکار رہی اور دو تین بچے رو رہے ہیں، پاس جا کر حقیقت حال دریافت کی۔ عورت نے کہا بچے بھوک سے تڑپ رہے ہیں، میں نے اُن کو بہلانے کو خالی ہانڈی چڑھا دی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اُسی وقت

مدینہ آئے اور آٹا، گھی، گوشت اور کھجوریں لے چلے، حضرت عمرؓ کے غلام اسلم نے کہا میں لیے چلتا ہوں۔ فرمایا: ہاں قیامت میں تم میرا بار نہیں اٹھاؤ گے اور خود ہی سب سامان لے کر عورت کے پاس گئے۔ اس نے کھانا پکانے کا انتظام کیا۔ حضرت عمر نے خود چولہا پھونکا۔ کھانا تیار ہوا تو بچے کھا کر خوشی خوشی اُچھلنے کودنے لگے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ دیکھتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔

(ماخوذ از سیر الصحابہ، مولانا شاہ معین الدین ندوی، ج 1)

3۔ (حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ شام کے والی اور سپہ سالارِ اعظم تھے، جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ 17ھ میں بیت المقدس تشریف لے گئے، تو) بیت المقدس کے اثنائے قیام میں ایک دن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے از راہِ خوش طبعی و بے تکلفی کہا: ''بھئی اور لوگ تو میری دعوت کر چکے ہیں لیکن تم نے مجھے مدعو نہیں کیا، آج تم بھی میری دعوت کر دو نا!''

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''امیر المؤمنین میں اس خیال سے خاموش تھا کہ شاید آپ کو میری دعوت پسند نہ آئے ورنہ میں اپنے غریب خانہ پر ہر وقت آپ کے لیے چشم براہ ہوں''۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ان کی جائے قیام پر تشریف لے گئے تو حضرت ابوعبیدہ نے روٹی کے چند سوکھے ٹکڑے امیر المومنین کے سامنے لا کر رکھ دیے اور عرض کی: ''امیر المومنین میری تو یہی خوراک ہے دونوں وقت روٹی کے یہ سوکھے ٹکڑے پانی میں بھگو کر کھا لیتا ہوں۔''

حضرت عمر فاروق رونے لگے اور فرمایا: ''شام میں آ کر سب ہی بدل گئے لیکن ابوعبیدہ ایک تم ہو کہ اپنی اُسی وضع پر قائم ہو۔'' (سوشیدائی، تالیف: طالب ہاشمی)

باب5

☆ بنی اسماعیل (مسلمان) اور بنی اسرائیل (یہود و نصاریٰ)
کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر 145

☆ بنی اسماعیل (مسلمان) اور بنی اسرائیل (یہود و نصاریٰ)
کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر 152

☆ 8000 سال کا انسانی اجتماعیت کا ارتقائی سفر
اور ریاست اسرائیل کا قیام 163

☆ مغرب میں ریاست کے رول ماڈل تک کے سفر میں
ایک علمی و فکری بددیانتی کا عنصر 165

☆ بنی اسماعیل اور بنی اسرائیل کی کشاکش _ کا ایک اہم پہلو _ 172

بنی اسماعیل (مسلمان) اور بنی اسرائیل
(یہود و نصاریٰ) کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر (I)

دنیا میں ہر تہذیب اور تمدّن میں انسانوں کے ہاتھوں اور ارضی و سماوی آفات کے ذریعے جو واقعات رونما ہوتے ہیں ان کا تذکرہ 'تاریخ' اور ان حالات و واقعات کی وجوہات اور اثرات و نتائج و عواقب کی کھوج لگانا 'فلسفۂ تاریخ' کہلاتا ہے۔

یہ بات بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہر قوم کو اپنی تاریخ اپنے انداز اور نظریے کے مطابق یاد رکھنے اور لکھنے کا حق ہے اور یقیناً فاتح قوم اور مفتوح قوم کا ایک ہی جنگ کے واقعہ کے بارے میں نقطۂ نظر بالکل یکساں نہیں ہوسکتا۔ واقعات کی تعبیر کی وجہ وہ نظریات و افکار ہیں جو ہر قوم اور اجتماعیت کے افراد اپنے ذہنوں میں رکھتے ہیں۔ اور ہر اجتماعیت اپنے اہداف اور نصب العین کے حوالے سے ہی اپنی تاریخ کو جمع کرتی ہے اور اگلی نسلوں کو منتقل بھی کرتی ہے۔

آئندہ صفحات میں بیان کردہ تاریخ میں غیر جانبداری کی کوشش کی گئی ہے کہ اس میں کوئی غلط بیانی کا عنصر شامل نہ ہونے پائے مگر واقعات کا تجزیہ ـــــ یقیناً مسلمانوں ہی کے نقطۂ نظر سے ہے اس میں مسلمان قاری کو کوئی شرمندگی نہیں ہونی چاہیے اور غیر مسلم قاری کو کوئی پریشانی اور کوفت۔

مسلمانوں کی تاریخ (تاریخ بنی اسماعیل) 632ء تا 1603ء

محسن انسانیت سیّدنا حضرت محمد ﷺ 571ء میں مکہ میں پیدا ہوئے۔ والد آپ کی ولادت سے پہلے وفات پا چکے تھے۔ والدہ کا سایہ بھی 6 سال کی عمر نہیں رہا۔ دادا عبدالمطلب

اور چچاؤں نے پرورش کی، ابوطالب کے ہاں کافی عرصہ رہے اور انھوں نے مرتے دم تک ایمان نہ لانے کے باوجود ساتھ دیا۔ 40 سال کی عمر میں آپ پر وحی کا آغاز ہوا اور آپ انسانیت کے محسن بن گئے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بہترین نمونہ (اُسوہ حسنہ) آپ ﷺ ہی ہیں۔ انفرادی زندگی میں بھی آپ ہر لحاظ سے تمام انسانوں کے لیے کامل نمونہ تھے اور اجتماعی زندگی میں بھی سرداری، حکومت، حکمرانی، جہانبانی اور شانِ جہانگیری میں قابل عمل نمونہ دے کر شاہِ جہاں ہی نہیں شاہ دو جہاں یا شاہِ ہمہ جہاں (رحمت للعالمین) ٹھہرے (فداہ آبائنا واُمہاتنا)۔

انفرادی زندگی میں نمونہ بننے کے لیے آپ پر مصائب آئے تاکہ صبر و برداشت کا نمونہ دکھا سکیں، تکالیف آئیں اور ستائے گئے کہ گالیاں کھا کر بھی دعائیں دینے کا نمونہ پیش کر سکیں۔ آپ نے ظلم و تعدی، بائیکاٹ، جان و مال کے خطرات برداشت کیے اور جان ہتھیلی پر رکھ کر زندگی کے کئی برس مکے میں گزارے کہ عملاً دنیا کے دکھی اور ستائے ہوئے انسانوں کو بھی حوصلے دے سکیں اخلاق، کردار، نجی زندگی اور لائف سٹائل میں آپ نے ایک کافی نمونہ چھوڑا۔

اجتماعی زندگی میں اندازِ حکمرانی، طرزِ جہانبانی اور شانِ جہانگیری کو قدرت اور دنیا بھر کے قیصروں، کسراؤں، فراعنہ و نمارده، یونانی فلاسفہ کے تراشے مصنوعی و حیوانی اخلاق کے نمونوں کو مٹا کر ایک پاکیزہ، سادہ، آسان اور قابل نسخہ دیا جو دنیا کے ہر انسان اور حکمران کی آنکھوں کا سرمہ، چلنے کے لیے روشن راستہ، خدمت خلق کا عالمی چارٹر اور میگنا کارٹا (MAGNA CARTA) ہے۔

آپ ﷺ نے اجتماعی زندگی کے راستے کے کانٹے صاف کرنے اور نمونہ دینے کا عزم کیا تو آپ کی ہر سطح پر اور ہر ممکن طریقے پر مخالفت ہوئی اپنوں اور پراؤں سب نے راستے روکنے کی کوشش کی۔ انبیاء کرام کے نام لیوا بھی اپنے منصب کے غرور اور ابلیسی خود غرضانہ خواہشات کی تکمیل و حفاظت کے لیے مخالفوں کی صف میں کھڑے ہو گئے۔

آپ کے لیے دو راستے تھے ایک حالات کے جبر اور مخالفت کے طوفان اور وسائل کی کمی کا بہانہ بنا کر اس کام کو ادھورا چھوڑ دیں یا ہر چہ باداباد، اس کام کے لیے وسائل کی کمی اور مخالفوں کے قیصری اور کسروی شان و وسائل کی پرواہ کیے بغیر اپنوں اور پراؤں سے لڑ کر اپنے مقصد کے حصول کے لیے محنت کریں۔ آپ ﷺ نے باہمت مردوں کی طرح دوسرا راستہ اختیار

فرمایااور اپنے ساتھیوں کو بھی اسی راستے پر چلنے کی تاکید بھی کی اور حوصلہ بھی دیا۔

یہ راستہ تھا جدوجہد کا ـــــ کہ اس مقدس مشن کے لیے راستے کی ہر رکاوٹ کو عقل و حکمت سے تمام وسائل بروئے کار لا کر رستے سے ہٹا دیں۔ اسی کو آپ ﷺ نے جہاد کا نام دیا بلکہ اللہ کے لیے جہاد کا درجہ عطا فرمایا کہ یہ انسانیت کی بھلائی کے لیے۔ تھا جبکہ قیصر و کسریٰ اور یونانی حکمرانوں (اسکندر وغیرہ) کی جنگیں نفسانی اغراض اور عیاشی کے لیے تھیں اور ان کی فوجیں بھی اسی مقصد خبیثہ اور انسان دشمن اور اخلاق دشمن اغراض کے لیے ساتھ تھیں۔

کبھی نفس آرام کا تقاضا کرتا ہے جبکہ ضرورت داعی ہے کہ باہر نکلا جائے تو نفس کے خلاف بھی جہاد ہے۔ کبھی ماحول اور معاشرے کے خلاف جہاد، حکمرانی اور بادشاہت کے پرانے تصورات کے خلاف جہاد، باطل نظریات کے خلاف، کبھی یہ جہاد زبان سے ہے کبھی قرآن مجید کی تعلیمات سے (یعنی قلم سے) کبھی منافقین سے ہے کبھی مذہبی قیادتوں سے ہے کبھی بادشاہوں سے ہے۔ جہاد کے یہ سارے مراحل اور قسمیں آپ ﷺ نے ہمارے لیے نمونہ چھوڑیں اور آپ کے مخلص ساتھیوں اور آپ کے متصل بعد کے حکمرانوں نے اسی راستے کو اپنا کر دنیا کے منہ زور، خودسر، خودغرض، لٹیرے، غاصب، بداخلاق بدکردار، عیاش حکمرانوں پر کامیابیاں حاصل کیں۔

آپ ﷺ نے مدینہ آ کر جنگیں کیں، خود زخم اُٹھائے، تلوار ہاتھ میں لے کر دشمن کے سامنے آئے۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ اب قیامت تک ـــــ انسان دشمن، خدابیزار، وحی دشمن، علم دشمن اور اخلاق دشمن چاہے کسی بھیس میں آئیں، ان کے اقتدار کو ختم کرنے کے لیے یہی راستہ ہے۔ دعوت و تبلیغ، وعظ و تلقین بھی اس راستے کے نقش پا ہیں تاہم مقصد چونکہ خدمت انسانیت ہے اور مقصود انسانیت کو لٹیرے اور عیاش حکمرانوں کے دست برد سے بچا کر امن و عافیت اور انسان دوست ماحول فراہم کرنا ہے جہاں عدل، انصاف، امن و سکون، کفالت عامہ، عزت و آبرو کی حفاظت اور جان و مال کے تحفظ جیسی نعمتیں عام ہوں۔ لہٰذا میدانِ جنگ کا راستہ بھی قیامت تک کھلا ہے قرآن پاک کی تعلیمات ہیں کہ اگر مخالفین مسجد و کعبہ میں آ کر تم سے لڑائی شروع کر دیں تو وہاں بھی ان کا سخت مقابلہ کرو اور ان کے لیے لقمۂ تر نہ بنو۔ تاکہ دنیا میں عدل و انصاف کی حکمرانی کے نمونے سامنے آ سکیں۔

یہ احسان ہے آپ ﷺ کا انسانیت پر۔ اس لیے آپ محسن انسانیت بھی اور رحمت للعالمین بھی ہیں۔ حیف اور صد افسوس، ان بدکردار اور خبیث روحوں اور ان خبیث روحوں کے بوجھ کو اٹھائے پھرتے جسموں پر جو اس محسن انسانیت اور مثالی انسان کی سیرت کو داغدار کرتے ہیں، اُن کی تعلیمات (قرآن) کو جلاتے ہیں، ان کے کارٹون بناتے ہیں۔ کیسے محروم اور بدنصیب لوگ ہیں یہ بھی اور وہ بھی جو ان کی حمایت کرتے ہیں انہیں تحفظ دیتے ہیں اور ان کے حق میں قانون سازی کرتے ہیں۔ یہ محمد ﷺ اور اسلام دشمنی نہیں یہ انسانیت دشمنی ہے یہ حکمرانی کے اس عوامی انداز اور سادگی کی عوامی حکمرانی کی دشمنی ہے جو آپ ﷺ لے کر آئے اور جس کے نمونے آپ کے ماننے والوں نے دنیا کو دیے ہیں۔ اور یہی راز ہے پہلی جنگِ عظیم سے پہلے ڈیڑھ صدی میں روس کا سلطنت عثمانیہ کے یورپی (مشرقی) مقبوضات میں جنگیں اور عثمانیہ سلطنت کو کمزور کرنے، جنوبی اور وسطی افریقہ میں ابتداءً برطانوی اور فرانسیسی نوآبادیات کے قبضے اور بعدازاں سلطنت عثمانیہ کے خلاف بغاوت اور جنگی کارروائیاں اور جنگ کے خاتمہ (1918ء) پر فلسطین میں یہودیوں کی ناجائز آباد کاری (قائداعظم محمد علی جناح نے فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری کو یورپی اقوام کا 'حرامی بچہ' کہا تھا) اور مشرق وسطی میں سلطنت عثمانیہ کے مقبوضات کی بندر بانٹ کا۔ بعدازاں صرف ملک ترکی رہ گیا اور خلافت اسلامیہ ــــــ (جو حضرت محمد ﷺ کی تعلیمات کا ٹوٹا پھوٹا نمونہ تھی) کا خاتمہ ہوگیا اس لیے کہ مغربی آقاؤں اور آج کے مقتدر طبقات کو یہ نمونہ کسی درجے پسند نہیں۔

آپ ﷺ نے 632ء میں وفات پائی تو اس وقت آپ کی مثالی حکومت لاکھوں مربع میل پر قائم تھی اور اس مثالی عوامی فلاحی حکومت کے قیام میں آپ ﷺ کے حسن تدبیر سے صرف 130 مسلمان اور 7000 کے قریب مخالف فوجوں کے انصاف دشمن اور اخلاق دشمن لوگ کام آئے۔ اس کے برعکس یونانی بادشاہوں اور رومی بادشاہوں کے مظالم اور حکومتوں کے استحکام و دوام کے لیے انسانیت کے قتل عام میں لاکھوں بلکہ کروڑوں لوگوں کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ سلطنت روم میں 1000 سالہ دورِ حکومت میں صرف امن کے دور میں 11 لاکھ مخالفین کو اذیتیں دے کر مارا گیا۔ گویا 1000x365=365000 دن میں روزانہ 3 آدمی بغاوت کے جرم میں TORTURE کر کے ہلاک کیے گئے۔ [آج کا مغرب اسی رومی سلطنت کو اپنا قبلہ اور آئیڈیل

سمجھتا ہے اپنے مجرم FBI, CIA اور گوانتاناموبے جیل ڈالتا ہے اور رومی حکومت کے TORTURE کے طریقے آزماتا ہے جبکہ دوسرے زیر اثر ممالک میں جہاں امریکی خود اور اس کے آلہ کار NGO's انسانیت سوز کارروائیاں کر کے پکڑے جائیں تو سزائے موت کے خاتمے کا واویلا مچاتا ہے]۔

632ء ---- 1258ء

☆ آپ ﷺ کے بعد آپ کی تعلیمات کے مطابق حکومتیں قائم ہوئیں۔ پہلے 30 سال کا دور آپ ﷺ کے براہِ راست تربیت یافتہ لوگوں کا ہے جو مسلمانوں کے نزدیک مثالی ہے اور اس میں یہ مثالی حکومت معلوم مہذّب دنیا کے بڑے حصے تک پھیل گئی۔ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی رضی اللہ عنہم اس مثالی حکومت کے مثالی حکمران ہیں جو نبوت کے وہبی منصب کے بعد انسانی سطح پر سب سے اعلیٰ حکمران اور درویش بادشاہ کہلانے کے مستحق ہیں۔

660ء --- 750ء عالم اسلام میں دورِ بنواُمیہ ہے۔ اس میں مخصوص خارجی اور ملکی حالات میں خاندانی حکمران کا رواج ہوا۔ تاہم اسلام کے تربیت یافتہ لوگ صحابہ کرام اور ان کے براہ راست شاگردوں تبع تابعین اور اس سلسلے کی تیسری نسل موجود تھی جن میں حضرت محمد ﷺ کی تعلیمات کا اثر ابھی ماند نہیں پڑا تھا۔ انفرادی سطح پر تو اعلیٰ ترین نمونے موجود تھے مگر اجتماعی اور حکومتی سطح پر حکومت حضرت محمد ﷺ کی تعلیمات کے مطابق 'مثالی' نہیں رہی تھی۔

☆ **750ء -- 1258ء**

اس دور میں عالم اسلام بہت پھیل گیا تھا مشرق میں موجودہ پاکستان سے آگے دہلی تک مسلم حکومتیں تھیں۔ افریقہ کا تمام آباد شمالی حصہ اور مغربی آدھا یورپ (اُندلس ہسپانیہ، سپین) فرانس کے قلب تک مسلمانوں کے پاس تھا جہاں مسلم اقتدار 1492ء تک رہا۔

یہ دور عربوں کے ایک اور مقتدر قبیلے بنوعباس کا ہے اور اس خاندان نے 524 سال حکومت کی ہے (132ھ تا 656ھ)۔

یہ سارا دور عوامی سطح پر تو آسودگی، خوشحالی اور فارغ البالی کا تھا مگر خود مسلمانوں کے نزدیک اسلام کی اجتماعی اور ریاست کی سطح پر تعلیمات میں شدید بحران آ گیا تھا۔ تاہم یہ دور بھی

غیر مسلم دنیا کے اچھے سے اچھے حکمران کے مقابلے میں کہیں بہتر تھا۔ بنوعباس کے حکمران بھی عیش وعشرت میں پڑ گئے تھے، شراب و کباب کے عادی ہو گئے تھے، محلات تعمیر کراتے تھے لہٰذا خود مسلمانوں کے مذہبی رہنما ان پر تنقید کرتے رہے اور اصلاح کی کوششیں کرتے رہے۔

☆ 1258ء – 1520ء

بنوعباس کے دورِ زوال میں جب معاملات بہت خراب ہو گئے تو منگولیا (چین) سے چنگیز خان اور ہلاکو خان کی فوجیں آئیں اور قوت و اقتدار کا خلا دیکھ کر اس عظیم حکومت کو ختم کر دیا اور اس کے بعد 200 سال کے لگ بھگ سیاسی افراتفری کا دور ہے۔ کوئی مرکزی حکومت نہ رہی۔ البتہ حضرت محمد ﷺ کی تعلیمات کی حقانیت وصداقت کا یہ مظہر سامنے آیا کہ اسلام ایک دین اور نظریہ ہے اور آفاقی و آسمانی نظریہ ہے۔ لہٰذا اس کے ماننے والے اس پر عمل درآمد ترک کر دیں تو اصلاح کی غرض سے ایک حد تک برداشت کرتا ہے مگر حد سے گزر جانے پر اسلام خود اس طبقے سے اعلان بیزاری کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس طبقے کو کسی دنیوی مقتدر طبقے سے سزا دلواتا ہے اور ان کا اقتدار جاتا رہتا ہے۔

بنوعباس کا اقتدار چھن گیا تو اس سے اسلام کے ایک نظریہ اور آسمانی دین ہونے کی بابت یہ بات سامنے آئی کہ چنگیز خان و ہلاکو خان نے مسلمانوں اور مسلمان حکمرانوں کو ختم کر دیا ـــــ مگر اسلام کا نظریہ اور آسمانی ہدایت تو موجود تھی اور اس نظریہ میں جان اور حرارت بھی تھی۔ لہٰذا جلد ہی ایک صدی کے اندر اندر چنگیز خان اور ہلاکو خان کی اولاد مسلمان ہو گئی اور چونکہ یہ گرم خون تھا، نئے مسلمان تھے، باعمل بنے تو اللہ تعالیٰ نے آئندہ دنیا بھر میں مسلم اقتدار انھیں کے مقدر میں لکھ دیا۔

چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ اسلام کی تاریخ کے اس دور میں اسلام کی تعلیمات کے تحت (ہندی و چینی و رومی و یونانی خود ساختہ فلسفیانہ نظریات کے تحت لوٹ کھسوٹ، ذاتی ملکیت کے تصورات، سود کے تصورات اور حکمرانوں کے شاندار محلات کے ساتھ اخلاقی گراوٹ، انسانیت کی تذلیل وغیرہ وغیرہ کے طرز حکمرانی سے بدرجہا بہتر) تین عظیم سلطنتیں صدیوں دنیا میں رہیں۔ یہ اسلام کی آفاقی تعلیمات کے غلبے کا دوسرا دور ہے۔

ایران میں صفوی حکومت، مشرق یورپ، ترکستان شمال مغربی اور مغربی ایشیا (مشرقِ وسطیٰ)، شمالی افریقہ میں عظیم سلطنت عثمانیہ، جنوبی ایشیا میں افغانستان سے برما تک مغل حکومت گویا فرانس سے لے کر برما تک سولھویں صدی سے اٹھارھویں صدی 1520ء سے 1800ء تک مسلمان حکومتیں تھیں۔

سلطنت مغلیہ 1857ء میں برطانوی سامراج نے ختم کی۔

سلطنت عثمانیہ 1918ء میں جنگ عظیم اوّل کے بعد اتحادی فوجوں کی بھینٹ چڑھ گئی۔

صفوی سلطنت بھی اٹھارھویں صدی میں برطانوی سازشوں کا شکار ہوگئی۔

قانون اور اخلاقی تعلیمات کا فرق

دین میں اگرچہ فقہ اور قانون کی سطح پر استعمال کی اشیاء، منقولہ اور غیر منقولہ، اثاثے اور وسائل رزق کی ذاتی ملکیت کا تصور ہے مگر یہ تصور محدود ہے مطلق نہیں۔ ملکیت کے تصور کا اخلاقی اور حقیقی پہلو یہ ہے کہ ایمان کی مضبوطی اور پختگی کے ساتھ ملکیت کا تصور کمزور پڑے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان چیزوں کے استعمال کے حق کو جائز سمجھا جائے اور ملکیت دراصل اللہ تعالیٰ کا حق سمجھا جائے اور اس کا یقین اپنے اندر پیدا کیا جائے۔

بنی اسماعیل (مسلمان) اور بنی اسرائیل
(یہود و نصاریٰ) کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر (II)

تورات و انجیل کے ماننے والے بنی اسرائیل
کی تاریخ 632ء_1949ء

سیّدنا محمد ﷺ کی وفات 632ء کی ہے بنی اسرائیل کی تاریخ 2000 ق م حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے دو بیٹوں حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام سے شروع ہوتی ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ان کے والد محترم نے مکہ میں آباد کیا، جہاں چاہِ زمزم جاری ہوا، کعبہ تعمیر ہوا اور مکہ شہر آباد ہوا۔

حضرت اسحاق علیہ السلام کو ان کے والد گرامی نے فلسطین میں آباد کیا جہاں ان کی اولاد خوب پھلی پھولی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے مصر کے بادشاہ بننے پر بنی اسرائیل مصر ہجرت کر گئے اور وہاں کئی صدیاں رہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی غلامی سے بنی اسرئیل کو 1340 ق م میں نجات دلائی۔ 1000 ق م میں حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ یہ دور بنی اسرائیل کا پہلا عروج تھا۔ اس کے بعد زوال ہوا جب وہ نمرود بادشاہ بخت نصر کے ہاتھوں بیت المقدس کی تباہی کے بعد غلام بنا لیے گئے۔ اس کے بعد دوبارہ عروج آیا اور دو صدیوں بعد دوسرے زوال سے دوچار ہو گئے۔

بنی اسرائیل اس دوران حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے قتل کے مرتکب ہوتے رہے جس کی انہیں سزا ملی۔ حتیٰ کہ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو بھی سولی چڑھانے کے سارے قانونی تقاضے پورے

کر دیے۔ تاہم وہ 'رسول' تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں بچالیا اور.....ایک حکمت کے تحت زندہ رکھا ہوا ہے۔ تا کہ وہ قربِ قیامت میں دوبارہ دنیا میں آئیں جس کی پیش گوئی حضرت محمد ﷺ نے فرمائی ہے۔ چھ صدیوں کا آسمانی ہدایت کا خلا انبیاء کرام علیہم السلام کے قتل کی وجہ سے ہوا اور چھ صدیوں کی فترت (وقفہ) حکمت خداوندی کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ کے درمیان رکھا گیا۔ 600 ق م سے 600 عیسوی تک کی بارہ صدیاں دنیا میں انسانی ذہن کے تراشیدہ فلسفوں کے عروج کا دور ہے۔

ہر انسان میں نیکی کے جذبات کے پہلو بہ پہلو کچھ 'شر' (EROTICISM) کا پہلو تو فطرتاً موجود ہے اور یہ خیر کے ماحول میں دبا رہتا ہے تو موقع ملتے ہی پھر سر اُٹھا لیتا ہے۔ آسمانی ہدایت اور انبیاء کرام علیہم السلام کے ماحول میں یہ جذبہ دبا رہتا ہے۔ مگر 1200 صدیوں کے اوپر بیان کردہ آسمانی ہدایت کے فقدان (یاد رہے کہ تورات، زبور اور انجیل غائب کر دی گئیں اور انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا جاتا رہا) سے یہ EROTICISM نے بڑھ کر فلسفوں اور طرزِ حیات کی شکل اختیار کر لی۔ اجتماعی زندگی میں حکمران مطلق العنان بادشاہ اور شہزادے جو ہدایت سے دور تھے اپنی غلط کاریوں کے لیے کوئی RATIONALE اور 'جواز' چاہتے تھے وہ اس دور کے فلاسفہ نے فراہم کر دیا نتیجتاً یہ فلاسفہ خود بھی اس بے حیائی اور بداخلاقی اور شیطنت کی دلدل میں پھنستے رہے اور اپنے دور کے حکمرانوں، حکومتی ایوانوں کو عوام تک کو اسی 'سیکولر' سوچ میں ڈال کر حیوانی سطح پر گرا گئے جس سے نکلنے کے لیے انسان کو بڑی EFFORT کی ضرورت ہے۔

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ دنیا بھر کے فلسفہ کے مراکز یونان، ایران، ہند اور چین ہیں اور ان مراکز میں تمام مشہور فلاسفہ اسی آسمانی ہدایت کے محروم ''تاریک دور'' میں دنیا میں آئے اور ان کے فلسفوں کو مسلسل 12 صدیاں پھلنے پھولنے کو مل گئیں۔

حضرت محمد ﷺ کے دور مبارک میں عرب (مدینہ) میں بنی اسرائیل کے تین قبیلے صدیوں سے آباد تھے (فلسطین سے نکالے جانے کے بعد 70ء سے) اور مشہور یہ ہے کہ وہ مدینہ آ کر اس لیے آباد ہوئے تھے کہ یہ ان پر ایمان لائیں گے اور اہل مدینہ کے ساتھ صدیوں کے تعامل

میں وہ یہی عربوں کو بھی بتاتے تھے۔ مگر ___ وائے افسوس! جب حضرت محمد ﷺ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو یہود نے نہ صرف ایمان قبول نہ کیا ___ اُلٹا حضرت محمد ﷺ کو زک پہنچانے، نیچا دکھانے، ناکام کرنے اور قتل کرنے کے منصوبے کرتے رہے۔ تینوں قبیلے یکے بعد دیگرے اسی جرم میں مدینے سے فوجی کارروائی کے نتیجے میں بے دخل کیے گئے پھر خیبر سے بھی نکال دیے گئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں جزیرۂ عرب سے بھی نکال دیے گئے۔

گویا ___ بنی اسرائیل نے انسان کی اجتماعی زندگی کے سفر میں حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے اُسوہ کو آگے بڑھا کر لوٹ کھسوٹ، وسائل پر قبضہ، اپنے اقتدار پر استحکام اور وسعت کے لیے جنگیں، انسانیت کا قتل اور مخالفین کو TORTURE سے پاک معاشرے کی تشکیل کی ذِمہ داری نبھانے کی بجائے منہ زور، عیاش، خدابیزار اور وحی دشمن بادشاہوں اور فلسفیوں کا ساتھ دیا، ان کے فلسفوں کو پھیلایا ان کی سرپرستی کی اور ان کے عالمی سطح پر فروغ میں حصہ لیا۔ پہلے نبیوں کو قتل کرتے رہے اور حضرت محمد ﷺ کے لائے ہوئے انسان دوست، اخلاق دوست، علم دوست اور درویش بادشاہت کے نمونوں کو بھی نہ صرف ردّ کیا بلکہ ان کو بھی 'ختم کرنے' کی کوششوں کا شعوری اور غیر شعوری دونوں سطح پر ساتھ دیا اور یوں انسان دشمنی اور اخلاق دشمنی میں ابلیس کے ہمنوا اور فرنٹ مین بن گئے اور انسانوں کے مابین ابلیسی طرز زندگی (LIFE STYLE) کے فروغ کے نقیب بن گئے۔

آسمانی ہدایت موجود ہو تو ابلیسی فلسفے اور نظریات پھل پھول نہیں سکتے اور بارہ صدیوں کے دوران آسمانی ہدایت کے فقدان کی وجہ سے یہ فلسفے پروان چڑھے تھے۔

اس حقیقت کا یہ پہلو تاریخ انسانی کا روشن باب ہے کہ جب تک حضرت محمد ﷺ کی لائی ہوئی ہدایت مسلمانوں کے عمل میں زندہ رہی یعنی دور بنوامیہ اور دور بنوعباس کے حکمران ___ اسلامی اقدار اور تعلیمات اور انسان دوست، اخلاق دوست اور علم دوست ماحول کو پروان چڑھاتے رہے استحصال سے بچتے رہے اور درویش بادشاہت کا تصور سینے سے لگائے رہے۔ دنیا میں ابلیسی نظریات کے فروغ کے نقیب اور سیکولر مزاج کے فلسفی اور داعی و مبلغ پیدا نہیں ہو سکے۔

آپ دنیا بھر کی تاریخ میں فلسفہ کے عالمی مراکز میں مشہور فلاسفہ کے تاریخ پیدائش و تاریخ وفات پر نظر دوڑائیں تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح سامنے آئے گی کہ یونان کے فلسفہ کو پڑھنے اور اس پر تنقید کرنے والے مسلمانوں میں سے تو کچھ اہل علم پیدا ہوئے جنھوں نے اس کے کچھ اچھے پہلوؤں کی حمایت میں لکھنے کی کوششیں کیں مگر حیرت یہ ہے کہ عالم اسلام سے باہر 600 سال میں کوئی قابل ذکر مشہور فلسفی اور کسی نئے دبستان اور نئے فکر کا بانی پیدا نہ ہو سکا۔ یہ حضرت محمد ﷺ کی لائی ہوئی انسان دوست تعلیمات کا اثر تھا اور نظریاتی برتری تھی اس کی موجودگی میں کوئی سیکولر اور شہنشائیت کی حمایت کا فلسفہ نہ بن سکا اور نہ پنپ سکا۔

عالم اسلام کے زوال 1258ء بغداد اور 1492ء سپین کے بعد غیر مسلم دنیا میں استحصالی فلسفوں نے اجتماعی زندگی پر دوبارہ قبضہ کرنے کی کوششیں کی ہیں اور مسلم زوال کی وجہ سے وہ کامیاب بھی ہو گئے اور یوں عالمی سطح پر دنیا (انسانیت) دوبارہ لوٹ کھسوٹ کے استحصالی نظام کے خونیں پنجوں میں جکڑی گئی اور آج تک اسی نظام میں مجبور و بیکسی کے عالم میں بے حال ہے۔

آیئے! دیکھتے ہیں کہ انسانیت دشمنی کے اس سفر میں اور استحصالی اور سامراجی قوتوں کے فروغ میں خدا بیزار اور انسان دشمن..... نے کیسے، کب اور کون سی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے ایک اصولی بات یہ پیش نظر رہنی چاہیے کہ آپ ﷺ کی تشریف آوری اور انسانیت کے لیے ایک اجتماعی عادلانہ نظام کا نمونہ دینا اور دنیا پھر کے انسانوں کو حوصلہ اور سہارا دینا ایسا واقعہ تھا کہ عوام کے لیے خوش خبری تھی اور امید کی کرن تھی کہ کب ان کے علاقے بھی اسلام کے زیر نگیں آئیں اور وہ بھی عدل و انصاف اور عزت و آبرو کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگیں۔ باصلاحیت اور اصلاح پسند انسانوں کے لیے اطمینانِ قلب کا ذریعہ کہ چلو کسی نے تو دکھی اور یونانیوں اور رومیوں و ایرانیوں کے استبداد سے ہماری جان بخشی کرائی۔ مگر خود خدائی کے دعوے دار حکمرانوں اور ان کے اعوان و انصار و مفاد پرست زعماء و اراکینِ حکومت کے لیے موت کا پروانہ تھا۔ لہٰذا یہ طبقہ حضرت محمد ﷺ، آپ ﷺ کی تعلیمات اور آپ ﷺ کے ساتھیوں (جو اس انقلاب کے بانی تھے) کے مخالف اور جان کے دشمن بن گئے۔ اس مرحلہ پر بنی اسرائیل کا بگڑا ہوا دنیا پرست طبقہ ان عناصر کی پشت پناہی میں بڑا چست اور ہمہ تن مصروف عمل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ

اسلام کی افواج جہاں گئیں وہاں در پردہ عوام نے اسلام کے عادلانہ اور منصفانہ اجتماعی نظام اور غریب پرور تعلیمات تک رسائی کے لیے اپنے حکمرانوں کے ساتھ تعاون کم کیا اور مسلمانوں کو دل و جان سے خوش آمدید کہا۔ اسی لیے مسلمان محسنِ انسانیت ﷺ کی وفات کے بعد صرف 50 سالوں کے اندر مشرق و مغرب میں تمام تمدنی دنیا پر چھا گئے۔

بنی اسرئیل نے اس موقع پر سوگ منایا اور اسلام کی پاکیزہ اور آسمانی تعلیمات کے خلاف محاذ کھولے اور ہر ممکن طریقے سے اس اجتماعی مثالی عوامی فلاحی اندازِ حکمرانی، طرزِ جہاں بانی اور شانِ جہانگیری کا بزعم خویش راستہ روکنے کی سرتوڑ کوششوں میں مگن رہے ___ گو انسان دشمنی اور اخلاق دشمنی اور ابلیسیت کے پرستار لوگ بنی اسرائیل کے ہمنوا بن گئے اور عوامی فلاح اور عدل وانصاف کے راستے کے پتھر بن گئے۔ مختصر یوں کہا جا سکتا ہے کہ بنی اسرائیل کے انبیاء کے قتل کے عادی اس خدا بیزار اور وحی دشمن طبقے نے ہار نہیں مانی بلکہ رحمت للعالمینی کے اس بہتے دریا کی روانی کے آگے بند باندھنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ انسان انسان کا دشمن بن جائے اس کی اس سے بڑی کوئی مثال نہیں۔

بنی اسرائیل (یہود و نصاریٰ) کی تاریخ کے اس موضوع کی مناسبت سے اہم واقعات ترتیب وار درج کیے جا رہے ہیں تا کہ قارئین کے ذہن میں مربوط نقشہ یا خاکہ مستقل جگہ پا سکے۔

☆ جزیرہ نمائے عرب کے شمال میں ایران اور قیصر روم کی سلطنتیں تھیں، ان سرحدوں کے قریب ہی اسلام کے خلاف انصاف دشمن کارروائیوں کے مراکز وجود میں آئے۔

☆ اسلام کے پھیلاؤ میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قتل ناحق، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دَور میں سیاسی افراتفری اور خدا بیزار اور انسان دشمن طبقات سر اُٹھا کر مدینہ پہنچ گئے۔ اسلام کی سیاسی وحدت دو حصوں میں منقسم ہوگئی، مسلمان باہمی جنگوں میں اُلجھ گئے اور یوں ان واقعات سے جس طبقے کو مفاد ملا وہ یقیناً مطلق العنان بادشاہتوں کے نقیب، سامراجی اور استحصالی سوچ کے علمبردار اور انسان دشمن اور اخلاق دشمن اور عوام دشمن پالیسیوں کے فروغ کے

داعی تھے۔ دو دہائیوں کے بعد واقعہ کربلا اسی سلسلے کی کڑی تھی کہ اسلام کا 'سیل رواں' کسی طرح داخلی خلفشار کی نذر ہو جائے اور فتوحات کا سلسلہ رُک جائے ورنہ مشرق و مغرب میں کوئی طاقت اسلامی افواج کا راستہ روکنے کے قابل موجود ہی نہیں تھی اور یہی ابلیسیت اور استبدادی، ظالمانہ اور خود سر خدائی کے دعوے دار حکمرانوں کی موت کی علامت تھی۔ بنی اسرائیل اس کارروائی میں پیش پیش تھے۔

☆ بنو عباس کے دور میں مستحکم حکومت قائم ہوئی اور اس طبقہ نے یونانی فلسفہ کے مردود اور انسان دشمن نظریات (جن کا کوئی پرسان حال اور قدر دان نہ تھا) کو اہل اسلام میں پھیلا دیا اور مسلمانوں میں عقائد کے مسائل پر لاحاصل علمی بحثوں کا ایک سلسلہ جاری کر دیا۔ اسلام کو آگے بڑھانے اور دنیا میں ظلم کے خاتمے کے لیے جذبۂ عمل میں کمی آ گئی۔ مزید کئی سازشیں عمل میں لائی گئیں جن کا تذکرہ طوالت طلب ہے۔

☆ یورپ کو عیسائیت کے دفاع کے لیے اُٹھا کر اسلام کے خلاف صف آرا کر دیا چنانچہ بیت المقدس کے حصول کے لیے عیسائیوں نے صلیبی جنگوں (مذہبی جنگوں، عیسائیت بمقابلہ اسلام) کا آغاز کیا (یاد رہے کہ بیت المقدس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے 636ء میں فتح کر لیا تھا اور عیسائی حکومت اور مذہبی قیادت نے اپنی کتابوں اور صحیفوں میں موجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نشانیاں دیکھ کر بغیر جنگ علاقہ مسلمانوں کے حوالے کر دیا تھا) اور عیسائی مذہبی جنون میں برطانیہ، فرانس، بلجیم اور نہ معلوم کہاں کہاں سے بیت المقدس کی فتح کے لیے لائے گئے۔ (یاد رہے کہ مغربی یورپ، اندلس یا سپین میں مسلمانوں کی حکومت تھی۔)

بنو عباس کے دورِ زوال میں 1098ء میں عیسائیوں نے بیت المقدس مسلمانوں سے چھین لیا اور مسلمانوں کا وہ قتل عام کیا کہ خدا کی پناہ۔ یہ مقدس سرزمین عیسائیوں کے پاس تقریباً ایک صدی رہی تا آنکہ سلطان صلاح الدین ایوبی نے 1192ء میں واپس فتح کیا اور عیسائیوں پر بڑے احسانات کیے اور صلیبی فوجوں سے کوئی ذاتی انتقام نہیں لیا، سب سے بڑا فراخدلانہ سلوک کیا۔

☆ جنگوں سے مایوس ہو کر بنی اسرائیل (بالخصوص یہود) نے اپنی حکمت عملی بدل لی اور یورپی حکومتوں کو مستحکم کرنے اور مضبوط کرنے میں مصروف ہو گئے اور طویل منصوبہ بندی کے

ذریعے عیسائیت میں اپنا ایک مقام پیدا کرنے کے لیے مصروف عمل ہوگئے۔ چنانچہ اسلام کے مرکز سے بہت دور برطانیہ میں پہلے مذہبی آزادی کا پروانہ حاصل کیا اور 1225ء میں 'میگنا کارٹا' کے نام سے ایسی اصلاحات کا نفاذ کرایا کہ مذہب کی بحث کے بغیر ہر ایک کو زندہ رہنے کا حق ہے گویا یہود کے لیے ان علاقوں میں سر اٹھا کر چلنے کے مواقع پیدا ہوگئے اور یوں انہیں عیسائی حکومتوں کے زیر سایہ اپنی کارروائیاں جاری رکھنے کا قانونی وآئینی موقع میسر آ گیا۔

☆ یورپ میں یہ دور DARK AGES یعنی دورِ جہالت تھا جبکہ اسی یورپ کے مسلم حصّہ سپین میں علم اور تہذیب وتمدن کی روشنی تھی (برٹرینڈ رسل) یورپ کے تمام علاقوں سے نوجوان حصولِ علم کے لیے اس طرح آتے تھے جیسے آج لوگ امریکا کا رُخ کرتے ہیں۔ اس علم کی روشنی سے یورپ میں ایک عمومی بیداری پیدا ہوئی اور احیائے علوم کی تحریک اُٹھی کہ علم کے حصول اور پھیلاؤ کا وہ تصور جو عیسائیت نے دیا ہے، فرسودہ ہے اور وہ تصور جو اسلام دیتا ہے وہ قابل عمل اور انسان دوست ہے لہٰذا حصولِ علم اور فروغِ علم کے لیے نئے انداز اپنانے کا رواج چل پڑا۔ سائنسی ترقی کا آغاز ہوا اور توہمات کو زوال۔ حکمرانوں اور مذہبی قیادتوں کے من گھڑت اصول اور ضابطے ردّی کی ٹوکری کی نذر ہوگئے اور مسلمانوں کے میل جول سے حاصل کردہ روشنی کے ذریعے ترقی اور آگے بڑھنے کی نئی راہیں تلاش ہونے لگیں۔

☆ اس سارے عمل میں بنی اسرائیل (یہود) اپنے مفاد کے لیے بیدار رہے اور مسلسل مصروفِ عمل۔ ایران کی شمالی سرحد جو روسی علاقہ جات کی طرف جاتی ہے، پہاڑی سلسلہ ہے اور غالباً یہیں سدّ ذوالقرنین بنائی گئی تھی اور یہ یاجوج ماجوج کی آماجگاہ ہے اور یہود کے سازشی ذہن کے اصل اور قدیم مراکز اور اسلام دشمن سرگرمیوں کے LAND MARKS اسی بحیرۂ کیسپین (جس کا پرانا نام 'بحیرۂ خضر' ہے) کے جنوب اور مغرب میں واقع ہیں۔ حسن بن صباح کی جنت، مشاشین کا مرکز اور اس کی برادر تنظیموں کے روابط اسی علاقے میں موجود ہیں۔

☆ اسی علاقہ میں دورِ بنواُمیہ میں یہ واقعہ بھی پیش آیا کہ روسی اقوام میں سے ایک حکمران نے یہودیت قبول کرلی۔ اگرچہ یہودیت کوئی تبلیغی دین نہیں بلکہ نسلی مذہب ہے تاہم اس قبیلہ کو یہود کے پہلے سے موجود بارہ قبیلوں میں تیرھویں قبیلہ (13th TRIBE) کا نام دیا گیا۔ اس کے ساتھ

معاہدہ کی شرائط یہ تھیں کہ تم بنی اسرائیل کو فلسطین کا اقتدار واپس دلاؤ، ہم عالمی سطح پر فلسطین کے علاوہ تمام دنیا پر تمہاری حکومت کا حق تسلیم کر کے اس کے لیے تمہارا ساتھ دیں گے۔ یہ واقعہ 740ء کے لگ بھگ کا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد سے مسلمانوں کے خلاف ساری سرگرمیوں کی کلید اس واقعہ کے فریقین کے ہاتھوں میں رہی ہے۔ حتیٰ کہ عیسائی طاقتوں سے مسلمانوں کو زک پہنچانے اور اسلامی حکومت کو ختم کرنے کے عمل میں مایوسی کے بعد چنگیز خان اور ہلاکو خان کو اسی روسی علاقہ اور اسی سدذوالقرنین کو گرا کر ہی لایا گیا تھا۔ (یاد رہے کہ سدّ ذوالقرنین میں سوراخ ہونے اور راستہ کھل جانے کی خبر آپ ﷺ نے 629ء میں ہی اپنے ایک خواب کی تعبیر کے طور پر دے دی تھی۔)

ہند میں مسلمانوں کی 1028ء میں سومنات کی فتح کے بعد اسلام کا راستہ کھل گیا اور 1206ء میں لاہور کے بعد دہلی میں پہلی حکومت قائم ہوگئی اور وہ حکومت عوام دوست اور انسان دوست ہونے کے ناطے ایک اتمامِ حجت تھی کہ وہ حکومت کسی قیصر کی اولاد یا کسریٰ سے مقدس BLOOD LINE رکھنے والے حکمران نے نہیں بنائی تھی بلکہ اسلام کی درویش حکمرانوں کی تعلیمات کا عکس 'خاندانِ غلاماں' کا برسر اقتدار آنا تھا۔ اس دوران پہلے ایک مسلمان حکمران تیمور کے مشرق و مغرب کی تمام مسلمان حکومت کو غارت کرنے اور مسلم دنیا کے وسائل کو لوٹ کر تہی دست کرنے کا منصوبہ تھا جو بڑی کامیابی سے رُو بعمل لایا گیا۔

تیمور 1400ء میں دہلی میں لوٹ مار کے بعد تیزی سے ترکستان پہنچا اور سلطنت عثمانیہ کے ایک حکمران کو جو قیصر روم کے قلعہ قسطنطنیہ کو فتح کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا، لڑائی میں الجھا کر عثمانیوں کے وسائل کو ضائع کرا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسلام کی انسان دوست اور علم دوست تعلیمات اور عدل و انصاف کے فروغ کے لیے پاکیزہ کردار کے حامل درویش حکمرانوں کو جگہ دینے کے لیے 1453ء میں اسی عثمانی سلطنت کے ایک نامور فرد سلطان محمد فاتح رحمۃ اللہ علیہ کو یہ سعادت نصیب فرمائی کہ اس نے قسطنطنیہ فتح کر کے اسلام کا مشرق کی طرف یورپ میں داخلے کا بند راستہ کھول دیا۔ اگلے 50 سالوں میں مسلمان سارے مشرقی یورپ بلکہ روس تک کے علاقہ جات کو فتح کر کے فرانس کے قلب تک پہنچ گئے بلکہ ایک روایت کے مطابق برطانیہ میں بھی اس دور میں مسلمانوں کی حکومت رہی ہے۔

☆ بارھویں، تیرھویں اور چودھویں صدی میں یہودی مختلف یورپی ممالک سے اپنی سازشی سرگرمیوں کے باعث نکالے گئے ایک موقع پر تیرھویں صدی میں برطانیہ بھی در بدر ہوئے۔ اگرچہ سپین کی مسلم کی حکومت نے انہیں پناہ دی مگر یہ بنی اسرائیل کسی کے وفادار نہیں اپنے مفادات کے وفادار ہیں۔ مسلم اقتدار کے خاتمے کی سازشوں میں یہی طبقہ پیش پیش تھا۔

☆ ابلیسی قوتیں اور بنی اسرائیل کے منصوبوں کے لیے یورپ کی مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ایک بہت بڑا دھچکا تھا۔ لہٰذا انہوں نے متحد ہو کر یورپ کے مغربی علاقے میں سپین میں 1492ء میں مسلم اقتدار کا خاتمہ ہی نہیں کیا مسلمانوں کو بھی تہ تیغ کر دیا یا ملک بدر کر دیا۔

☆ مسلم اقتدار اور عثمانی سلطنت کا بنی اسرائیل پر اتنا خوف طاری تھا کہ انہوں نے کولمبس کے سفر امریکا (جس کا گائیڈ مسلمان تھا اور وہاں پہلے سے لوگ آباد تھے) کو بہانہ بنا کر کہ ایک نئی دنیا مل گئی ہے، اپنے انسان دشمن اور خدا بیزار سیکولر نظریات بغل میں دبائے امریکا فرار کا راستہ اختیار کیا (1498ء) اس علاقہ پر برطانیہ نے قبضہ میں کر لیا تھا، بعد میں جارج واشنگٹن وغیرہ کے ذریعے جنگ آزادی لڑی گئی اور برطانوی سامراج کو موجودہ امریکا آزاد کرنا پڑا۔ 1776ء کا سال اس کی آزادی کا سال ہے۔ اس کے بعد امریکی اکابرین نے مقامی آبادی کو تہس نہس کر دیا وہی امریکی جو کبھی برطانیہ کے خلاف جنگ آزادی لڑ رہے تھے جیسے ہم نے 1857ء اور 1947ء میں برطانیہ کے خلاف لڑی یا آج افغانستان کے عوام پہلے روسی اور اب امریکی قبضہ کے خلاف لڑ رہے ہیں تو وہ حق بجانب تھا اور ان کی تاریخ اس دور کے لیڈروں کی تعریفوں سے بھری پڑی ہے۔ مگر یہی امریکی قیادت جب ریڈ انڈین قبائل کو مار رہی تھی تو اس انسان دشمن اور اخلاق دشمن گروہ کے اصول بدل گئے کہ اب وہ دہشت گردوں کو مار رہے ہیں یا آج امریکا برطانیہ کی طرح علاقوں پر قبضہ کرتا ہے، مرضی کی حکومت بناتا ہے۔ عوام آزادی کے لیے لڑیں تو دہشت گرد کہلاتے ہیں۔ امریکا برطانیہ کے خلاف ہتھیار اُٹھائے تو حق بجانب اور امریکا علاقوں پر قبضہ کرے اور لوگ ہتھیار اُٹھالیں اور آزادی کے لیے کھڑے ہو جائیں تو عالمی اتحاد بن جائے اور یہ آزادی پسند لوگ دہشت گرد کہلائیں۔ اس سے بڑھ کر استعماری سوچ، ظالمانہ اندازِ فکر، انسان دشمن اور ابلیسی طرزِ عمل اور کیا ہو سکتا ہے۔

بنی اسرائیل نے سودی نظام کے اجرا کے ذریعے عالمی دولت پر قبضہ کیا اور بے پناہ وسائل ہاتھ آنے پر مستقبل کی حکومتوں کی تشکیل کے لیے اپنا منصوبہ ظاہر کرنے کے لیے اٹلی کے ایک دانشور میکاولی سے THE PRINCE کتاب لکھوائی۔ اس کتاب کے مطابق حکمران طبقہ، اس کا خاندان، فوج اور انتظامیہ کے اعلیٰ عہدیداروں کا ایک آسودہ حال طبقہ وجود میں لا کر ان کے ہاتھ میں ملکوں کی تقدیر دینا تھا نہ کہ کسی عوامی بہبود اور عدل و انصاف کے علمبردار کسی طبقہ کو۔ اسی سوچ کے مطابق یہود آج عالمی تجارت پر قابض ہیں اور دنیا بھر کے 184 ممالک میں آسودہ حال طبقات کے لیے لوٹ مار کے مواقع پیدا کرتے ہیں ان کی ضروریات کے لیے ملٹی نیشنلز کا قیام ہے جس کے ذریعے وہ ان PRINCES کی جسمانی اور مادّی ضروریات کی تسکین کا سامان کرتے ہیں اور اپنی تجوریاں بھرتے ہیں۔ گویا بنی اسرائیل حضرت محمد ﷺ کی تعلیمات کے مطابق درویش حکمران نہیں، پرنس اور منچلے شہزادوں کو حکمران طبقہ بنا کر دنیا پر حکمرانی قائم کرنا چاہتا ہے۔

☆ 1753ء میں بنگال میں جنگ پلاسی لڑی گئی۔ یہاں میر جعفر نے انگریزوں کا ساتھ دیا اور سراج الدولہ و مسلم حکومت سے غداری کی چنانچہ سراج الدولہ کو شکست ہوئی اور بنگال پر انگریزی اقتدار قائم ہو گیا۔

☆ 1799ء میں سلطان ٹیپو نے میسور کی ریاست کا دفاع کرتے ہوئے میر صادق کی غداری کے باعث شکست کھائی اور یوں انگریز 1802ء میں دہلی تک پہنچ گئے۔ انہوں نے مغلوں کو ہٹایا نہیں، علاقہ فتح نہیں کیا بلکہ حکومت مغل بادشاہ کی قائم رکھی مگر ایک انگریز عہدے دار بادشاہ کے ساتھ بیٹھتا تھا اور بادشاہ سلامت اس کی مرضی کے خلاف فیصلہ نہیں کر سکتا تھا اس کے مشورے سے سارے امور سرانجام دیتا تھا۔ اس انتظام میں سلطنت مغلیہ سمٹ کر دہلی تک رہ گئی۔ غلامی کے احساس میں مسلمانوں نے جنگ آزادی کے نام پر کوششیں کیں مگر وہ ناکام ہو گئیں چنانچہ 1857ء میں ناکامی کے بعد 1865ء تک مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف غداری کے نام پر سرسری سماعت کے بعد پھانسیاں دی گئیں اور بچوں اور بوڑھوں کے سوا اس علاقے کے تمام مسلمان ACTIVISTS کو تختہ دار پر چڑھا دیا گیا۔ 1860ء کے بعد جنوبی ایشیا تاجِ برطانیہ کے تابع ہو گیا۔

1914ء ___ 1918ء میں پہلی جنگ عظیم ہوئی۔ جرمنی اور برطانیہ کے علاوہ کئی

ممالک جرمنی اور برطانیہ کے اتحادی بنے۔ یہ روسی علاقہ کے تیرھویں قبیلہ کے صاحب ثروت اور سودی نظام میں پل کر جوان ہونے والے یہودی خاندان تھے، جنہوں نے جرمنی اور برطانیہ دونوں کو قرضے بھی دیے اور اپنے مفادات کا تحفّظ بھی کیا کہ جو بھی جیتے ان کے مفادات محفوظ ہوں۔ چنانچہ جرمنی ہار گیا تو اس کے اتحادی ترکی کو بھی تاوانِ جنگ دینا پڑا چنانچہ سلطنت کے مشرق وسطیٰ کے سارے علاقے برطانوی اتحادیوں میں بانٹ دیے گئے اور 1917ء میں برطانوی وزیر خارجہ بالفور کے ایک حکم کے مطابق فلسطین میں یہود کو 1900 سال بعد دوبارہ آباد ہونے کی اجازت مل گئی۔ ترکی صرف ایک ملک کی حیثیت سے باقی رہ گیا۔

بنی اسرائیل یہود نے 1897ء میں اپنے خاص منصوبے کے تحت عالمی حالات کو سازگار دیکھتے ہوئے اور اپنی گرفت مضبوط سمجھ کر 'اسرائیل' کے قیام کا صد سالہ منصوبہ بنایا۔ چنانچہ 20 سال بعد یہود کو سازشی انداز میں فلسطین میں آباد ہونے اور غیر منقولہ جائیداد خریدنے کی اجازت مل گئی اور دوسری جنگ عظیم 1939ء__1945ء کے بعد UNO بنی اور مئی 1949ء میں 'اسرائیل' کی ایک غیر حقیقی ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ 1949ء کے بعد بنی اسرائیل کی سرگرمیاں بہت تیز ہوگئیں ہیں۔ UNO کے نام سے اسرائیل کی عالمی حکومت قائم ہے اور دنیا بھر میں وہ بادشاہتوں، شہنشاہتوں اور مراعات یافتہ طبقات پیدا کر کے اور ان کو اقتدار کا لالچ دے کر در پردہ اپنا اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہے۔ ڈالر اس عالمی حکومت کی کرنسی ہے اور اس UNO کے پانچ ممالک مستقل ارکان ہیں جنھیں کسی بھی فیصلے کو انفرادی سطح پر ویٹو کا اختیار ہے۔ ان پانچ ممالک کی موجودہ حکومتیں، اپوزیشن اور آئندہ پچاس سال کے متوقع لیڈر شپ سب 'یہود' کے قبضے میں ہے لہٰذا UNO کسی عالمی جھگڑے کے تصفیے میں دلچسپی کم رکھتی ہے اور اسرائیلی مفاد سب سے مقدم رکھتی ہے اور یہ انسانیت کی تاریخ میں حضرت انسان کی سب سے بڑی تذلیل ہے اور یہ دور بنی اسرائیل کے لیے اچھا اور غیر بنی اسرائیلیوں کے لیے ذلت و رسوائی کا ہے۔

8000 سال کا انسانی اجتماعیت کا ارتقائی سفر
اور ریاست اسرائیل کا قیام

صدیوں کے اس اجتماعی سفر میں انسانیت نے اپنے اجتماعی امور کی نگرانی اور ہر انسان کی بلا لحاظ رنگ و نسل و زبان و علاقہ و مذہب، عزت و آبرو اور جان و مال کے تحفظ کی ذمہ داری ایک طبقے کے حوالے کی تھی اس طبقے کی کفالت اس اجتماعیت میں موجود انسانوں کے ذمے ڈالی گئی تھی۔ دیانت و امانت اور غیر جانبداری سے غور کریں تو اس اجتماعیت کے نام، اصطلاحات اور کارکردگی کے سادہ ترین اصول جو تخلیقی طور پر فطرت انسانی میں ودیعت کردہ ہیں وہ یہ ہیں:

(i) یہ قیادت اہلیت کی بنیاد پر ہو۔

(ii) وہ جسمانی اور عقل و فکر کے اعتبار سے اچھی (ABOVE AVERAGE) صلاحیتوں کا مالک ہو۔

(iii) انتظامی قابلیت رکھتا ہو۔

(iv) انسانی معاملات اور پیچیدگیوں کو سمجھتا ہو اور تجربہ کار ہو۔ اتنی عمر کا ہو کہ زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق ناگزیر علم اور تجربہ رکھتا ہو۔ جھگڑے چکانے اور فریقین میں صلح کرانے اور اختلاف کو رفع کرنے کی صلاحیت کا حامل ہو۔

(v) علمی ذوق اور اعلیٰ نظریات رکھتا ہو۔ رنگ و نسل، برادری، زبان، علاقہ اور مذہب سے بلند ہو کر ماتحتوں سے حسن سلوک کر سکتا ہو۔

(vi) اندرونی اختلافات خوش اسلوبی سے طے کر سکتا ہو۔

(vii) بیرونی دوسری اجتماعیّتوں سے متنازعہ امور، صلح، جنگ اور خصومات کے رفع کرنے میں

شجاعت، امانت، دیانت اور اعلیٰ کردار کا مظاہرہ کر سکے۔

(viii) عادل ہو، منصف مزاج ہو، بلا رو رعایت حق دار کو اس کا حق دلا سکے اور حق وصول کرنے کے لئے بڑے سے بڑے انسان پر گرفت کر کے حق وصول کر سکے۔ وغیرہ وغیرہ

اس سردار، حکمران یا چیف کو اجتماعی معاملات کی نگرانی کے لیے عوام سے ٹیکس وصول کرنے کا حق ہے اور اس میں سے وہ اپنے ذاتی اخراجات اوسط درجے کے شہری کے معیار پر وصول کر سکتا ہے اور دوسرے ہمہ تن مصروف اہل کاروں کے لئے ضابطے اور قانون کے مطابق مشاہرے مقرر کر سکتا ہے۔ اس اجتماعی آمدنی سے فوج، عوامی بہبود کے کام، تعلیم، پولیس، محاصل کی وصولی کا عملہ، عدالتی عملہ، جج وغیرہ وغیرہ کے اخراجات امانت، دیانت سے کرنے کا اہل ہو۔

(ix) رعایا کے صاحب ثروت سے ٹیکس لے کر اور رعایا کے معذور، بے کس، یتیم، مسکین، بیوائیں، بیمار اور بے روزگار افراد کی دیکھ بھال کرنے کا انتظام کر سکے۔ رعایا کو مساوات کی نگاہ سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

(x) ذاتی زندگی میں رذائل اخلاق اور بے حیائی کے کاموں سے اجتناب کرنے والا ہو۔

اجتماعیت کے اس سفر میں لاکھوں سردار اور حکمران، ہزاروں بادشاہ و شہنشاہ اور لاتعداد راجے مہاراجے گزرے ہیں اوپر درج فطری معیار پر کتنے حکمران یا چیف پورے اترے اس کا میزانیہ اور گراف غیر تسلی بخش ہی ہے۔ تا آنکہ آسمانی ہدایت کے نمائندے حضرات داؤد اور سلیمان علیہما السلام نے حکومت سنبھالی اس کے بعد آنے والوں نے حکمرانی اور جہانبانی کے ان نمونوں کی پیروی کرنا در کنار اپنے لئے اس کو اپنانے کا اعتراف کرنا ہی اپنی ہتک اور کسر شان سمجھا ہے۔

اس ارتقائی سفر میں اللہ تعالیٰ نے ایک بے مثال نمونہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں اتار دیا جن کی زندگی قابل تقلید اور ان کی تعلیمات قابل عمل تھیں۔ اس کی گواہی خلافت راشدہ کے 30 سالہ مثالی عوامی دور حکومت میں درویش بادشاہت اور درویش انداز جہانبانی کے زندہ نمونے ہزاروں کی تعداد میں انسانیت کے سامنے تھے۔

خلافت راشدہ 632ء تا 660ء کے حکمرانوں نے انسانی سطح پر کام کر کے حضرت

محمد ﷺ کی تعلیمات کی افادیت، عملیت، سادگی اور نتیجہ خیزی کا ایسا ٹھوس ثبوت دے دیا کہ پچاس لاکھ مربع میل رقبے کی حکومت کامیابی سے چلا کر دکھا دی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں ایک عورت زکوٰۃ کی رقم لے کر بازار میں اعلان کر رہی تھی کہ کوئی مستحق ہے تو لے لے ____ مگر کوئی لینے والا نہیں تھا۔ اتنا آسودہ حال معاشرہ اور اتنا امن وسکون، سبحان اللہ۔

ہم مسلمانوں کو تسلیم ہے کہ بعد کے چھ سو سالوں میں اس اعلیٰ معیار کے حکمران نہ پیدا ہو سکے مگر معیار تو قائم تھا اور لوگ برملا ٹوکتے تھے اور احساس دلاتے تھے اور حکمرانوں کو اپنی غلطیوں، کوتاہیوں اور بداعمالیوں کا احساس ہوتا تھا پھر بعض نے توبہ کر کے اصلاح قبول کر لی۔ یہی عملاً انسانی تاریخ میں ممکن ہے۔

تاریخ میں مسلمانوں کو زوال آیا تو گویا حضرت محمد ﷺ کی تعلیمات پس پردہ چلی گئیں۔ یورپ جاگ اٹھا اور سپین کی مسلم یونیورسٹیوں سے حاصل کردہ علم کی روشنی میں یورپ میں علمی، فنی اور صنعتی انقلاب آ گیا اور ایجادات کا سیلاب امڈ آیا جس سے یورپ دنیا بھر میں وسائل کے اعتبار سے اور عسکری اعتبار سے آگے نکل گیا اور سیاسی طور پر مضبوط ہو کر دنیا کے تمام ممالک پر قابض ہو گیا۔ کہیں براہ راست قبضہ تھا اور اکثر مقامی حضرات غلام بنا لیئے گئے۔

تا آنکہ بیسویں صدی کے وسط مسلمانوں کے اجتماعی زندگی کی علامت 'خلافت' کا 1924ء میں خاتمہ ہو گیا اور مغرب کی آگے بڑھ کر اپنا طرز حکمرانی اور انداز جہانبانی کا ماڈل پیش کر دیا اور اسرائیل کا قیام عمل میں آ گیا جس کے بعد سے اب مغربی تہذیب (جو بنی اسرائیل کی زیر قیادت ہے) کا اجتماعی زندگی کا نمونہ ہی پبلک لائف یا ریاستی سطح پر رول ماڈل کا منظر پیش کر رہا ہے۔

مغرب میں ریاست کے رول ماڈل تک کے سفر میں ایک علمی وفکری بددیانتی کا عنصر

☆ انسان اور انسانیت کی فطرت اور خمیر جن اجزا سے بنایا گیا ہے کہ اس میں ہر بعد میں آنے والے انسان، قبیلے، معاشرے اور ریاست کا اپنے سے پہلے اور پیشرو انسان، قبیلے،

معاشرے اور ریاست کے تجربات سے استفادہ اور ___ خذ ما صفا و دع ما کدر (انسانیت کے لئے فلاح و بہبود کی چیز لے لو اور اجتماعیت کو نقصان پہنچانے والی چیزوں کو چھوڑ دو) کے اصول پر اچھائیوں کو سمیٹ کر اور کوتاہیوں اور غلطیوں سے بچ کر بلندیوں اور ارتقائی سفر جاری رکھنا شامل ہے۔

تاریخ کے صدیوں کے سفر میں بالعموم ایسا ہی ہوا ہے اور یہی واحد قابل عمل راستہ ہے۔

☆ افسوس کہ نامعلوم وجوہات (جن کا تذکرہ بالعموم مغربی تہذیب کے مورخین اور دانشور نہیں کرتے اور کتمان حق کرتے ہیں) کی بنا حضرات داؤد اور سلیمان علیہما السلام کا طرز حکمرانی اور اس کے صدیوں بعد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت للعالمینی کا مظہر انسان دوست، اخلاق دوست اور خدا شناس طرز حکمرانی اور انداز جہانبانی کے نمونے کا تذکرہ چھپا دیا جاتا ہے اور انسانیت کو اس کے ایک محسن سے دور رکھا جاتا ہے جس نے ان کے لئے ایسا بے مثال نمونہ دیا جو ہر قسم کے استحصال سے پاک ہے، درویش حکمرانوں اور بے غرض بادشاہوں کی طرف رہنمائی کرتا ہے اس کا تذکرہ آج مغرب کے تعلیمی اداروں، یونیورسٹی، توسیعی لیکچروں، میڈیا کے معلوماتی پروگراموں اور لائبریری کی کتابوں سے بھی محو کر دیا گیا ہے کہ کوئی جنونی (FANATIC) اس حکومتی و ریاستی ماڈل تک رسائی حاصل نہ کر سکے۔ اور یہ امتیاز صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور ان کے زیر اثر سامنے آنے والے دور خلافت راشدہ اور اس کے قدموں کے نشانوں پر اچھے مسلمان بادشاہوں کے تذکروں کے بارے میں خصوصیت سے روا رکھا گیا ہے جبکہ دوسرے مذاہب اور فلاسفر کی تعلیمات اور پیروکاروں کے بارے میں کوئی تعصب یا امتیاز نہیں رکھا گیا۔ اس علمی و اخلاقی بددیانتی کی وجہ کیا ہے یہ تفتیش طلب اور تحقیق طلب مسئلہ (ISSUE) رہے گا یہاں تک کہ اس کا کوئی شافی اور اطمینان بخش جواب نہ مل جائے۔

یہ بات صاف عیاں ہے کہ اس سارے منظر نامے کے پیچھے کوئی طاقت اور گروہ ہے جو خدا بیزار خیالات کا حامل ہے اور وحی دشمن ہے لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ وہ خلافت راشدہ کے اتنے اچھے درویش حکمرانوں کے انسان دوست، علم دوست، اخلاق دوست اور ماحول دوست نمونوں کو بالارادہ نظر انداز کر کے تاریخ میں والیٹر اور روسو سے پھلانگ کر سیدھے یونانی فلاسفہ کے اخلاق

سوز، خدا بیزار فلسفوں تک جا پہنچتے ہیں۔ اے اللہ اس راز سے جلد پردہ اٹھادے۔ (آمین)

اکیسویں صدی میں انسانی اجتماعیت ___ یا ___ ریاست کے خدوخال

انسانی اجتماعیت کے ارتقائی اور تکمیل (IDEAL) کے تصور تک کے سفر میں مغرب جس تصور تک پہنچا ہے اور جس کو برملا بیان کر رہا ہے یہ انسان کی صدیوں کی محنت کا حاصل ہے افسوس اس بات کا ہے اس میں یونانی دور کے دیومالائی، بت پرستانہ اور مشرکانہ بادشاہوں اور بداخلاق، بدکردار، عیاش فلاسفہ اور ان کے شاگردوں کے سیکولر اور لبرل تصورات کو تو جگہ دی گئی جبکہ خلافت راشدہ کے بے غرض، مخلص، دیانت دار، اعلیٰ ذاتی کردار کے مالک، بہترین منظّم، بہترین مدبر، بہترین سپہ سالار، عادل، منصف اور سادہ عام آدمی کی سطح پر زندگی گزارنے والے درویش حکمرانوں کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ یہ عمل آج کے مغرب کی خلافت راشدہ سے کیا، آج کے انسان سے دشمنی ہے اور علم و اخلاق، غیر جانبداری اور لبرل ازم کے نام پر انسانیت کا خون اور تذلیل ہے اور سارے علمی کارناموں کا حاصل عام انسانوں کو لوٹ کر حکمرانوں اور ان کے سرپرستوں، چند ملٹی نیشنلز، چند بینکرز اور معاشرے کے 0.00001 فی صد طبقے کے مفادات کا تحفظ ہے۔ جبکہ دعویٰ جمہوریت اور نام عوام کا ہے مگر عام آدمی کا ہر سطح پر استحصال ہے اور دھوکا ہے اور اس سے حقیقی عوامی بادشاہت یا آسمانی بادشاہت یا درویش بادشاہوں اور درویش حکمرانوں کا ریاستی اور حکومتی ماڈل چھپایا جا رہا ہے۔ حقیقت ہے کہ چھپانے کا یہ عمل اور دنیا بھر کے عوام کو دھوکا کب تک چلے گا اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

ریاست کا جدید ماڈل

آج کی ریاست کیا ہے؟

اکیسویں صدی میں ریاست کسی علاقے یا TERRITORY میں رہنے والے لوگوں کی اکثریت کی اجتماعی خواہش (WILL) کا نام ہے جس کی وجہ سے وہ لوگ آپس میں جڑے ہوئے ہیں یا جو چیز ان کے درمیان اعلانیہ طور پر قدر مشترک ہے۔

1 یہ قدر مشترک صرف علاقہ ہوسکتا ہے، یہ زبان ہوسکتی ہے یہ قدر مشترک کوئی نظریہ یا

مذہب ہوسکتا ہے، کوئی فلسفیانہ نقطۂ نظر بھی قدر مشترک ہوسکتا ہے جیسے جرمن قوم، جاپانی قوم یا بنگالی زبان کی بنیاد پر بنگلہ دیش، پاکستان کے عوام میں قدر مشترک اسلام ہے۔ یا سیکولرازم، لبرل ازم یا بیسویں صدی میں کیمونزم یا سوشلزم کے نظریات تھے۔

یہ قدر مشترک اس اجتماعیت کا نظریہ کہلاتا ہے۔

1۔ آئین

ہر ریاست علانیہ/تحریری یا غیر علانیہ/زبانی کوئی آئین رکھتی ہے۔ یہ آئین کچھ ایسے اصول وضوابط اور قاعدوں کلیوں کا مجموعہ ہوتا ہے جو اس اجتماعیت کے افراد کے نظریات، تاریخ، تجربات، نصب العین، حوصلوں اور اُمنگوں کے آئینہ ہوتے ہیں۔ اس میں حکومت کرنے کے اصول، حکومتوں کے بدلنے کے اصول، اجتماعی نصب العین، اہداف اور دیگر چند امور ہیں جو طے شدہ ہوں کہ ہر کوئی اس کے اندر کام کر رہا ہو خلاف ورزی ہو لوگ چونک جائیں اور اس کی اصلاح یا RECTIFICATION کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔

آئین میں ہی ریاست کا ڈھانچہ اور بہت سے اداروں کی تشکیل اور کام اور اختیارات کا تعین ہوتا ہے۔

2۔ عام طور پر آج ریاست کے درج ذیل ناگزیر پر 'ستون' (PILLARS) کہلاتے ہیں کہ ان پر ریاستی ڈھانچہ استوار کیا جاتا ہے۔

(ا) انتظامیہ (ADMINISTRATION)

سرکاری عہدیداروں کی وہ مشینری جو ریاست کے جملہ معاملات کا انتظام چلاتی ہے وزیراعظم، وزراء، مرکزی وصوبائی سیکرٹری حضرات اور صوبائی سطح کے عہدیدار پھر ضلعی اور تحصیل لیول کے عہدیداران اور ان کا ضروری عملہ۔

صدر کا عہدہ عوامی ہوتا ہے جو ملک کے تمام اداروں کی نگہبانی کرتا ہے کہ وہ تمام ریاستی ادارے اپنے اپنے آئینی دائرہ کار کے اندر کام کرتے ہیں۔

(ب) مقنّنہ (LEGISLATURE)

آئین کے مطابق وجود میں آنے والا یہ ادارہ ملک میں حسب ضرورت آئینی حدود

کے اندر اور آئین کی روح کے مطابق قانون سازی کا مجاز ادارہ ہوتا ہے۔ اس ادارہ کے ارکان اور ان کی اہلیت آئین میں طے کردہ ہوتے ہیں۔

(ج) فوج (ARMED FORCES)

ملکی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں کی نگرانی و حفاظت کرنا اور ضرورت پڑنے پر دوسرے ملکوں سے جنگیں کرنا ہوتا ہے۔ ملک کے اندر بھی ناگہانی آفات اور کسی شدید ضرورت کے تحت فوج کو اس کام پر مامور کیا جا سکتا ہے۔ عام طور پر فوج آئین میں طے شدہ اصول کے مطابق صدر یا وزیراعظم کے ماتحت ہوتی ہے۔

(د) میڈیا (MEDIA)

مغرب کے جدید ملکوں میں اب آزاد میڈیا کو بھی ریاست کا ایک ستون سمجھا جا رہا ہے کہ میڈیا (اخبارات رسائل وغیرہ اور ریڈیو ٹی وی چینلز اور صحافتی عملہ) ملکی اداروں پر نگاہ رکھتا ہے کہ ان کی کارکردگی کیا ہے اور کیا وہ اپنے آئینی حدود میں کام کر رہے ہیں۔

(ہ) عدلیہ (JUDICIARY)

آئین کے تحت اعلیٰ عدلیہ (SUPREME COURT) مرکزی سطح پر اور ہائی کورٹس (HIGH COURTS) صوبائی سطح پر تشکیل پاتی ہیں۔ ان عدالتوں کے تحت صوبائی سطح پر پورا ڈھانچہ نیچے تحصیل کے انتظامی لیول تک موجود ہوتا ہے۔

عدلیہ کا کام آئین کا قانونی تحفظ اور تمام ریاستی اداروں کا اپنے دائرہ کار میں کام کرنا اور دوسرے اداروں کے دائرہ اختیار سے مداخلت نہ کرنے کی نگرانی کرنا اور مقنّنہ کی قانون سازی کو آئین کی نگاہ سے دیکھتے رہنا ہے۔

(ز) نظریہ (IDEALOGY)

ہر ریاست ایک نظریہ اور کائنات کے اس وسیع نظام کے بارے میں ایک نقطۂ نظر رکھتی ہے، کچھ ریاستوں کا نظریہ اتنا بودا اور ناقابل بیان ہوتا ہے کہ وہ اس کو بیان نہیں کرتیں یا اعلان نہیں کراتیں اور نہ تحریری طور ہر آئین میں درج کرتی ہیں بلکہ سینہ بہ سینہ چلاتیں ہیں اور وہ اپنے نظریہ خفیہ رکھنا چاہتی ہیں۔ جبکہ کچھ ریاستیں بڑا مدلل، منطقی اور واضح نصب العین اور نظریہ رکھتی ہیں

(جو اس ریاست کی حدود میں رہنے والے لوگوں کے حسن ذوق اور حسنِ تخیل کا مظہر ہوتا ہے) وہ اپنے آئین میں اس کا تذکرہ بھی کر دیتی ہیں۔ پہلے قسم کی مثال سیکولرازم اور لبرل ازم کا نظریہ ہے جو انسان کو حیوانی سطح پر پہنچا دیتا ہے کہ انسان لباس، شرم وحیا، اخلاقی اقدار (MORAL VAUES) اور رشتوں کی تمیز سب بھول جاتا ہے بس حیوانوں کی سطح پر زندگی بسر کرتا ہے آج کی تمام یورپی اور مغربی ریاستیں اسی سیکولرازم کے تحت زندگی گزار رہی ہیں۔ بعض دیگر ریاستیں بھی انہیں کے زیر اثر اور تقلید میں سیکولرازم اور لبرل ازم (روشن خیال) کے راستے پر ہی چل رہی ہیں۔

برطانوی ریاست کا نظریہ تو آئین میں کیا درج ہوگا انہوں نے دنیا میں استعماری طاقت کے لئے جو راستے اختیار کئے اور آئندہ کرنے ہیں ان کا تذکرہ ہی شرمناک ہے۔ لہٰذا وہ ریاستی سطح پر اس کام کو جائز قرار دینے کے لیے تیار رہتے ہیں جو ان کے غیر علانیہ نظریہ کے مطابق ہو۔ لہٰذا برطانوی نظریہ تو کیا ان کے آئین کا اکثر حصہ بھی خفیہ اور زبانی روایات پر ہے۔

علانیہ نظریاتی ریاست پاکستان ہے یا (کسی درجے میں) ریاست اسرائیل ہے۔

ہمارے نزدیک نظریہ ریاست کے استحکام اور ترقی کے لئے سب سے اہم ستون ہے اور اسی ستون کی بدولت باقی سارے ستون اپنی جگہ پر قائم اور صحیح کام کرتے ہیں۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک نظریاتی ریاست (جیسے پاکستان) کا ہر ادارہ نظریۂ پاکستان کے مطابق اور اس کی روشنی میں اپنا کام کرے، اس ملک کا نظامِ تعلیم بھی اس نظریہ کی آبیاری اور فروغ کے لیے مستعد اور بیدار ہو۔

مثال کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ خاندان کی سطح پر عورت اور مرد کی ذمہ داریاں فطرت نے معین کر دی ہیں اور ان کی جسمانی ساخت سوچ اور امنگیں اور خواہشات کے ساتھ پسند ناپسند بھی ایسی ہی بنا دی ہیں جو ان کی فطری ذمہ داریوں سے کامل مطابقت رکھتی ہیں۔ اہل علم جانتے ہیں کہ خاندان میں مرد و عورت یا ایک فیملی میں بالعموم شوہر، بیوی اور بچے ہی ہوتے ہیں گھر کے بارے شوہر کی ذمہ داری کمانا اور گھر چلانا ہے اسلام میں (اور فطرتاً) عورت کے ذمے کمانا نہیں ہے عورت کی ذمہ داری گھر کی چار دیواری میں شوہر کی آمدنی اور وسائل کے اندر گھر کی مالکن بن کر حسنِ انتظام سے اس گھر کو خوشیوں سے بھر دے اور خوبصورت بنا دے اور اپنی اولاد کی صحیح نظریے کے مطابق تربیت کرے تاکہ وہ نظریہ زندہ رہے گویا صحیح کہا جاتا ہے کہ مرد کے ذمے کسی خاندان کا

'حال' ہے اور کے ذمے اس قوم کا مستقبل۔

بعینہٖ اسی طرح فوج اور عدلیہ کسی ملک کے حال کو صحیح کرنے اور راہ راست پر رکھنے میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں جبکہ کسی نظریاتی ریاست کے لئے اس کا نظامِ تعلیم اس ریاست کے باسیوں کو صحیح نظریہ دینا اور ان کے سیرت و کردار میں (ماں کی تربیت کے علاوہ) ملک کے نظریہ کو کوٹ کوٹ کر بھر دینا ہے۔ لہٰذا ____ جتنی اہمیت کسی ملک کے لئے فوج کی ہے اتنی ہی اہمیت اس کے نظریہ کا تسلسل ہے یعنی نظامِ تعلیم۔ تاکہ اس ملک کا نظریہ نسل در نسل صحیح طور پر قائم رہے اور اسی نظریاتی تسلسل کے ذریعے وہ ریاست ترقی کرے اور پھیلے اور پھولے۔

ریاست کے بارے میں ایک اور اہم بات یہ ہے کہ انتظامیہ ہو یا مقنّنہ، عدلیہ ہو یا نظامِ تعلیم ان سب میں یا کسی ایک عضو یا ریاستی ستون میں کمزوری یا اضمحلال آجاتے ہیں تو ابتدائی حالتوں میں کوئی فرق نہیں پڑتا اہل علم کو بھی کئی سال لگ جاتے ہیں کہ کسی شعبے میں کمزوری آرہی ہے چہ جائیکہ عوام۔

لیکن انتظامیہ کمزور اور عدلیہ کمزور ہو یا ملک میں سیاسی بحران کی کیفیت پیدا ہو جائے تو انتظامیہ بھی ہاتھ کھڑے کر سکتی ہے اور استعفیٰ دے سکتی، عدلیہ بھی قلیل تعداد میں لوگ ہوتے ہیں انصاف نہ رہے تو وہ بھی بے دست و پا ہو جائیں گے ان کے پاس حالات کو قابو کرنے کے لئے کوئی عملی متوازی راستہ نہیں ہوتا۔ جبکہ فوج کے لئے یہ کام کوئی اضافی کام نہیں کہ وہ ریاستی اداروں کو آپس میں لڑتے دیکھیں۔ ملک میں کرپشن کو دیکھیں یا انتظامیہ اور ملکی قیادت کو دیکھیں کہ وہ ملک کو نقصان پہنچانے والی پالیسیوں پر عمل پیرا ہیں بظاہر اصلاح احوال کی کوئی سبیل نظر نہیں آرہی ____ تو فوج کا ایسی صورت حال میں مداخلت کرنا اور حالات کو صحیح کر دینا ضروری ہی نہیں ____ فوج کے ادارہ کی اضافی غیر تحریری آئینی ذمہ داری بھی ہے (تفصیلات کا موقع نہیں ہے وہ پھر کسی تحریر میں سامنے آسکتی ہیں)

بنی اسماعیل اور بنی اسرائیل کی کشاکش
___ کا ایک اہم پہلو ___

قارئین کرام! گزشتہ باب میں تاریخ بنی اسماعیل اور بنی اسرائیل پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ مختصراً گزشتہ چودہ صدیوں کی تاریخ بنی اسماعیل اور بنی اسرائیل کی باہمی کشاکش اور آویزش کی تاریخ ہے۔

ذیل کی سطور میں اس آویزش کے نظریاتی پہلو پر تھوڑی مزید گفتگو پیش خدمت ہے:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اُمتوں کی تاریخ چونکہ کئی اعتبارات سے مشترک ہے ان کی کتاب (BIBLE) مشترک، انبیاء کرام علیہم السلام کا سلسلہ مشترک بلکہ تورات LAW اور انجیل حکمت ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ جملہ بڑا معنی خیز ہے کہ "DO NOT THINK I HAVE CAME TO DESTROY LAW"

''یہ مت خیال کرنا کہ میں تورات کو ختم کرنے آیا ہوں، بلکہ اس پر عمل درآمد نہیں ہو رہا اس کے احیاء کے لئے آیا ہوں''۔ اس لئے کہ عیسائیت میں تو شریعت ہے ہی نہیں ان کی شریعت (LAW) تو شریعت موسوی ہی تھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کا دور ملا کر 1340 ق م سے 600ء تک 2000 سال بنتا ہے گویا اس اُمت کا ایک ہزار سالہ دور ہوتا ہے (اس اصول پر اور بھی قرائن موجود ہیں) لہٰذا بنی اسرائیل نے تاریخ بنی اسماعیل پر نگاہ رکھتے ہوئے مغلیہ دور میں بڑی چالاکی سے اکبر کو بغیر کسی روایتی تعلیم کے کم سنی میں آٹھ سال کی عمر میں ایک عظیم سلطنت کا حکمران بنا دیا۔ اہل علم سمجھ سکتے ہیں اتنی عظیم سلطنت کا حکمران آٹھ سالہ بچہ بنا دینا کیا معنی رکھتا ہے گویا پس پردہ ایک مافیا ہے۔ کہنے کو

اس حکومت کو خاندانِ مغلیہ کے تسلسل کی SANCTITY حاصل ہے اور عملاً ہر سیاہ وسفید کا مالک وہ مافیا ہے جو ریاست کو جس طرف چاہے لے جائے اور جس طرح کے چاہے فیصلے کرے۔

لہٰذا ___ یہی ہوا کہ نظریاتی خلفشار ہوا اور اکبر کے ذہن میں اس مافیا نے (جو آج کی سیکولر سوچ اور روشن خیالی کے نظریات کی طرح تھا) یہ بات ڈالی کہ ہر امت کا دور ایک ہزار سال کے لئے ہوتا ہے اور وہ ہزار سال 95-1594 ہیں پورے ہو گئے لہٰذا ___ اسلام کی تعلیمات اب از کار رفتہ ہو چکیں اب دنیا کو نئے دین کی ضرورت ہے۔ اکبر کو اپنی سلطنت کی یکجہتی عزیز تھی لہٰذا عیسائیت، یہودیت، ہندومت اور سکھ مت کے علاوہ اسلام کی بھی کچھ چیزیں جمع کر کے ایک نیا دین 'دین الٰہی' جاری کر دیا گیا، یوں اکبر اسلام سے مرتد ہو گیا اور اس کا اور اس پر ایمان لانے والوں کا بھی دین سے کوئی تعلق نہ رہا۔

(جیسے دور حاضر میں جو شخص امریکی شہریت کے لئے درخواست دیتا ہے اسے آخری مرحلہ پر عدالت میں پیش ہو کر ایک حلف اٹھانا پڑتا ہے جس کے الفاظ NET پر موجود ہیں کہ..... میں امریکہ کے قانون کو سپریم لاء سمجھوں گا اور امریکہ پر کوئی برا وقت آیا تو اس کے آئین اور مفادات کے تحفظ کے لئے ہتھیار اٹھاؤں گا.....(مفہوم)۔ اس حلف اٹھانے والے نے بھی اسلام کے کلمہ شہادت کے بعد امریکی کلمہ پڑھ کر اسلام سے اعلان بیزری کر دیا۔ کینیڈا اور دوسرے مغربی ممالک کی شہریت کے بھی اسی سے ملتے جلتے اصول ہیں۔ ادارہ)

اس موقع کی مناسب سے محسن انسانیت اور انسانیت کو اجتماعیت کا ایک عوامی کامل نمونہ دینے والے حضرت محمد ﷺ کا ایک فرمانِ حق ترجمان سامنے لانا ضروری ہے جو انسانیت کے مسائل کے حل کے لئے بڑا بنیادی قدم شمار کیا جا سکتا ہے:

عَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِی وَقَّاصٍ، أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ: اِنِّی لَأَرْجُو أَنْ لَا تَعْجِزَ أُمَّتِی عِنْدَ رَبِّهَا أَنْ يُؤَخِّرَهُمْ نِصْفَ يَوْمٍ، قِيلَ لِسَعْدٍ: وَكَمْ نِصْفُ ذَالِكَ الْيَوْمِ؟ قَالَ: خَمْسُ مِائَةِ سَنَةٍ (ابوداود)

''حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: مجھے امید ہے کہ میری اُمت اپنے ربّ کے سامنے اتنی عاجز نہیں ہوگی کہ وہ اسے آدھے دن

کی مہلت دے دے۔ حضرت سعدؓ سے پوچھا گیا یہ آدھا دن کتنا ہوگا؟ آپ نے فرمایا: 500 برس۔''

سابقہ درج دلائل کی بنیاد پر اکبر کو در پردہ قوتوں نے نئے دین کی ایجاد پر اکسایا تو یہ ایک بڑی مہم جوئی (ADVENTURE) قرار دی جاسکتی ہے اور اگر حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ کی روایت کے علم کے باوجود یہ مہم جوئی کی گئی تو بنی اسرائیل اور اُن کی حالی موالی قوتوں کی دیدہ دلیری ہی قرار دی جاسکتی ہے۔

باب 6

☆ اُمت مسلمہ کو عطا کردہ اضافی نصف دن 177

☆ عصر حاضر میں نظریاتی مسلمان ریاستیں
اور رُوحِ عصر کے تقاضے 185

اُمت مسلمہ کو عطا کردہ
اضافی نصف دن

یہ 'نصف دن' محسن انسانیت ﷺ کی دُور نگاہی، امت مسلمہ کا اعزاز، دنیا میں درویش بادشاہت کے آرزو مند منصف مزاج انسانوں کی دلجوئی اور بنی اسرائیل کے انسان دشمن، خدا بیزار، وحی دشمن اور اخلاق دشمن رویّوں کا تریاق ہے۔

'دین الٰہی' کا یہ فتنہ اور امت مسلمہ کے ایک فرد کے ہاتھوں ہی دین اسلام کے قلعے میں رخنہ اندازی کا یہ منحوس عمل، فاطر فطرت نے اسلام کے مراکز (مکہ اور مدینہ) سے ہزاروں میل دور جنوبی ایشیا کے قلب دہلی کے آس پاس آباد مسلمانوں کی آزمائش لئے ان کا مقدّر کر دیا۔

یہ بات بھی طے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کے لئے آزمائشیں حوصلہ شکنی کے لئے نہیں آتیں بلکہ ان آزمائشوں پر صبر و استقامت کے نتیجے میں درجات کی بلندی کے لئے آتی ہیں۔ بقول شاعر

تندیٔ باد مخالف نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لئے

حقیقتاً 'فتنۂ اکبر' اور فتنہ 'دین الٰہی' بھی جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے لئے ایک نعمت (BLESSING IN DISGUISE) کا روپ دھار گیا اور اللہ تعالیٰ کی مشیت نے حالات کے دھارے اور تاریخ کا رخ موڑ کر جنوبی ایشیا کی طرف کر دیا۔

☆ 1000ھ سے پہلے مجدد دین کا مبارک سلسلہ اسلام کے روحانی سیاسی مراکز مکہ و مدینہ، بغداد، دمشق کے آس پاس سایہ فگن رہا، مگر اسلام کی تاریخ کے اضافی نصف دن یعنی 1001ء کے

بعد مجدد دین امت کا ایک اہم سلسلہ بھی ''جہاں پھوڑا ہو وہیں مرہم رکھا جاتا ہے'' کے مصداق جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کا مقدّر بنا۔

☆ چنانچہ اکبر بادشاہ سیاسی طور پر تو کامیاب رہا اور غیر مسلم دنیا کی آنکھوں کا تارا بھی بن گیا بلکہ ہندوؤں میں تو 'مغل اعظم' اور سیاسی دیوتا کا درجہ اختیار کر گیا مگر مسلمانوں کی نگاہ میں ہیچ رہ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس فتنے کی سرکوبی کے لئے دہلی کے شمالی علاقہ سرہند سے ایک نابغہ روزگار ہستی حضرت مجدد الف ثانی کو میدان میں اتار دیا اور اسے حسن اتفاق ہی کہئے کہ انہوں نے اپنے آپ کو 'مجدّد' اور 'دوسری ہزاری' کا مجدّد کہلوانا پسند فرمایا (عربی میں ہزار کے لئے الف کا لفظ بولا جاتا ہے)

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے اس فتنے کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اس فتنے کے غبارے سے ہوا نکال دی اور یہ فتنہ اکبر کے ساتھ ہی دفن ہو گیا۔ اکبر کی موت سے مسلمانوں سے زیادہ فتنہ پرور قوتوں کو دکھ پہنچا اور ان کے ہاں صف ماتم بچھی رہی۔ اس فتنۂ ارتداد کے بچے کھچے اثرات حضرت مجدد الف ثانی کے ہاتھوں پر جہانگیر بادشاہ کی توبہ سے، زائل ہو گئے۔ حضرت مجدد الف ثانی کی طرح دوسری اہم شخصیت شیخ عبدالحق محدث دہلوی ہیں جنھوں نے حضرت مجدد الف ثانی کے ساتھ مل کر مثبت انداز میں اسلام کے احیاء کی کوشش کو آگے بڑھایا۔

1602ء میں انگلستان (برطانیہ) میں جنوبی مشرقی ایشیا میں نوآبادیاتی نظام کی کامیابی کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی وجود میں آئی اور بنک آف انگلینڈ بھی تشکیل پایا۔ گویا سودی نظام اور دنیا کے غیر ترقی یافتہ علاقوں پر قبضہ اور لوٹ مار یہ دونوں پروگرام برطانیہ میں بیک وقت شروع ہوئے اور یہی برطانیہ کا ریاستی نظریہ اور UNWRITTEN آئین ہے جسے آج تک وہ لے کر چل رہا ہے۔ جہانگیر کے عہد میں مغل بادشاہ سے درآمدی ٹیکس معاف کرایا اور اس ٹیکس معافی کی آڑ میں بدعہدی کر کے اسلحہ لانا شروع کر دیا اور زمینیں خرید کر چھاؤنیاں بنانا شروع کر دیں۔ تا آنکہ 1753ء میں جنگ پلاسی میں کامیابی کے بعد بنگال پر قبضہ کر لیا۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے شاہی خاندان اور مغلیہ دور کے مراعات یافتہ طبقہ میں کام کیا اور اس مؤثر طبقہ کو ارتداد سے بچایا۔ اس کے نہایت شاندار نتائج نصف صدی بعد سامنے آئے۔ جہانگیر کے بعد شاہجہاں بادشاہ آیا جو جہانگیر سے بھی بہت بہتر تھا اور ذاتی اخلاق و

کردار کا بھی نمونہ تھا اور شاہجہاں کے بیٹوں میں سے اورنگ زیب جیسا آدمی نکل آیا جو انسانیت کے اجتماعیت کے سفر میں عرب کے بعد عجم یا قرآن مجید کی اصطلاح میں 'آخرین' میں سے ایک مثالی بادشاہ بن کر سامنے آیا۔ اس نے ذاتی سطح پر درویشی کی زندگی اختیار کی، باوجودیکہ اس کی حکومت کابل سے لے کر برما تک تھی۔ پھر حکومتی مصروفیات کے 25 سال اسلام کے خلاف مرہٹہ فتنے کی سرکوبی میں دارالحکومت دہلی سے باہر گزار دیے۔ اس نے فتاویٰ عالمگیری مرتب کر کے ایک مدوّن اسلامی قانون نافذ کیا اور اسلام اور درویش بادشاہت کا نمونہ پیش کر دیا۔

اکبر کے برعکس اورنگ زیب بادشاہ مسلمانوں کا آئیڈیل اور ہندوؤں کے نزدیک ایک مطعون شخص ہے اس لئے کہ اکبر نے ہندوؤں کے مفاد کا تحفظ کیا تھا اورنگ نے صرف اسلام اور مسلمانوں کے ہی نہیں بلکہ انسانیت کے مفادات کے تحفظ کا بیڑا اٹھایا اور حکمرانی میں درویشی کا رنگ بھر دیا۔

اس کے بعد مغلیہ سلطنت زوال پذیر ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے ایک اور مرد قلندر شاہ ولی اللہ (1703-1761ء) پیدا کر دیا۔ انہوں نے مسلم اقتدار کے زوال کا دور دیکھا اور اس کے لئے اصلاحِ احوال کی ممکنہ کوششیں کیں، قرآن مجید کا ترجمہ کیا اور ایک جدید سلطنت کی ضروریات کے انداز میں اسلامی تعلیمات کو مدوّن کر دیا۔ حجۃ اللہ البالغہ ان کا شاہکار ہے۔ عقائد کی اصلاح کے لئے ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء لکھی۔

مغلیہ سلطنت کے زوال اور مرکزیت کے فقدان کی وجہ سے دہلی سے دور علاقوں میں طوائف الملوکی پھیل گئی اور علاقائی راجے مہاراجے اور حکمران اپنے اقتدار کے دعویدار بن گئے۔

جنوب مشرقی ہند کے ہندو مرہٹہ جو اپنے عقائد میں جنون کی حد تک راسخ ہیں۔ لہٰذا مرہٹہ قوت نے متحد ہو کر مغلیہ سلطنت کے زوال پر پورے 'ہند' پر قبضہ کا خواب دیکھنا شروع کر دیا۔ مرہٹے اپنی افرادی قوت کے بل بوتے پر مذہبی جنون کے ساتھ علاقے تاراج کرتے ہوئے مرکز دہلی کی طرف بڑھ رہے تھے کہ شاہ ولی اللہ کی دور رس نگاہوں نے دیکھا کہ دہلی کی مغلیہ حکومت میں تو مرہٹی قوت کے مقابلے کا دم خم نہیں ہے۔ لہٰذا ــــ اگر یہ مرہٹہ قوت دہلی پہنچنے میں کامیاب ہوگئی تو مغربی یورپ میں اندلس (ہسپانیہ یا سپین) کی طرح مسلم اقتدار کا خاتمہ ہو جائے گا۔ چنانچہ

اس مردِ درویش نے افغانستان میں قندھار کے حاکم احمد شاہ ابدالی کو خط لکھ کر ہند کے مسلمانوں کی کسمپرسی پر روشنی ڈالی اور بلایا کہ آ کر مرہٹہ قوت کو لگام دو، ورنہ ملت اسلامیہ ہند کا خاتمہ ہو جائے گا۔ (یہ بات سازش اور خفیہ ساز باز کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتی کہ انگریزوں کا 1753ء میں میر جعفر کو حکومت کا لالچ دے کر بنگال پر قبضہ اور مرہٹہ قوت کا سر اٹھانا اور دہلی کا رُخ کرنا ایک ہی وقت میں کیسے شروع ہوا۔ گہرائی میں جائیں تو اس کے پیچھے فتنہ پرور برطانوی سامراج تھا جو مسلم دشمنی اور ہند کے خزانوں پر قبضہ کے لالچ میں اندھا ہو رہا تھا۔ اس نے میر جعفر اور ہندو کو بھی لالچ دیا تھا کہ وہ نکلیں انگریزوں کی مدد کریں اور تختِ دہلی پر قبضہ کرا دیں گے)

اگرچہ یہ منصوبہ اللہ تعالیٰ نے ناکام بنا دیا 1761ء میں احمد شاہ ابدالی آیا اور پانی پت کے میدان میں ایک لاکھ مسلمانوں کا مقابلہ تین لاکھ ہندوؤں سے ہوا دو لاکھ مرہٹے قتل ہوئے اور باقی فرار ہو گئے احمد شاہ ابدالی اس فتح کے بعد مرہٹوں کا پیچھا کر کے ان کا صفایا کرتا تو ان میں دوبارہ اٹھنے کی سکت نہ ہوتی مگر احمد شاہ ابدالی کو جلدی واپس جانا پڑا اور یہ کام ادھورا رہ گیا۔

1799ء میں سلطان ٹیپو نے انگریزی استعمار کا مقابلہ کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا تو اب انگریزوں کو دہلی پہنچنے میں کوئی مزاحمت پیش نہ آئی اور انگریز 1803ء میں دہلی پہنچ گئے اور مغل حکمران کے ساتھ انگریز ریزیڈنٹ بیٹھنے لگا کہ مغل حکمران انگریزوں کے مشورے سے ہی امور حکومت چلائے گا اس طرح انگریزوں کا بالواسطہ قبضہ دہلی تک ہو گیا۔

اس انگریزی قبضہ پر 1803ء کے فوراً بعد جہاد کا فتویٰ آیا اور شاہ ولی اللہ کے خانوادے سے انگریزی اقتدار کو ختم کرنے کی کوششیں شروع ہو گئیں اور 1831ء میں تحریک شہیدین کے اکابرین بالاکوٹ کے مقام پر سکھوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔

☆ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے دورِ جوانی میں حرمین شریفین تشریف لے گئے تھے جہاں ان کی ملاقات نجد کے ایک مسلمان رہنما اور مصلح محمد بن عبدالوہاب سے ہوئی اور شاہ صاحب کا ان کی تحریک سے بھی تعارف ہوا۔ اس تحریک کے پیچھے امام ابن تیمیہ کے خیالات و نظریات تھے۔ اور یہ تحریک خلافت عثمانیہ کے خلاف کام کر رہی تھی۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے اس تحریک کا ساتھ تو نہ دیا مگر اس کے اثرات ضرور ساتھ لے آئے جو بعد میں تحریک شہیدین کے ایک زعیم شاہ اسماعیل

شہید رحمۃ اللہ علیہ کے زبان وقلم سے ظاہر ہوئے۔عرب کے علاقے حجاز اور نجد میں خلافت کے خلاف کام کرنے پر انہیں 'وہابی' یعنی مرکز گریز قوت کے الفاظ سے پہچانا جانے لگا تو انگریز نے اپنے خلاف تحریک شہیدین کے اکابرین کو یہی نام دے کر 'گالی' بنادیا حالانکہ یہاں مسلمان انگریز کافر حکومت کے غاصبانہ قبضہ کے خلاف جہادِ آزادی کررہے تھے اور عرب میں اسلام کی مقتدر حکومت کو بغاوت کا سامنا تھا۔مگر چالاکی سے انگریز نے 'وہابی' کی اصطلاح ان مجاہدین پر لگادی۔

شاہ اسماعیل شہید کے فکر پر محمد بن عبدالوہاب کے نظریات اور امام ابن تیمیہ کے افکار کا غلبہ ہوا انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کردیں یوں ہند میں نجد کی اس تحریک کے اثرات بالواسطہ طور پر نمودار ہوگئے۔شاہ اسماعیل شہید کی منصب امامت میں فکر کی جو بلندی ہے وہ اگرچہ نجد کے علماء کے ہاں مفقود ہے تاہم جذبے کی مماثلت سے دونوں کا فکری قرب اور باہمی ہمدردی ضرور تھی۔ پھر تحریک شہیدین کے ابتدائی مرحلہ میں 1824ء سیّد احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید اپنے ساتھیوں کو ایک قافلے کی شکل حج پر لے گئے اور یوں ہجرت کی عادت ڈالی اور جہاد کا جذبہ پیدا کیا۔اسی سفر میں طویل قیام کی وجہ سے ان کا رابطہ محمد بن عبدالوہاب کی تحریک سے دوبارہ ہوا۔

یہ تحریک شہیدین بظاہر بالاکوٹ کے معرکہ کے بعد دب گئی مگر آج کے فاٹا میں جہادی جذبہ، امام شامل کا جہاد اور 1857ء کی جنگ آزادی کے پیچھے یہی طبقہ نمایاں تھا اور ناکامی کے بعد بے شمار پھانسیوں کی سزا بھی اسی طبقے نے پائی۔اس جنگ آزادی میں اگرچہ مولانا فضل حق خیرآبادی اور دیگر مسلمانوں نے بھی بہت سی قربانیاں دیں مگر بوجودہ یہ کوشش کامیاب نہ ہوسکی۔ ہندو برائے نام ہی اس تحریک آزادی میں شریک ہوا اس لئے کہ مرہٹہ قوت تو انگریز کا ساتھ دے رہی تھی۔

1857ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریز نے پوری قوت اور سختی سے اپنے اقتدار کو مضبوط کیا اور حکومت براہِ راست تاجِ برطانیہ کے تحت کردی گئی اور اصلی معنی میں دور غلامی شروع ہوگیا۔انگریز پورے ملک میں پھیل گئے اور برطانوی حکومت کی طرز پر ایک منظّم نظام حکومت متعارف کرایا۔صوبے، ضلعے، تحصیلیں، عدالتیں، ہائی کورٹ، وائسرائے کورٹ، آہستہ آہستہ میونسپل الیکشن، میونسپل ادارے، پھر صوبائی حکومتیں اور اس کے الیکشن یہ سب حکومت کے

SELF RULE کا حصہ تھا کہ جوں جوں مقامی آبادی میں قابل اعتبار غدار ملتے جائیں ان کو شریک اقتدار کیا جاتا رہے۔

1914__1918ء کی پہلی جنگ عظیم ہوئی ترکی کو شکست کے بعد تقسیم کر دیا گیا اور عظیم عثمانی سلطنت کا خاتمہ کر دیا گیا۔ برطانوی ہند کی محکوم مسلمان قوم نے جو ہند کی آبادی کا صرف 25% تھی ____ اپنے مسلمان ترکوں کی حمایت میں خلافت کے خاتمے پر ایسی زوردار تحریک چلائی کہ انگریز کا اقتدار ڈول گیا اور ایسے محسوس ہوا کہ انگریز ملک چھوڑ جائے گا اس تحریک میں تحریک کی کامیابی کے خوف سے ہندو (گاندھی کی قیادت میں) بھی شامل ہو گئے۔ مگر یہ تحریک جلد ٹھنڈی پڑ گئی تاہم ____ پورے ہند کے مسلمانوں کو بیدار کر گئی اور انگریز کے عزائم اور طفل تسلیاں سب کی حقیقت مسلمانوں پر آشکار ہو گئی۔

20ویں صدی میں نصف صدی کی خاموشی کے بعد برطانوی ہند میں مسلمانوں کی جاندار لیڈر شپ سامنے آئی جو انگریز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتی تھی۔

500 سال کی اُمت مسلمہ کے لئے اضافی مہلت کے دوران مجددین کے سلسلہ کے کام بھی آگے بڑھتا رہا۔ بیسویں صدی اور 1320 ہجری کے بعد دور غلامی میں زندگی کے مختلف شعبوں اور مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے مختلف دھاروں میں کئی نامور شخصیات پیدا ہوئیں اور حیرت ہے کہ ان کے مقابلے کے لوگ پورے عالم اسلام میں نظر نہیں آتے۔

ایک طرف شیخ الہند محمود حسن ہیں جو نامور مجاہد آزادی ہیں جو دیوبند کے شیخ الحدیث، اسیر مالٹا، ریشمی رومال تحریک کے سربراہ، جمعیت علمائے ہند (جس میں تمام مسالک کے علماء جمع تھے) کے متفقہ صدر۔ دوسری طرف مولانا ابوالکلام آزاد ہیں جو 1920ء تک شیخ الہند کے ساتھ مل کر جدوجہد آزادی کے لئے کوشاں رہے اور الہلال اور البلاغ رسالے نکالتے رہے اور کئی مرتبہ قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ تحریک خلافت میں علی برادران کے علاوہ بہت سے زعمائے ملت کے نام نمایاں تھے۔ اس دوران علامہ اقبال ایک اسلامی مفکّر اور فلسفی شاعر کے طور پر اُبھرے انہوں نے مسلمانوں میں آزادی کا جذبہ بیدار کر دیا۔ شکوہ (1911ء)، شمع و شاعر (1912ء) جواب شکوہ (1913ء)، طلوعِ اسلام (1923ء)، ان کا اردو اور فارسی کلام ان کی

زندگی ہی میں قبول عام کا درجہ حاصل کر گیا۔ انہوں نے پورے ہند کے اعتبار سے ایک سرگرم مسلم رہنما کے طور پر مسلمانوں کے ہر مسئلے پر بنفس نفیس حصہ لیا اور کامیاب رہے۔ تحریک خلافت کے بعد کی ایک اہم اور معروف شخصیت سیّد ابوالاعلیٰ مودودی ہیں۔ انہوں نے متحدہ قومیّت کی نفی کر کے علیحدہ مسلم تشخص کا اثبات کیا اپنے رسالہ ترجمان القرآن میں زوردار مضامین لکھے مگر عملاً تحریک پاکستان میں شریک نہ ہوئے، تحریک پاکستان کا حصہ نہ بننے پر عوام کی نگاہ میں انہیں عمومی پذیرائی نہیں ملی۔ قائداعظم نے پاکستان بننے کے بعد انہیں تعمیر پاکستان میں شریک ہونے کا کہا اور ریڈیو پاکستان پر تقاریر کا موقع دیا۔ مگر 1951ء کے پنجاب کے انتخابات آنے پر جماعت اسلامی مسلم لیگ کے مدمقابل آ گئی۔

اسی طرح دین کی دعوت و تبلیغ کے لئے مولانا الیاس صاحب اور ان کی تشکیل کردہ جماعت تبلیغی جماعت کی مساعی ہیں۔ اس کے علاوہ پورے برصغیر کی بے شمار روحانی اور علمی شخصیات ہیں جنہوں نے مسلمانوں میں عام بیداری کا کام کیا۔ کسی کا کام محدود تھا کسی کا وسیع، کسی کا دیہاتی مسلمانوں کی سطح کا تھا اور کسی کا جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی رہنمائی کی سطح کا۔ مگر عوام و خواص علماء و رؤساء، والیانِ ریاست اور گدی نشین صوفیاء سب کے نزدیک مسلمانوں کو اسلام کی حکومت کے دوبارہ قیام کے لئے فکری مواد دینے والے واحد رہنما کے طور پر علامہ اقبال کا نام سربلند ہو گیا۔

اِن مجدّد دین کا کام جزوی سہی مگر انہوں نے تاریخ میں عوام النّاس میں احیائے اسلام کا کام کیا ہے عوام الناس اور خواص کو اسلام اس کی افاقیّت کے حوالے سے بیدار کیا ہے اور محمد ﷺ کے آخری نبی ہونے کی نسبت سے امت کو اپنے فرائض منصبی سے آگاہ کیا ہے۔

ہمارے نزدیک بیسویں صدی میں شیخ الہند محمود حسن، مولانا ابوالکلام آزاد کی حکومت الٰہیہ کا تصور، علامہ اقبال کا انقلابی فکر، مولانا محمد علی جوہر کی تحریک خلافت، سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کی ختم نبوت کے تحفظ کا جہاد، مولانا الیاس کاندھلوی (امیر تبلیغی جماعت) کی دینی فکر کی آبیاری اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی سیاسی فکر کاوشیں ہمارے ماضی کا حصہ ہیں سب نے اسلام کے لیے کام کیا ہے اور اسلام کے انقلابی پہلو کے لحاظ سے سبھی کسی ایک شعبہ کے 'مجدد' بھی ہیں اور تشکیل پاکستان میں ان کی مساعی کا بالواسطہ حصہ ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔

علامہ اقبال کا نام پاکستان کے حوالے سے مفکّر ومصورِ پاکستان کا بھی ہے اور اس کی عملی کوششوں کا آغاز کرنے والے اور اس کے لیے قوم کو اُبھار کر میدان میں لانے والے بھی آپ ہیں حتی کہ قائداعظم کو اس کام کے لیے ڈھونڈ کر لانے والے اور راغب کرنے والے بھی آپ ہی ہیں اور انگریزی میں علامہ اقبال کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے جو الفاظ آتے ہیں:

ONE WHO CONCIEVED

اور بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کے لئے انگریزی میں یہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں

ONE WHO ACHIEVED

1940ء میں قرار داد پاکستان منظور ہوئی اور 7 سال کی محنت شاقہ کے بعد اگست 1947ء میں 27 رمضان المبارک 1366ھ کو پاکستان کا قیام عمل میں آ گیا۔ برطانوی وزیراعظم کے ایک بیان کا اصل متن 2007ء کے ٹائم میگزین کے ایک شمارے میں چھپا ہے جس کے مطابق برطانوی ہند کی تقسیم کا واحد سبب ایک فلسفی شاعر علامہ اقبال تھے۔ ورنہ برطانوی حکومت، کانگرس اور زمینی حالات کسی صورت تقسیم کے حق میں نہیں تھے۔ ایک ولولہ اور جذبہ تھا جو علامہ اقبال کی شاعری نے لوگوں (عوام) کے دل میں بھر دیا تھا جس سے یہ ملک خداداد پاکستان صفحۂ ہستی پر ظہور میں آ گیا۔ گویا برصغیر کے طول وعرض میں مسلمانوں کے دل میں پاکستان اور علامہ اقبال دونوں لازم وملزوم ہیں اور ناقابل تقسیم وحدت ہیں۔

مغرب کی یہی داخلی معلومات اور تجزیہ تھا جس کی بنا پر گزشتہ عرصے میں علامہ اقبال کو عالمی منظر نامے سے بھی محو کر دیا گیا اور پاکستان کے تعلیمی نصاب اور مطالعہ پاکستان کے مضمون سے حرف غلط کی طرح مٹا دیا گیا اور ہمارے حکمرانوں کے ذریعے یہ کام ہوا۔ افسوس صد افسوس۔

مغربی مقتدر قوتوں کے اندرونِ خانہ فیصلے ہیں ورنہ ملالہ ایک ٹین ایج لڑکی اور 3 سالوں میں سکول سے اٹھ کر نوبل انعام کے قابل ٹھہرے اور کہاں علامہ اقبال کہ ان کے تذکرے علمی دنیا سے بھی محو کر دیے جائیں اور پاکستان کے نصاب سے بھی ـــــ مسلم لیگی قیادتوں کے زیر نگرانی یہ تخریبی کام اور نظریاتی ڈاکے ـــــ عقل تسلیم کرنے کو تیار نہیں مگر حقائق سب کے سامنے ہیں۔

عصر حاضر میں نظریاتی مسلمان، ریاستیں، اور رُوحِ عصر کے تقاضے

ہر دور کا ایک علمی معیار ہوتا ہے اور دانشور حضرات اس دور کے اس علمی معیار سے کم تر بات کو قبول نہیں کر پاتے بلکہ لائق اعتناء ہی نہیں سمجھتے۔ تاریخ انسانی میں اللہ تعالیٰ نے سابقہ پیغمبروں کو معجزات اس لئے عطا فرمائے کہ وقت کے فرعونوں اور تجرباتی علوم کے ماہرین کے تصور سے کہیں بڑھ کر کوئی چیز اُن کو مشاہدہ کرا دی جائے اور وقت کے جادوگروں اور تجرباتی علوم کے ماہرین کو ان کے سامنے بے بس کر دیا جائے تا کہ آسمانی ہدایت اور اس کے لانے والے کی علمی اور اخلاقی برتری ثابت ہو جائے۔

اسی طرح گزشتہ ایک صدی میں مسلم بیداری کے بعد دو اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں اور ان کا ایک تشخص اور معیار تھا تیسری ریاست پاکستان قائم ہوئی مگر بے شمار داخلی اور خارجی عوامل کی وجہ سے ہنوز ـــــ اسلام کے نفاذ کا نمونہ اور دورِ جدید کی ایک مثالی ریاست بننے کا عمل سست روی سے جاری ہے۔

آیئے ان تینوں ریاستوں کے تقابل سے مسلمانوں کے مستقبل کے بارے جو اشارے ملتے ہیں اور جو زمینی حالات اور منطقی تقاضے ہیں، ان کا جائزہ لیتے ہیں۔

1۔ جزیرہ نمائے عرب اٹھارھویں صدی میں حضرت محمد بن عبدالوہاب کی اٹھائی ہوئی تحریک ڈیڑھ صدی میں کئی مراحل سے گزر کر 1926ء میں ایک ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہوگئی اور مسلمانوں کے مقاماتِ مقدسہ حرمین شریفین بھی ان کے قبضے میں آ گئے۔

2۔ افغانستان ایک برادرِ اسلامی ملک ہے اور تاریخ میں آج تک کوئی غیر ملکی طاقت اس

ملک پر قبضہ جما کر اس کو محکوم نہیں کر سکی۔ 1979ء میں روس نے گرم پانیوں (بحیرۂ عرب) تک رسائی کے لیے افغانستان میں قدم رکھا کہ بلوچستان سے گزر کر بحیرۂ عرب تک رسائی ____

ع بس اس موڑ سے آگے منزل ہے بڑھتا جا درّا تا جا

کے مصداق آسان مہم سمجھی تھی مگر وہ اس عالمی قوت کے لئے گلے کا چھچھوندر بن گئی کہ 1990ء میں وہ USSR تحلیل ہو کر صرف روس رہ گیا۔ اس سے پہلے کوئی ایک صدی قبل برطانیہ نے افغانستان پر مہم جوئی کر کے ایک سبق سیکھا تھا اور اس شکست کا نشان برطانیہ کے ماتھے پر آج بھی ہے۔ اس کے بعد 1996ء میں افغان طالبان کی حکومت قائم ہوئی اور ملک میں ہر طرف امن قائم ہو گیا حتی کہ امریکہ سمیت دنیا کے اکثر ملکوں نے ان کی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ ان کا دور حکومت درویشی کا ایک منہ بولتا نمونہ تھا، امن و امان کے لحاظ سے دنیا کی جدید ریاستوں سے کہیں آگے تھا۔ (پھر امریکہ ____ جو روئے ارضی پر واحد طاقت تھی، اس نے اکتوبر 2001ء میں افغانستان پر کچھ مفروضوں کی بنیاد پر چڑھائی کر دی، عالمی اتحاد بنا، فوجیں اتریں، اسلحہ بارود فوجی ہر طرف بمباری سینکڑوں ارب ڈالر کے وسائل کو آگ لگا دی گئی۔ افغان طالبان آج بھی زندہ ہیں۔ امریکی اتحادی فوجیں 2013ء میں 'انگور کھٹے ہیں' کہہ کر واپس چلی گئیں۔ میڈیا میں یہی تاثر دیا گیا کہ ہم کامیاب واپس لوٹ رہے ہیں۔ امریکی عالمی سپر پاور کا رعب اور دبدبہ بھی گہنا گیا۔ اب صرف دس ہزار فوجی افغانستان میں ہیں۔ مقامی افغان حکومت ہے اور افغان طالبان۔ مستقبل میں کیا ہوگا اللہ بہتر جانتا ہے۔ لیکن عصر جدید میں درویش حکمرانی کا یہ ماڈل ایک ترقی پسند ماڈرن حقوق انسانی کی علمبردار حکومت نے تباہ کر دیا، اس سے بڑی انسان دشمنی اور انصاف دشمنی اور کیا ہو سکتی ہے۔)

3۔ تیسری ریاست پاکستان ہے جو ایک جمہوری انداز میں برطانوی سامراج کے غاصبانہ قبضے سے دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانوی اضمحلال اور کمزوری کی بنا پر برطانوی ہند کا قبضہ چھوڑنے کے فیصلے کے بعد ایک ریفرنڈم کے بعد وجود میں آئی۔ جمہوریت اس ملک کی ماں ہے اور اسلام اس ملک کا باپ (یعنی نظریہ) ہے۔ یہ ملک اسلامی جمہوریہ پاکستان کہلاتا ہے ایک آئین ہے جس میں طے ہے کہ اس ملک کا مذہب اسلام ہوگا۔ قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون

سازی نہیں کی جا سکے گی ملک کا نظامِ تعلیم نظریاتی ہو گا جو اس ملک کے مسلمان شہریوں (97%/اکثریت) کو صحیح مسلمان بن کے رہنے کی تعلیم دے گا اور ایسا ماحول پیدا کرے گا کہ اسلام کے اصولوں کے مطابق زندگی گزاری جا سکے۔

علامہ اقبال کے مطابق یہ ملک اسلام کا گہوارہ بنے گا اور دور جدید میں آج کے معیارات کی اسلامی ریاست جس میں سماجی، اقتصادی اور سیاسی سطح پر اسلام کے اصولوں پر عمل ہوگا۔ کفالت عامہ کا نظام ہوگا پاکیزہ زندگی ہوگی اور لوگوں (مسلم اور غیر مسلم) کی عزت و آبرو عفت و عصمت اور جان و مال محفوظ ہوگی۔ تاحال (اکتوبر 2015ء) یہ ایک خواب لگتا ہے مگر دشمنوں کی بے پناہ ریشہ دوانیوں، مخالفتوں کے باوجود اس ملک کا زندہ رہ جانا اور عالم اسلام کی واحد ایٹمی طاقت (اور دنیا کی ساتویں) بن جانا ایک معجزے سے کم نہیں۔ اپنے مقصد وجود کی طرف اس ملک کی نظریاتی پیش رفت ہو رہی ہے۔

4۔ چوتھی ریاست 'جمہوری اسلامی ایران' کی ہے ایرانی انقلاب کو 35 سال ہو گئے ہیں ولایت فقیہ کے تصور پر ایران کے شیعہ مسلمان اپنے بارھویں امام کے انتظار میں ایک عبوری دور سے گزر رہے ہیں۔ حالات و واقعات بتاتے ہیں کہ ان کے بارھویں امام جلد ظہور پذیر ہوں گے اور تمام ریاستی امور کی نگرانی کریں گے۔ اس مضمون کے بنیادی تصور کے مطابق اگر ایران آئندہ اپنے مثالی دور حکومت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نقوش پا پر ایک درویش حکمرانی کا تصور قائم کر دیتے ہیں عدل و انصاف اسلام کے احکام پر مکمل عمل پیرا ہو تو جمہوری اسلامی ایران کی ایک مثالی کامیابی ہوگی۔

قَدۡ
اَفۡلَحَ
مَنۡ
تَزَکّٰی

بے شک وہ مراد کو پہنچا جو پاک ہوا ہے

باب 7

☆ اسلامی ریاست کے ماڈلز
(MODELS)
کا تقابلی جائزہ 191

اسلامی ریاست کے ماڈلز (MODELS)
کا تقابلی جائزہ

ان سطور میں ہم سعودی عرب، افغان طالبان کا افغانستان اور پاکستان کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

انسانیت کی صدیوں پر پھیلی ایک انسان دوست، اخلاق دوست اور علم دوست اجتماعیت کی تلاش کا حاصل اور نقطۂ عروج انسانی سطح پر حضرت محمد ﷺ کے نمونہ کے نقش پا خلافت راشدہ کا انسانی بنایا ہوا ماڈل تھا اور آج تک بے مثال ہے جس کی کوئی نظیر نہیں۔

عصر حاضر کی مغربی تہذیب اور اس کے ماسٹر مائنڈز نے یہ ماڈل کس لئے رد کر دیا اس کا کوئی جواز نہیں۔ 1937ء میں جب برطانوی ہند میں صوبائی خود مختاری کے تحت صوبائی انتخابات ہوئے تو اکثر صوبوں میں کانگرس جیت گئی اور اس نے صوبائی حکومتیں تشکیل دینا تھیں۔ اس موقع پر مہاتما گاندھی نے اپنے رسالہ 'ہریجن' میں ان کو مشورہ دیا کہ اے ہندو! قوم تمہیں صدیوں بعد ہند میں حکومت بنانے کا موقع مل رہا ہے میں تمہیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے طرز حکومت کی مثال دیتا ہوں کہ اس طرح کی حکومت بنانا۔ مگر انسان دوست حکومتیں نہ اس وقت بن سکیں اور نہ 1947ء کے بعد کے بھارت میں۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں نہ ہو سکا اور کون راستے کی رکاوٹ ہے۔ مہاتما گاندھی کی اوپر درج ہدایت سے یہ بات اخذ کی جا سکتی ہے کہ دنیا کے اجتماعی ضمیر میں دور خلافت راشدہ کا درویش حکمرانوں کا نمونہ آج بھی تازہ ہے اور مثالی انسان دوست حکومت کا ماڈل آج بھی وہی ہے۔

آج کی دنیا میں جیسا کہ پہلے ایک جدید ریاست کے خدوخال سامنے آ چکے ہیں۔ دنیا ان معیارات پر سوچتی ہے اور نصب العین اور ہدف خلافت راشدہ کی سادگی اور خدمت کا جذبہ ہے۔ اس کسوٹی پر پرکھ کر دیکھیں تو یہ بات عیاں ہے کہ:

آج کے عالمی علمی معیار پر سعودی عرب کا اسلامی حکومت کا ماڈل پورا نہیں اترتا۔ وجوہات کچھ بھی ہوں..... ایک خاندانی بادشاہت جہاں ملک کے تیل کی ساری آمدنی شاہی خاندان کا جیب خرچ تصور ہو اور عوام بھیڑ بکریوں کی طرح زندگی گزاریں۔ پھر حکمرانوں پر تنقید اور اصلاحِ احوال کی کوششیں کہاں ہیں ان کا سوچنا بھی وقت کا ضیاع ہے۔ پھر دعویٰ یہ ہے کہ ایک علمی خاندان ـــــ خاندانِ حضرت محمد بن عبدالوہاب حکومت کے معاملات کی مذہبی (یعنی قرآن و سنت کی نگاہ سے) نگرانی کرتا ہے۔ اگر نگرانی کے بعد یہ حال ہے تو وہ ممالک جہاں ایسی کڑی نگرانی نہیں ان کا کیا حال ہوگا۔ (جیسے پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل کے تنخواہ دار اور من پسند بے ضرر لوگ کہ ان کو وقت گزارنے کے لیے ایک آمدنی کا ذریعہ درکار ہے ورنہ ان کی محنت کا ملکی سطح پر اور قانون سازی کے عمل میں کوئی عمل دخل نہیں۔)

اسی طرح آج کے عالمی معیاراتِ قبولیت پر 1996ء سے 2001ء تک کے افغان طالبان کی حکومت بھی پوری نہیں اتری۔ اس بات کا عالمی سطح پر اعتراف ہے کہ ان حضرات نے ایک درویش حکمرانی کی مثال قائم کر دی اور عام طور پر دنیا میں جرائم کی کثرت کا سبب تعلیم کی کمی اور غربت کو قرار دیا جاتا ہے مگر ان افغان طالبان کے پاس نہ معلوم کونسی جادو کی چھڑی تھی کہ تعلیم کی حد درجہ کمی اور انتہائی غربت کے باوجود جرائم کو امریکہ کیا سعودی عرب کی خوشحال ریاست سے نہایت کم سطح پر لے آئے۔ افغانستان طالبان کے سربراہ ملا عمر رحمۃ اللہ علیہ کے ایک فرمان پر افغانستان میں پاپی یا ہیروئن کے پودے کی کاشت پر مکمل پابندی کے قانون پر من وعن عمل درآمد ہوا۔ اس کے برعکس 2001ء سے 2012ء تک اس فصل کی کاشت کو ختم نہیں کرایا جا سکا۔

اسی طرح یہ گواہی بھی ریکارڈ پر ہے کہ علامہ اقبال کے فرزند ارجمند ڈاکٹر جاوید اقبال مرحوم دسمبر 1998ء میں افغانستان کے مطالعاتی دورے پر ایک وفد کے ساتھ تشریف لے گئے تھے واپسی پر انہوں نے پشاور میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے افغان طالبان

کے طرز حکومت کو داد دی (یاد رہے کہ وہ خود بھی لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس رہ چکے تھے) کہ افغانستان نے وسائل کی کمی کے باوجود جرائم کی شرح میں حد درجہ کمی کا ہدف حاصل کر لیا ہے۔ اگر افغانستان کی طرح دو تین مسلمان ممالک اس طرح اسلامی خلافت راشدہ کا ماڈل عصر حاضر میں ترقی یافتہ ممالک کے سامنے رکھ سکیں (جیسے پاکستان وغیرہ) تو ساری دنیا از خود مسلمان ہو جائے گی۔

افغانستان کا ماڈل بھی اس لئے جدید دنیا کے لئے قابل قبول نہیں ہوا کہ افغانستان ایک غیر ترقی یافتہ ملک ہے اور قبائلی معاشرہ ہے ہم مسلمانوں کے اعتبار سے تو وہاں کی حکومت ایک کامیاب حکومت تھی مگر جن لوگوں کو اسلام کے قریب لانا چاہتے ہیں اور اتمامِ حجت کرنا چاہتے ہیں ان کا معیار یہ ہے کہ تعلیم یافتہ جدید معاشرہ ہو اور جمہوریت کا انداز ہو آزادئ رائے ہو اور پھر اسلامی تعلیمات کو بروئے کار لا کر جرائم میں حیرت انگیز حد تک کمی دکھا دی جا سکے تو یقیناً دنیا از خود اسلام قبول کر لے گی۔

اس کی وجہ بڑی سادہ سی ہے غور فرمائیں اور اہل علم اور متعلقہ حضرات اس بات کو خوب سمجھتے ہیں۔ ہر ملک کا وزیر داخلہ ہر صوبے کا چیف سیکرٹری اور وزیر داخلہ، صوبائی آئی جی پولیس اور تمام ضلعی پولیس افسران درجہ بدرجہ ہر ہفتہ ہر ماہ اور ہر سال اپنے اپنے علاقوں میں مذکورہ عرصے کے دوران جرائم کی فہرست بتاتے ہیں اور رپورٹ پیش کرتے ہیں پھر ان رپورٹوں پر گفتگو ہوتی ہے اور تبصرے ہوتے ہیں ترقی اور تعریفی اسناد یا تنزلی اور تند و نیز گفتگو لازمی ہوتی ہے۔

ان رپورٹوں میں جرائم کی تعداد کم دکھانے کے فرضی اعداد و شمار دیے جاتے ہیں اور سوجتن کرنے پڑتے ہیں اور در پردہ منّت سماجت بھی ہوتی ہے۔

کسی ملک کا وزیر داخلہ اور صوبائی ذمہ داران یہ نہیں چاہئیں گے کہ ان کی اگلی رپورٹ جرائم کے اعتبار سے NIL رپورٹ ہو۔

لہٰذا ـــــ دنیا کے سامنے اگر کوئی خلافت کا درویشی ماڈل ہو اور جرائم کا گراف نیچے آ چکا ہو تو جیسے آج ملکوں کے وفود امریکہ اور یورپی ممالک جا کر حالات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ دنیا بھر کے ممالک کے وفود ان ماڈل ملکوں میں آئیں گے اور دل سے اسلام کو سمجھیں یا نہ سمجھیں وہ

سزائیں ویسے ہی نافذ کردیں گے یا کچھ لوگ کلمہ اسلام پڑھ کر اس پر عمل کریں گے تاہم دونوں صورتوں میں ان ملکوں کے عوام اور بالآخر عالمی میڈیا کے ذریعے تمام انسانی معاشروں تک ان کا میابیوں کا چرچا ہوگا اور لوگوں کے اسلام کے قریب ہونے اور قبول کرنے کے مواقع بڑھ جائیں گے۔

پاکستان میں کئی داخلی اور خارجی وجوہات کے باعث اسلامی قوانین کا نفاذ نہیں ہوسکا اور ملک ابھی تک پٹڑی (TRACK) پر چڑھ ہی نہیں سکا کہ جس کے بعد تھوڑے عرصے اس جدوجہد کے ثمرات آنکھوں سے دکھائی دینے لگیں۔

پاکستان کے اندر معاشرے میں وہ جذبہ اور داعیہ (POTENTIAL) موجود ہے جو اس عظیم کام کو سرانجام دے سکتا ہے مگر UNO کا دباؤ، IMF کے قرضوں کی معیشت، WB کی فرمائشیں اور امریکہ بہادر کی دنیا بھر میں جن 92 ملکوں میں مداخلت ہے کہ ہمیشہ اس کی پسند کی حکومتیں برسراقتدار آئیں جس کے لئے وہ ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتا اور اپنی مرضی کے نتائج گزشتہ ایک طویل عرصے سے حاصل کر رہا ہے۔ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کا یہ انٹرویو 1974ء سے ریکارڈ پر ہے کہ ہم پہلے سمجھتے تھے کہ پاکستان میں حکومتوں کی تبدیلی ووٹوں کے ذریعے ہوتی ہے، ہم غلطی پر تھے اور دھوکا کھا گئے۔ ووٹ تو عوام کے لئے EYE WASH ہوتے ہیں اصل فیصلے مدتوں پہلے کہیں اور بہت دور THINK TANKS اور ریسرچ پیپرز میں کر لیے جاتے ہیں۔ ان 92 ممالک کی طویل فہرست میں پاکستان نمبرون (NO.1) پر نہیں ہے تو اوپر کے چند ملکوں میں ضرور ہے۔ لہٰذ پہلے پاکستان برطانوی سامراج کا غلام تھا اس غلامی سے آزادی ملی تو اب پاکستان اور اس کے عوام حقیقتاً امریکی غلام ہیں اور UNO کے غلام ہیں اور مالیاتی قرضے الگ ہیں جو پالیسیاں بناتے ہیں اور DICTATE کرواتے ہیں آئے روز آئی ایم ایف کی طرف سے قرض کی نئی قسط پر بجلی مہنگی کردو، گیس مہنگی کردو یہ مراعات (SUBSIDIES) واپس لے لو اور یہ واپس لے لو وغیرہ وغیرہ۔

لہٰذا ابھی پاکستان حقیقی طور پر آزاد نہیں ہے۔ جس طرح آج سے 250 سال پہلے

امریکہ کو برطانوی سامراج سے آزادی کا حق تھا اور امریکہ برطانیہ سے برسر پیکار تھا آج دنیا کے ممالک کو امریکی سامراج سے بھی آزادی کا ویسا ہی حق حاصل ہے۔ پاکستان میں امریکہ سے آزادی کا علم کب سربلند ہوگا یہ مستقبل کی بات ہے لیکن ہوگا ضرور اور وہ صبح ایک روشن صبح ہوگی جب پاکستان امریکی غلامی اور امریکی سفیر کی وائسرائے کی حیثیت ختم کر چکا ہوگا۔

فی الحال تو اس صورت حال کے لئے دعا ہی کی جاسکتی ہے۔

ان حالات میں صحیح صورت حال یہ ہے کہ پاکستان کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر اپنے نظریہ کے مطابق اپنی سماجی، اقتصادی اور سیاسی پالیسیاں بنانے اور چلانے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ لہٰذا ناکامی کا سوال ہی نہیں ابھرتا۔ مستقبل میں جب بھی اس بات کا موقع ملا اور ان شاءاللہ ضرور ملے گا تو یہ بات بھی یقینی ہے کہ پاکستان میں دور حاضر کی ضروریات کے مطابق ایک مثالی ریاست بننے کی وہ تمام شرائط پوری ہوتی ہیں۔

پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے جمہوریت رائج ہے الیکشن ہوتے رہتے ہیں تعلیم یافتہ معاشرہ ہے بلوچستان اور FATA میں قبائلی معاشرہ کی جھلک ہے تو وہ بھی جلد ہی ملک کی جمہوری MAIN STREAM میں آجائیں گے۔ اگر ہمارے ملک میں چار پانچ الیکشن بر وقت ہو جائیں اور انتقال اقتدار پر امن ہو تو قبائلی روایات کا عمل دخل بھی سیاست میں بہت کم ہو جائے گا۔

باب 8

☆ پس چہ باید کرد؟

اب کیا کرنا چاہئے؟

پس چہ باید کرد؟
اب کیا کرنا چاہئے؟

O ریاست پاکستان کو مصور پاکستان کے تصورات اور بانی پاکستان کی خواہشات اور امنگوں کے مطابق ڈھالنے کا کام کرنے کا مرحلہ باقی ہے۔ یہ کام کٹھن سہی مگر ناممکن نہیں ہے۔ گزشتہ صدی کی چالیس کی دہائی (FORTIES) اور اکیسویں صدی کی دوسری دہائی کے حالات میں بہت بڑا فرق واقع ہو چکا ہے مگر امت مسلمہ کا وہ حصہ جو جنوبی ایشیا کے کونے کونے سے آکر پاکستان میں آباد ہے اس میں جذبہ آج بھی موجود ہے جس نے پاکستان کے قیام کو ممکن بنا دیا تھا۔

O پاکستان کو اپنے اساسی مقصد کی طرف لانے کے لئے ہمیں آج کے معروضی حالات کا ایک تجزیہ کرنا ضروری ہے۔ پاکستانی معاشرہ کی اپنی ایک سائنسی حکیمانہ توجیہ ہے اور پاکستان عالم اسلام سے صرف جڑا ہوا ہی نہیں اس کے قلب میں واقع ہے۔

O جب کہا جاتا ہے کہ انسانی معاشروں کے لئے تاریخ کی بڑی اہمیت ہے جیسے کسی فرد نوعِ بشر کے لئے اس کے حافظے (MEMORY) کی ہے اسی طرح اجتماعی یادداشت کا نام تاریخ انسانی ہے۔ یہ اجتماعی یادداشت قبیلوں معاشروں اور ملکوں کی سطح پر بھی ہے اور عالمی سطح پر بھی ہے۔

O اجتماعیت کی تعمیر اور ملکی اور ملّی یا انسانی سطح پر اجتماعی کاموں میں حصہ لینے والوں کو بھی وقفہ وقفہ سے ٹھہر کر اپنے ماضی کی طرف دیکھنا چاہیے اور اپنے کام کا تجزیہ کر کے غلطیوں کی نشاندہی کرنی چاہیے اور ان غلطیوں کو صحیح کرنا اور ان کا اعادہ نہ کرنا بھی عقل سلیم اور قلب سلیم کا تقاضا ہے۔

O تاریخ اسلام میں دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد جب زندگی کو رحمت للعالمین کے واسطے

سے زندگی کا سلیقہ ملا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس راستے پر چل کر اس کے کانٹے اور پتھر صاف کر دیے تو پھر کاروانِ زندگی تیز رفتاری سے آگے بڑھا۔ علم بڑھا، معلومات بڑھیں آمدورفت بڑھی اور مسلمانوں کے تمام معلوم دنیا سے رابطے ہوئے تو مسلمان اہل علم کے سامنے بے شمار اقوام کے رویے، تجربات، رہن سہن کے طریقے، سوچ کے زاویے اور توہمات کی دنیا تھی جو یک لخت کھل گئی۔

چنانچہ مشرق ومغرب کے علوم سے مسلمانوں کو واسطہ پڑا یہ دور بنواُمیہ کا نصف آخر اور بنوعباس کے آغاز کی صدی ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو اپنے تراثِ علمی پر غور وفکر کر کے آسمانی ہدایت کو سامنے رکھتے ہوئے ہر چیز کو پرکھنے جانچنے اور چھانٹنے کا موقع ملا اور مسلمانوں نے قدرے اختلاف کر کے بھی اسلام کی تعلیمات کے چشمہ صافی کی حفاظت فرمائی اور اس چشمہ صافی کو گدلا اور مکدر نہیں ہونے دیا۔

O یہی دور ہے جب عملی زندگی میں اسلام میں 'نو واردان' کے لیے اسلام کی تعلیمات کا عام فہم اور سادہ خلاصہ پیش کرنے کا موقع تھا اور دین کی تعلیمات کو عوام اور سادہ زندگی گزارنے والوں کے لئے [جیسے اللہ تعالیٰ نے فتح مکہ کے بعد ایمان لانے والوں کے لیے پورے قرآن مجید کی تعلیمات کا خلاصہ 10 سورتوں مسبّحات (الحدید تا التحریم) میں بیان کر دیا]۔ اسی طرح غیر عرب اقوام اور علمی لحاظ سے بھی قدرے تہی دست عوام کو قرآن مجید اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا ایک ناگزیر کم سے کم درجہ کا نصابی معاملہ عطا کرنے کے لئے علمائے اسلام نے عوامی مسائل اور ان کے حل کے کوششیں فرمائیں اور ایک طویل کے تعامل سے اب یہ کوششیں فقہ کے مکاتب فکر، عقائد کے مکاتب فکر وغیرہ کے نام سے متداول ہیں۔

O مسلمانوں میں ایک تقسیم (اور قدیم تقسیم) اہل سنت اور اہل تشیع ہیں۔ آغاز کی صدیوں میں یہ تقسیم زیادہ گہری نہیں تھی مگر بعد کی صدیوں میں اس میں ضد کا عنصر بعض خرافات اور بدعات کی وجہ سے دوریاں پیدا ہو گئیں۔

O دور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے دوری کے بڑھنے سے یہ اختلافات اور تقسیم بڑھتی چلی گئی۔ اہل تشیع کے بارے میں تو مجھے زیادہ علم نہیں۔ اہل سنت میں معروف تقسیم اور پہچان یوں بنا دی گئی ہے۔

فقہی تقسیم

فقہ قانون اور اجتہاد کے ذریعے روزمرہ کے معاملات میں قرآن وحدیث کی رہنمائی کے ضمن میں ہمارے ہاں قرآن وحدیث سے مسائل اخذ کرنے کے جب اصول وضع ہوئے تو ان اصولوں کی بنا پر پھر تفصیلی احکام میں بھی فرق واقع ہو جاتا ہے جس کی بنا پر کئی نقطہ ہائے نظر وجود میں آئے مگر یہ امت کی خوش قسمتی ہے کہ وہ زیادہ نہیں ہیں۔

اہل سنت میں ایک تقسیم علمائے ظاہر کی ہے جس میں بالعموم ائمہ احادیث ہیں، دوسرے فقہی مکاتب فکر۔ فقہی مکاتب فکر میں یہ تعداد چار کی ہے:

☆ فقہ حنفی ☆ فقہ مالکی ☆ فقہ شافعی ☆ فقہ حنبلی

دوسری اور تیسری صدی ہجری تک اختلافات کے باوجود باہمی احترام اور تھا جو بعد میں بہت کمزور پڑ گیا۔ اب کبھی تو توسّع اور برداشت کے نادر اور شاذ نمونے نظر آتے ہیں مگر کم۔

اہل سنت میں ایک اور تقسیم علم کی ترقی مادی علوم میں پھیلاؤ اور فلسفہ ومنطق کے رواج کے بعد اسلام کے عقائد کی تشریح وتوضیح کے باب میں ہوئی ہے روح کی حقیقت، عذاب قبر، قسمت ومقدر، تقدیر، جنت ودوزخ کی حقیقت انسان کا کسب اعمال میں اختیار کس حد تک ہے اور کس حد تک پابند ہے وغیرہ وغیرہ اور اس طرح کے دیگر سوالوں کے جواب علماء نے قرآن و حدیث اور ایمان کے تقاضوں کی روشنی میں دینے شروع کیے تو اس میں کم وبیش دو بڑے مکاتب فکر وجود میں آئے آج ہم پندرھویں صدی ہجری میں زندہ ہیں ہمارے لئے دو شخصیات ان دو مکاتب فکر کی نمائندگی کرتی ہیں: 1۔امام غزالی 2۔امام ابن تیمیہ

دونوں گروہوں کے پاس دلائل اور آثار سلف ہیں لہٰذا ہم جیسے عام آدمیوں کے لئے چاروں فقہی مکاتب فکر کے احترام کے ساتھ کسی ایک مکتب فکر کی پیروی اور امام غزالی وامام ابن تیمیہ دونوں کے احترام کے ساتھ کسی ایک کی پیروی کے علاوہ کوئی عملی اور قابل عمل راستہ نہیں ہے۔

گویا کئی صدیوں سے کسی مسلمان کو فقہی مکاتب فکر میں سے کسی ایک منتخب کرنا ہے اور عقائد کے لحاظ سے دو نقطہ ہائے نظر میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ دل میں وسعت اور باہمی احترام ہو تو زندگی اچھی گزر جاتی ہے۔

O فقہی مکاتب فکر میں امام ابوحنیفہ اور فقہ حنفی کا رجحان بالعموم امام غزالی کی طرف ہے اور امام شافعی، امام مالک اور امام احمد علمائے ظاہر کے بھی زیادہ قریب ہیں اور امام ابن تیمیہ کے بھی۔

اگرچہ ہمارے اسلاف میں اس کے خلاف بھی مثالیں موجود ہیں۔ امام غزالی کے نقطۂ نظر میں ابن عربی ہیں جو فقہی اعتبار سے حنبلی یا علمائے ظاہر ہیں۔ شیخ عبدالقادر جیلانی حنبلی مسلک کے ساتھ امام غزالی و ابن عربی کے معتقد ہیں۔ امام غزالی اور ابن عربی کے ساتھ تیسرا مشہور نام مولانا جلال الدین رومی کا آتا ہے اور یوں پورا سلسلہ تصوف ان کے ساتھ منسلک ہوتا نظر آتا ہے۔

O جغرافیائی لحاظ سے بھی یہ تقسیم بڑی دلچسپ ہے کہ امام ابن تیمیہ کے معتقدین زیادہ مشرق وسطیٰ اور بلاد عرب میں ہے۔ جبکہ ایران، افغانستان، ترکستان اور ہند میں امام غزالی کا فکر ہے پورے جنوبی ایشیا میں مغل بادشاہ نصیرالدین ہمایوں وفات 1556ء سے پہلے اہل تشیع نہیں ہیں۔ اس طرح بیسویں صدی کے آغاز (یا اس سے تھوڑا پہلے تک) امام ابن تیمیہ کا تعارف ہند میں نہیں تھا۔ اس کو مولانا ابوالکلام آزاد اور پھر مولانا مودودی نے متعارف کرایا۔ اس کے برعکس عرب میں عثمانی سلطنت میں فقہی حنفی تھی اور امام غزالی کا فکر تھا صوفیا تھے۔ جبکہ محمد بن عبدالوہاب کی تحریک امام ابن تیمیہ اور امام ابن حنبل کے ماننے والے تھے۔

O ہم نے اوپر صرف بیانیہ انداز میں اس تقسیم کا ذکر کر دیا ہے۔ قرآن وحدیث کے دلائل کا شعبہ علمی شعبہ ہے اس کا میدان الگ ہے۔ وہ میدان نہ اس گفتگو کا ہے نہ ہمارے بس کا۔

O یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ دور حاضر میں مغربی علوم کی بھرمار کی وجہ سے مغرب اور مغربی تعلیمی درسگاہوں اور یونیورسٹیوں میں عربوں کی وجہ سے ابن تیمیہ کا تعارف زیادہ بڑھا ہے جبکہ امام غزالی اور ابن عربی کے قدردان بھی ہیں مگر ان کو وہ عالمی پذیرائی نہیں ملی۔ اس کی وجہ بظاہر یہ بھی ہوسکتی ہے کہ مغرب حقیقت انسان کے باب میں روح کے علیحدہ تشخص کا صریحاً منکر ہے صرف جسد ہی جسد ہے یہی ڈارون کا فلسفہ ہے جو مغربی اذہان پر مسلط ہے۔ امام غزالی روح کے علیحدہ تشخص اور اس کی فتوحات اور کارناموں پر گفتگو کرتے ہیں؛ لہٰذا امام غزالی کا فکر مغرب کی درسگاہوں کی بنیادی فکری اساسات سے ٹکراتا ہے۔ لہٰذا ناقابل اعتناء ہے۔ جبکہ امام تیمیہ کا فکر اس ضمن میں مغربی فکر کے زیادہ قریب ہے لہٰذا اس کی پذیرائی بھی ہے اور وہ قابل قبول بھی ہے اور

اس فکر کے لوگوں سے دوستی بھی ہے۔

موضوع کی طرف آتے ہوئے جنوبی ایشیا کے معروضی حالات کی طرف آئیں تو یہاں کی فکری بنیادیں صوفیاء اور فقہ حنفی سے زیادہ غذا حاصل کرتی ہیں۔

یہاں بالاتفاق اسلام کی تعلیمات کو صوفیا نے پھیلایا ہے۔ محمد بن قاسم 93ھ (711ء) میں آیا تھا مگر جلد ہی واپس چلا گیا۔ اس کے ساتھ آنے والی فوج میں بھی کوئی مثبت تبلیغی اور اشاعتی مقصد کارفرما نہ تھا بلکہ سندھ کے حکمرانوں کی تادیب اور ہو سکے تو سلطنت بنوامیہ کا حصہ بنالینا۔ محمد بن قاسم کے ہاتھوں موجودہ پاکستان کا تقریباً پورا علاقہ فتح ہو گیا تھا اور اس اسلامی ورور کے ساتھ خالص عربی اسلام اور پہلی صدی کے اسلام کے تہذیبی وثقافتی اثرات آج بھی پنجاب، سندھ، بلوچستان اور کے پی کے میں بچشم سر دیکھے جا سکتے ہیں۔

جبکہ اس کے بعد صوفیاء کی آمد ہے اور انہوں نے صنم خانۂ ہند میں لوگوں کو مسلمان کیا ہے اور ان کے خمیر میں وہی اسلام کارفرما ہے۔ امام ابن تیمیہ کے ماننے والے ہمارے بھائی چاہے ہمیں مسلمان سمجھیں یا نہ سمجھیں، یہاں کے مسلمانوں کے خمیر میں یہی کچھ ہے۔

لہٰذا وہ آدمی جو امام غزالی کے فکر اور فقہ حنفی سے مطابقت پیدا نہ کر سکتا ہو اس کے لئے دعوت وتبلیغ کا وسیع میدان ہے کہ وہ ان لوگوں کو قرآن وحدیث کے قریب لانے کی کوشش کرتے رہیں۔ مگر جہاں یہ بات ہوگی کہ تم مسلمان ہی نہیں ہو تمہیں دوبارہ مسلمان کرنے کی ضرورت ہے یہاں سے بات بالکل دوسری طرف نکل جائے گی۔

یہاں کے حالات کا تجزیہ کرنے کے لئے ان معروضی حقائق کو سامنے رکھنا ضروری ہے ورنہ کوئی بھی حل نکالیں اور اصلاحِ احوال کی کتنی ہی مخلصانہ کوشش فرمائیں وہ تجویز بے اثر رہے گی اور کام بے نتیجہ رہے گا۔

O ہمارے نزدیک جنوبی ایشیا میں پورے برطانوی ہند کی سطح پر جن دو شخصیات نے امام ابن تیمیہ کے افکار کے تحت تصوف صوفیاء اور امام غزالی کی نفی اور ابن تیمیہ کے افکار کے فروغ کا کام کیا وہ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی شخصیات ہیں۔ مگر انہوں نے اس عظیم کام کے لئے دعوت وتبلیغ کا کام اور اصلاح کا کام کرنے کی بجائے اس کو سیاسی سطح پر کیا۔ مولانا

ابوالکلام آزاد تو بددل ہو کر اس کو جلد ہی چھوڑ کر کانگریس میں چلے گئے مگر مولانا مودودی صاحب اس فکر کے ساتھ الیکشن کی سیاست میں بھی آ گئے۔ لہٰذا مولانا ابوالکلام آزاد بھی ناکام ہوئے اور مولانا مودودی بھی کامیاب نہ ہو سکے اور نہ ہی ان کی جماعت اس فکر کے ساتھ کامیاب ہو سکتی ہے بھلا تصوف سے اعلان بیزاری کر کے، امام تیمیہ کے افکار کا علم اٹھا کر پاکستان کے عوام سے اکثریت کے ووٹ لے کر حکومت بنانے کا ارادہ کیسے کامیاب ہو سکتا ہے جبکہ یہاں کا سواد اعظم تصوف و اولیاء کا متوالا اور خاکپائے صوفیاء اور اس سے بڑھ کر سگِ غوثیہ کہلاتا ہو۔ ہاں ہمارے عوام اور علماء میں اتنا شعور ابھی باقی ہے کہ آپ اصلاح عقائد کا کام کر سکتے ہیں اور جو لوگ کام کر رہے ہیں ان کے لئے کوئی بڑی رکاوٹ بھی نہیں ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں نے آج سے ایک صدی قبل جس جدوجہد آزادی کا آغاز کیا تھا جس میں علامہ اقبال کا شکوہ (1911ء)، شمع و شاعر (1912ء) جوابِ شکوہ (1913ء)، طلوعِ اسلام (1923ء) ـــ مولانا ابوالکلام آزاد کا الہلال اور البلاغ 1912ء تا 1916ء ـــ شیخ الہند کی اسارت مالٹا 1916ء تا جون 1920ء ـــ تحریک خلافت ـــ علامہ اقبال کے انگریزی خطبات RECONSTRUCTION OF REGILIOUS THOUGHT IN ISLAM۔ ـــ علامہ اقبال کا خطبہ الٰہ آباد ـــ علامہ اقبال کا قائداعظم کو برطانیہ سے واپس ہند لانے کی شدید خواہش ـــ علامہ اقبال کا 40 سال اجتماعی مسائل میں پورے ہند کی سطح پر مسلمانوں کی بھرپور نمائندگی کرنا ـــ فارسی کلام میں ریاست اسلامی کی تشکیل، اس کے اہداف اور دورِ حاضر کے تقاضے کا بھرپور بیان ـــ قائداعظم کا علامہ اقبال سے اظہارِ عقیدت ـــ کی چاشنی شامل تھی۔ ان کوششوں کا حاصل 14/اگست 1947ء کو 27 رمضان المبارک 1366ھ شب قدر میں پاکستان کا حصول تھا۔ افسوس کہ علماء اور سیاسی مصلحین ایک نئی آزاد اسلامی ریاست کے قیام کے تقاضوں کا قبل از وقت صحیح ادراک نہ کر سکے اور اس کوتاہی کی سزا ـــ ع 'لمحوں نے خطا کی ہے صدیوں نے سزا پائی ہے' کے مصداق، سات عشروں سے بے مقصدیّت اور بے یقینی کے صحراہیں بھٹکنے کی شکل میں ہم بھگت رہے ہیں۔

باب 9

☆ نظریۂ پاکستان کے صحیح ادراک کے لئے
مصوّرِ پاکستان علامہ اقبال کی فکر
کی طرف لوٹنا ہی واحد حل ہے 207

☆ علامہ اقبال عصر حاضر کے نمائندے ہیں 213

نظریۂ پاکستان کے صحیح ادراک کے لئے مصوّرِ پاکستان علامہ اقبال کی فکر کی طرف لوٹنا ہی واحد حل ہے

O اسلامی جمہوریہ پاکستان کا المیہ یہ ہے 1947ء میں اپنے قیام کے بعد آج تک کے سفر میں ہم ایک طرف اپنی منزل پر نہیں پہنچ پائے اور دوسری طرف کھڑے وہاں ہیں جہاں سے مقصد قیام کی منزل دور ہے ثالثاً ہماری موجودہ پوزیشن اور نصب العین جہاں پہنچنا تھا اس کے درمیان اب ایک پرخطر صحراء حائل ہے۔اس نظریاتی صحراء کے خطرات میں پہلا خطرہ فکری زادِراہ کی کمی بلکہ فقدان ہے کہ وہ نسل جس کے جوان جذبوں اور قربانیوں نے یہ ملک حاصل کیا وہ دنیا سے رخصت ہو چکی بلکہ اس کے بعد ایک نسل بھی گزر چکی۔اب تیسری نسل جوان ہو کر میدان عمل میں ہے۔اس نسل میں وہ نظریاتی پختگی اور ملّی جذبات کی گہرائی نہیں ہے جو 1940ء کی دہائی میں غلامی کے ماحول کے باوجود ہمارے اندر موجود تھی۔

گزشتہ عرصہ میں ملک کے اندر نظریاتی تعلیم کے فقدان اور مغربی نظریات و افکار (سیکولرازم، لبرل ازم، روشن خیالی، اباحیت پسندی اور فکری آزادی وغیرہ) نے ہمارے معاشرہ سے نظریاتی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ نظامِ تعلیم کی خرابی کا رونا اپنی جگہ، فلموں، ڈراموں، اخبارات اور اب انٹرنیٹ کمپیوٹر اور موبائل فون کی وبا نے کچھ نظریاتی اثاثہ بچا تھا تو اس کو بھی آگ لگا دی ہے جو بجھنے کا نام نہیں لیتی کہ ہم اس آگ کو بجھانے کا شعور ہی نہیں رکھتے۔

مزید برآں مغربی پروپیگنڈا میں آ کر ہمارے ہاں نئی نسل کے اذہان میں اپنے دین اور اسلامی تشخص کے لیے کچھ کر گزرنے کا جذبہ معدوم ہوتا جا رہا ہے اور جسم و جان کے تقاضوں کو پورا کرنا اور مادی ضروریات کا خیال ہی مقصد حیات بن چکا ہے۔لہٰذا ـــــ ملکی سطح پر ہمارے ہاں

ایک مسلمانی جذبہ اور WILL کہ ہم مسلمان ہیں اور بن کے رہیں گے اور جو کوئی ہمیں اس سے روکے گا اس سے خود نمٹیں گے، زوال پذیر ہے۔

O ملکی سطح پر دیکھیں تو صاف نظر آئے گا ہر چہار طرف سیاسی جماعتوں، مذہبی جماعتوں اور تعلیمی اداروں، میں قیادت کا فقدان ہے۔ ایسی قیادت جو ہر قسم کی کرپشن (CORRUPTION) سے پاک ہو، ملنا محال ہے یہ صورت حال کچھ بیس برس سے ہوئی ہے ورنہ قیام پاکستان اور اس کے بعد تک ملّی اور قومی سوچ رکھنے والی قیادت نہ صرف نمایاں تھی بلکہ اس کا ملکی معاملات پر HOLD بھی تھا۔

قیادت کے اس خلا سے بھی ملکی اور ملّی مسائل میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے کہ اہل لوگ مایوس ہو کر کونوں کھدروں میں جا بیٹھے ہیں اور جو قیادت سامنے ہے اس کے دامن پر ہر طرح کی کرپشن کے داغ ہیں (الا ماشاءاللہ)۔

O ریاست پاکستان کے ان حالات کا ایک تجزیہ وہ ہے جو مغرب کے ادارے مخازن فکری (THINK TANKS) کر رہے ہیں اور گزشتہ تین چار عشروں سے ان کی سوچ اور منصوبوں کے اشارے کبھی نہ کبھی میڈیا میں چھپانے کے باوجود چھلک کر عوام تک پہنچ جاتے ہیں جس سے مایوسی کی فضا پیدا ہوتی ہے؟ بلوچستان کی صورت حال، سندھ کی صورت حال اور FATA کے معاملات کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

گزشتہ سال سے ہمارے سیاسی و عسکری قیادت نے کرپشن کو ختم کرنے اور ملک کے طول و عرض میں امن کے قیام کے لئے کرپشن کے بڑے بڑے مگرمچھوں اور دہشت گردوں کے گرد گھیرا تنگ کیا ہوا ہے اور گرفتاریاں بھی ہوئی ہیں۔

تاہم ـــــ یہ بات کیا قابل توجہ نہیں ہے کہ ہم گزشتہ کرپشن جو ہو چکی اس کو پکڑنے کی کوشش کریں اور ایک معینہ مدت کے لئے سمت اقدامات اور پکڑ دھکڑ کا معاملہ کریں (یقیناً اس سے ملکی معاملات میں امن و امان اور دہشت گردی کی کارروائیوں میں بہت حد تک کمی آ گئی مگر یہ کارروائی تو صرف مرض کی شدت کو کم کرنے کی کوشش ہے اصل مرض کا علاج تو نہیں!

O مرض کا اصل علاج تو یہ ہے کہ بالکل ظاہری طور پر ہی دیکھیں ـــــ تو نظر آئے گا کہ

جس کرپشن کے ماضی کے CASES پر ہم ہاتھ ڈال رہے ہیں درست ہے مگر کتنے مجرموں کو ہم کیفر کردار تک پہنچا سکیں گے۔ پھر اس میں جانبداری کے عنصر کا احساس بھی دبے لفظوں میں پریس آتا رہتا ہے تاہم مستقبل میں یہی ہمارا سرکاری عملہ اور سیاست دانوں کا گروہ (جو ابھی ذرا دبک کر بیٹھ گیا ہے) کیا کرنے والا ہے؟ اس کا سدباب کیا ہے؟

O مستقبل کی کرپشن روکنے اور ملک میں کرپشن سے آگہی اور انصاف کی فراہمی کے لیے کچھ اقدامات ہیں جو فوری طور پر ہماری فوجی اور عسکری قیادت کو کرنے چاہیں اور کچھ اقدامات ہیں جو دور رس نتائج کے حصول کے لئے LONG-TERM PLANNING کہلاتے ہیں ضروری ہیں۔

(i) فوری کرنے کے کاموں میں اہم قدم یہ ہے کہ عوام کی آگہی اور شعور کی بیداری کے لئے کرپشن کے خلاف ذہن سازی کی ضرورت ہے۔ اس میں ہمارے سرکاری اہل کار اور فوج کے اہل کار بھی شامل ہیں۔ عدلیہ کے اہل کار بھی شامل ہیں اور پرائیویٹ سیکٹر کے تاجر، بزنس مین، فیکٹری مالکان، امپورٹرز اور ایکسپورٹرز سبھی شامل ہیں۔ مستقبل کی قیادت جو آج سکولوں کالجوں اور اعلیٰ تعلیمی اداروں میں زیر تعلیم ہے، وہ بھی اسی زُمرہ میں آتی ہے کہ ـــــ ان کی ذہن سازی کی جائے کہ کرپشن بری بات ہے۔ نیز امانت، دیانت، اللہ اور اس کے رسول سے وفاداری اور عہد کی پابندی کی اہمیت وضرورت پر ان کو معلومات دی جائیں۔

O زمانۂ حال میں اس کام کے لئے اشتہارات، ہینڈ بل اور خطباتِ جمعہ بھی ہیں، مگر جتنی میڈیا کی اہمیت تھی وہ محتاجِ بیاں نہیں۔ لہٰذا ـــــ ہماری ملکی سیاسی قیادت اور عسکری قیادت کو میڈیا کے ضابطہ اخلاق کو اس نقطہ نظر سے دیکھنا چاہئے اور ان کی ذمہ داریوں میں کرپشن کے آگہی کے لئے لیکچرز، سیمینار، ٹاک شوز، ڈرامے اور اشتہارات کا اہتمام کرنا چاہئے۔ اس بات کا خیال رہے کہ سگریٹ کے اشتہار کی طرح سگریٹ کی برائی بھی بیان ہوتی ہے مگر سگریٹ کی فروخت بھی بڑھ رہی ہے ایسا معاملہ نہ ہو۔ میڈیا پر پرائم ٹائم میں جب زیادہ سے زیادہ لوگ چھوٹی سکرین پر متوجہ ہوتے ہیں ان کے اصلاحی گفتگو اور اہل علم کے خطابات، آیات قرآنی اور احادیث کے علاوہ ملکی قیادت کے بیانات اور خطابات کے اقتباسات بار بار پیش کئے جائیں تاکہ عوام میں اس سے

متعلق شعور پیدا ہو۔ صرف یہی نہیں مار دھاڑ HORROR PICTURES اور اخلاق سوز مواد کو حذف کر کے کرپشن (مالی اور اخلاقی) کے حوالے سے مثبت اقدار اور معلومات ناظرین کے ذہن میں ڈالی جائیں تو امید ہے کہ ـــــ اس کا جلد نتیجہ نکلے گا اور کرپشن کے خلاف موجود ملک گیر کی طرح میڈیا پر کرپشن آگہی سال دو سال کے لئے نہیں میڈیا کے پروگراموں کا مسلسل حصہ بنے اور اس بنا پر اچھے پروگراموں پر TV چینلز کی ریٹنگ کی جائے اور ایوارڈز بھی دیے جائیں۔ اینکر پرسن کو بھی ایوارڈ اور تمغہ جات سے نوازا جائے۔ تعلیمی اداروں میں سیمینارز، لیکچرز اور سٹاف کو نمونہ کا کردار پیش کرنے کے لئے اساتذہ اور دیگر سٹاف کے NIPA اور ٹریننگ سکولوں میں تربیتی کورسز کئے جائیں تا کہ مثبت نتائج حاصل ہوں۔

O ہمارے ملک کی سول سروس کے تربیتی ادارے، فوج کے ٹریننگ سنٹرز، پولیس، عدلیہ اور اساتذہ کی تربیت کے اداروں کے نصاب میں بھی یہ چیز شامل ہوتا کہ ملک گیر سطح پر کرپشن کے خلاف ایک نفرت (HATRED) پیدا ہو جائے ـــــ تو موجودہ مہم بھی مثبت اور کارآمد ثابت ہوگی۔

O دوسرے مرحلے میں دور رس نتائج (LONG-TERM PLANNING) کے لیے ہمارے لئے کرنے کا ایک ہی کام ہے کہ ہم ملکی سطح پر نظریۂ پاکستان اور قیامِ پاکستان کے مقصد کی طرف پلٹ کر اپنا فکری اور نظری قبلہ صحیح کر لیں۔

اس بات میں کوئی دو رائیں نہیں ہیں کہ پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے اور اس ملک کا نظریہ حضرت محمد ﷺ کا لایا ہوا دین اسلام ہے، ملک میں 97% مسلمان ہیں جو اس نظریہ کی حقانیت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ پاکستان کے نظریاتی ملک ہونے کا ثبوت بانی پاکستان کی 1940ء سے 1947ء تک وہ تقاریر ہیں جو ریکارڈ ہیں جن میں سے صرف ایک کا حوالہ کافی ہے:

> قائدِاعظم محمد علی جناح نے اپنی وفات بتاریخ 11 ستمبر 1948ء سے دو تین دن پہلے پروفیسر ڈاکٹر ریاض علی شاہ سے فرمایا: ''تم جانتے ہو کہ جب مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ پاکستان بن چکا ہے تو میری روح کو کس قدر اطمینان ہوتا ہے! یہ مشکل کام تھا اور میں اکیلا اسے کبھی نہیں کر سکتا تھا۔ میرا ایمان ہے کہ یہ رسولِ خدا ﷺ کا

روحانی فیض ہے کہ پاکستان وجود میں آیا۔ اب یہ پاکستانیوں کا فرض ہے کہ وہ اسے خلافت راشدہ کا نمونہ بنائیں تا کہ خدا اپنا وعدہ پورا کرے اور مسلمانوں کو زمین کی بادشاہت دے۔''

(بیان ڈاکٹر ریاض علی شاہ صاحب، روزنامہ جنگ 11 ستمبر 1988ء)

قائداعظم کی تقاریر سے بھی زیادہ مصور پاکستان اور مفکر پاکستان کی شخصیت ہے جو بجا طور پر مصور پاکستان ہیں وہ صرف وکیل نہیں، صرف شاعر نہیں، صرف مسلمان رہنما نہیں بلکہ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے بارے میں قرآن وحدیث، تاریخ عصر حاضر کے تقاضے اور اسلام کے مستقبل کے نقطۂ نظر سے صائب رائے رکھنے والے ایک حکیم اور دانا انسان تھے ایک فلسفی تھے ان کی شاعری کوئی گل وبلبل کی شاعری نہیں با مقصد شاعری ہے اور قرآن و حدیث کی ترجمانی والی شاعری ہے۔

اگست 1947ء میں کوئی عوامی سروے ہوتا تب بھی اور آج پاکستان کے مسلمانوں میں سروے کرایا جائے تب بھی، قیام پاکستان کے لئے سب سے زیادہ کام کرنے والی مسلمانوں کی فکری غذا بہم پہنچانے والی عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق قرآن وحدیث کے اطلاق پر گفتگو کرنے والی واحد شخصیت علامہ اقبال ہیں۔

گزشتہ ایک باب میں جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کا فکری ونظریاتی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ فقہ حنفی کے قائل، مولانا روم کے شاگرد، ابن عربی کے قدردان، تصوف کی اصلاح کے ساتھ اس کے قائل اور صوفیاء سے ربط وضبط رکھنے والے، جدید تعلیم یافتہ واحد شخصیت جو جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے فکری ورثہ کی صحیح نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ عالم واقع میں کوئی اور شخصیت ان تمام شعبوں میں ان کے قریب بھی کوئی نہیں پھر یہی نہیں ____ 1911ء کی نظم شکوہ اور 1913ء کی جوابِ شکوہ سے لے کر آج تک برطانوی ہند کے مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن اور عوام الناس کے احساسات کے صحیح ترجمان بغیر کسی زمانی انقطاع کے آج بھی وہی علامہ اقبال ہیں جو 1930ء کے خطبہ الٰہ آباد کے موقع پر تھے۔

پاکستان کے قیام کی جدوجہد کے وقت جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی اکثریت اوپر

درج تجزیہ کے مطابق حنفی مسلک اور امام غزالی و رومی و ابن عربی کی قدر دان ہے (اس میں جہاں اصلاح کی گنجائش ہو تو وہ دعوت و تبلیغ کا الگ میدان ہے مجدد ین امت کا اللہ تعالیٰ بھلا کرے انہوں نے ہر دور میں یہ ذمہ داری نبھائی ہے۔ مجدد الف ثانی نے صوفی ہوتے ہوئے ـــــ صوفیاء کی بے عملی اور بے راہ روی پر سخت تنقیدیں کی ہیں۔ خود علامہ اقبال کا فلسفہ ابن عربی کے فلسفہ کے عوامی تصور (جس میں بے عملی، جمود، تعطل اور گرد و پیش کے حالات و واقعات سے لاتعلقی کا عنصر پایا جاتا ہے اس) سے اعلان بیزاری بھی کیا ہے اور اس کی اصلاح کی کوشش بھی کی ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری میں صوفیاء، گدی نشینوں اور روایتی پیروں پر جو بلیغ اشعار میں وہ اس بات کا ثبوت ہیں صوفیاء کیا علماء کے طبقہ کے بے عمل اور نام کے علماء پر بھی ان کی تنقیدیں اہل علم سے چھپی ہوئی نہیں ہیں۔ یہ علامہ اقبال کے خلوص و اخلاص کا ہی نتیجہ اور ملّی مسائل کی صحیح تشخص اور علاج کا ہی ثمرہ ہے جو آج تک مسلمانانِ ہند ان کو دیتے آ رہے ہیں کہ گزشتہ ایک صدی سے دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور شیعہ مسلک کے تمام نامور خطباء و واعظین اپنے خطبات کو علامہ اقبال کے کلام سے مزین کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور علامہ اقبال اس بات کے مستحق بھی ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ پاکستان کے موجودہ مسائل کے حل کے لئے نظریۂ پاکستان کی طرف رجوع ہی واحد حل ہے اور نظریۂ پاکستان ـــــ علامہ اقبال (جو مفکر پاکستان بھی ہیں) کے افکار و نظریات کا دوسرا نام ہے۔ بالفاظ دیگر ـــــ پاکستان کے حصول کی جدوجہد اور قیام میں جو جذبہ کارفرما تھا اور آج اس کی حفاظت کی ضرورت ہے وہ جذبہ ـــــ علامہ اقبال کی پیش کردہ قرآن و حدیث و تاریخ اسلامی کی تشریح کا دوسرا نام ہے۔ فقہ اور عقائد کے میدان میں ان کی فلسفیانہ شاعری ایسی معرکہ آرا چیز ہے کہ دنیا ان کی معتقد ہے۔ ان کا فلسفۂ خودی قرآن مجید کے لفظ 'رُوح' کا ایک فلسفیانہ نام ہے اور روح کے علیحدہ تشخص کے اثبات سے تصوف کے تمام مثبت تصورات کا اثبات ضروری ہے جو ہمارے دین میں 'احسان' کی اصطلاح میں مضمر ہے۔

علامہ اقبال عصر حاضر کے نمائندے ہیں

O جنوبی ایشیا میں اکبر کے عہد سے اُمت مسلمہ کو جو اضافی نصف دن ملا تھا اور جس کے دوران اُمت مسلمہ کے بیشتر اور نامور مجدّدین جنوبی ایشیا میں ہی آئے ہیں، ان چار صدیوں کی مساعی کی ایک مختصر تاریخ پہلے بیان ہو چکی ہے۔ ایک نئے نقطہ نظر سے بھی اس بحث کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔

O ہمارے ہاں ایک روایتی علم دین ہے اور رجالِ دین ہیں اور مجدّدین کا سلسلہ ہے جو جنگ آزادی تک نمایاں رہا ہے اور اس بات میں کوئی دو رائیں ممکن نہیں ہیں کہ 1857ء کی جنگ آزادی تک مسلمانوں کی قیادت علماء وصلحاء کے پاس تھی۔ تحریک شہیدین ہو یا احمد شاہ ابدالی کو دعوتِ سفر ہند، یہ علمائے حقانیہ کی قیادت کی دلیل ہے جنگ آزادی میں وارثانِ تحریک شہیدین ہوں یا مولانا فضل حق خیر آبادی کے ہم خیال ـــــ بہر حال ہیں طبقہ علماء کے ہی افراد۔

O 1857ء کی جنگ کے ہنگاموں کے بعد 1860ء سے ہند کی حکومت اور معاملات ایسٹ انڈیا کمپنی (EIC) کی بجائے براہِ راست تاج برطانیہ اور RULE OF LAW کے تحت آ گئے (یہ LAW کوئی عادلانہ مفہوم میں نہیں تھا برطانیہ میں LAW کا مفہوم الگ تھا اور محکوم وغلام علاقہ 'ہند' کے باسیوں کے لئے یہ LAW کچھ اور معنی رکھتا تھا)۔ اس نئے انتظامی فیصلہ کے تحت برطانوی اقتدار مستحکم ہوا تو مغربی نظامِ تعلیم، سکول کالج اور یونیورسٹیاں بنائی گئیں اس موقع پر مسلمان اُمت میں دو نقطہ ہائے نظر پیدا ہوئے۔

O ایک نقطۂ نظر یہ تھا جس کے سرخیل جناب سرسیّد احمد خان تھے جو بدلے ہوئے حالات

میں انگریزوں کے ساتھ تعاون کی پالیسی کے حامی تھے اور یوں مسلمانوں کی سیاسی و اقتصادی بہتری کے لئے انگریزی نظام سے استفادے کے بھی قائل تھے۔ انگریزی تعلیمی اداروں کے بارے میں مسلمانوں کے دلوں میں علماء نے نفرت ڈال دی تھی اور قیادت اس وقت تک علما کے ہاتھوں میں تھی لہٰذا ـــــ مسلمان انگریزی تعلیمی اداروں سے دُور رہنے میں عافیت محسوس کرتے تھے۔ اسی لئے سرسیّد احمد خان نے خود آگے بڑھ کر مسلمانوں کے اپنے تعلیمی ادارے بنانے کا عزم کیا کہ چلو انگریزی اداروں میں نہ سہی مسلمانوں کے اپنے بنائے ہوئے تعلیمی اداروں میں جدید علوم حاصل کرو۔ مگر علماء کا مؤثر طبقہ انگریزی تعلیم اور انگریزوں سے تعاون کے خلاف تھا۔ لہٰذا علماء نے مدارس بنانے کا فیصلہ کیا تاکہ علوم دینیہ پڑھائیں جس سے ہمارا دین وایمان بچ جائے چاہے دنیاوی ترقی اور سرکاری ملازمتوں کے حوالے سے مسلمان پیچھے ہی رہ جائیں۔

لہٰذا ـــــ عجیب اتفاق ہے کہ مسلمانوں کا اس طرح کا غیر سرکاری پہلا مدرسہ دیوبند میں (ایک استاد اور ایک شاگرد سے) 1867ء میں قائم ہوا اور اسی سال دیوبند کے تھوڑے فاصلے پر علی گڑھ میں سرسیّد احمد خان نے علی گڑھ پرائمری سکول کی بنیاد رکھی۔

O دیوبند کا مدرسہ بھی پھلا پھولا اور بعد میں عالمی شہرت کا دارالعلوم بن گیا اس کاوش کی تقلید میں مسلمانوں نے اور بھی تعلیمی ادارے قائم کیے۔ اسی طرح علی گڑھ کا پرائمری سکول بھی بڑھتے بڑھتے 1920ء میں علی گڑھ یونیورسٹی بن گیا حالانکہ سرسیّد احمد خان اور مولانا قاسم علی نانوتوی ایک ہی استاد کے شاگرد بھی تھے (مولانا یعقوب علی نانوتوی)۔

سرسیّد احمد خان مدتُ العمر انگریز سے تعاون کی پالیسی پر عمل پیرا رہے اور آخری عمر میں اپنے اس تجربے کے متوقع فوائد نہ دیکھ کر بددل بھی تھے تاہم انہوں نے مسلمانوں میں ایک الگ نقطۂ نظر پیدا کیا جو دیوبند کے نقطۂ نظر سے مختلف تھا۔

O دوسری طرف دیوبند کے مدرسے (اور علماء کے دوسرے مدارس) کا حال اور نقطۂ نظر تھا۔ علی گڑھ اور دیوبند کے نقطۂ نظر میں قرب اور تطبیق کی پہلی کوشش خود شیخ الہند نے فرمائی۔ شیخ الہند 1920ء میں مالٹا کی قید سے رہا ہو کر آئے تو بیماری کے باوجود علی گڑھ تشریف لے گئے اور علی گڑھ سے تعاون کی راہ نکالنے کی ابتدا کی۔ مگر نومبر 1920ء میں آپ وفات پا گئے تو یہ بات آگے نہ

بڑھ سکی۔ حضرت شیخ الہند کے خطبۂ علی گڑھ کے الفاظ کا مفہوم یہ تھا کہ میں علی گڑھ کے کچھ طلباء میں سُنّت کا نور (ڈاڑھی دیکھ رہا ہوں) اور آزادی کے جس جذبے کے لیے میں کام کر رہا ہوں اس کے قدردان میری نظر میں مدارس میں کم اور جدید تعلیمی اداروں میں زیادہ ہیں۔

حضرت شیخ الہند کی وفات کے بعد ہند کی متفقہ مسلم قیادت جمعیت علمائے ہند قائم نہ رہ سکی اور شیخ الہند کے جانشین دیوبند کے علاوہ دوسرے دینی علمی مراکز کے اکابرین کو ساتھ لے کر نہ چل سکے لہٰذا شیخ الہند کی وفات کے بعد دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور شیعہ قیادتیں الگ الگ ہوگئیں۔ کسی غلط فہمی کی بنیاد پر غیر دیوبندی حضرات کو بریلوی ہی شمار کیا گیا۔ حالانکہ مولانا فضل حق خیرآبادی اور فرنگی محل کے علماء کا اپنا ایک مستقلاً علمی مزاج اور نقطہ نظر تھا مگر ـــــ جو ہو چکا وہ ہو چکا۔

ہمارے نزدیک 1920ء کے بعد جو بڑی تبدیلی آئی وہ یہ تھی کہ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں نے تحریک خلافت چلائی جس سے انگریز کی غلامی سے آزادی کے جذبہ کو جلا ملی۔ اس تحریک میں جو قیادت سامنے آئی وہ علماء کی کم اور جدید تعلیم یافتہ حضرات کی زیادہ تھی۔ ابتداء میں اس قیادت کا علماء سے زیادہ ربط وضبط بھی نمایاں تھا مگر وقت کے ساتھ ساتھ یہ فاصلہ بڑھتا چلا گیا اور علماء حالات وواقعات کی رفتار کا صحیح اندازہ نہ کر سکنے کی وجہ سے حالات کے صحیح تجزیے میں ذرا پیچھے رہ گئے چنانچہ 1935ء کے بعد جب مسلم لیگ فعّال ہوئی اور مسلمانوں نے ایک جماعت کے طور پر کام کرنا شروع کیا تو قائداعظم اس مسلم لیگ کے صدر بنے اور ان کے ساتھ فکر علامہ اقبال کا تھا۔ چنانچہ علامہ اقبال کی شاعری کے پیدا کردہ جذبہ کے تحت عوام مسلم لیگ کی تحریک آزادی کی طرف کھچے چلے آئے، تحریک خلافت کی قیادت کا بیشتر حصہ بھی مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو گیا۔

قیامِ پاکستان تک یہ بات واضح ہوگئی کہ اگرچہ کچھ علماء وصوفیاء مسلم لیگ کے ساتھ بھی تھے اور نمایاں تھے اور شخصیات بھی بھاری بھرکم تھیں اور مسلمان علماء کا ایک دوسرا طبقہ کانگریس کے ساتھ چلا گیا۔ وجہ کوئی بھی ہو یہ صورت حال بڑی واضح اور ایک حقیقت تھی ـــــ نتیجہ یہ نکلا کہ قیامِ پاکستان کے بعد عملی طور پر جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی قیادت تحریک خلافت سے شروع ہو کر اب مکمل طور پر جدید تعلیم یافتہ حضرات کے ہاتھ میں چلی گئی اور مذہبی قیادت مسلم لیگ یا کانگریس کے پلیٹ فارم پر صرف اتحادی اور مؤید کے طور پر سامنے آئی۔

O ہمارے نزدیک جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کے اجتماعی مسائل کے حل کے لئے قیادت کی یہ تقسیم کہ ـــــ ایک طبقہ علماء کے زیر اثر چلا گیا اور آج بھی ہے اور دوسرا طبقہ (جدید تعلیم یافتہ) وہ جدید تعلیم یافتہ مسلمان قیادت کے زیر اثر چلا گیا۔ ایک حقیقت بن گئی۔

اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ معاملہ بھی ان دونوں کی قیادتوں کے خلوص و اخلاص اور خارجی و عالمی حالات کے فہم و ادراک کے عین مطابق فرمایا۔

O علماء کی قیادت کا ایک سرگرم طبقہ تھا جو تحریک شہیدین کا وارث اور حضرت شیخ الہند کے جذبۂ آزادی کا حامل تھا۔ جبکہ دوسری طرف دیگر مراکز علمی کے علماء (علمائے بریلی وغیرہم) اور صوفیاء جو عملی طور پر اسلام کے احیاء اور خلافت کے قیام کے لئے اپنے طور پر زیادہ سرگرم نہیں تھے، انہوں نے مسلم لیگ کا ساتھ دیا تھا اور بعد میں بھی کبھی کبھی سیاست میں نمایاں ہوتے رہے۔

O وارثانِ تحریک شہیدین (علمائے دیوبند اور شاہ اسماعیل کے افکار کے زیر اثر اہل حدیث مکتب فکر کا ایک حصہ) نے اپنی روایات کو سنبھال کر رکھا اور آگے بڑھایا۔ جدید علوم سے وہ شغف پیدا نہ کیا جو رفتارِ زمانہ کا تقاضا تھا۔ جبکہ دوسری طرف علامہ اقبال کے افکار، دینی فکر اور اسلام کے اپنے نظام اقدار اور تعلیمات کی حقانیت کے احساس کے ساتھ جدید تعلیم یافتہ حضرات میں سے بڑا طبقہ تحریک پاکستان میں بھی شامل رہا اور پاکستان آکر اب تک یہی طبقہ مؤثر ہے اور غیر مرئی طور پر حکومت چلا رہا ہے۔

O گو محمد بن عبدالوہاب اٹھارھویں صدی کے آدمی ہیں تاہم ان کی دینی مساعی اور امام ابن تیمیہ کے افکار و نظریات کے تحت خلوص سے مسلسل محنت کا نتیجہ 150 سال بعد سامنے آیا کہ اللہ تعالیٰ نے امام ابن تیمیہ کے ماننے والوں کے لئے سعودی عرب میں ایک ریاست کا قیام ممکن بنا دیا اور یہ ریاست علامہ ابن تیمیہ اور محمد بن عبدالوہاب کے افکار کی نمائندہ ریاست قرار پائی اور الحمدللہ اب تک قائم ہے۔ اس ریاست نے اسلام کے احیاء کے لیے کتنا کام کیا ہے اور اجتماعی زندگی کے معاملات کو عصر حاضر کے وسائل کے ساتھ خلافت راشدہ سے کس قدر قریب کر سکے ہیں اس کا فیصلہ مستقبل کا مؤرّخ کرے گا۔

دوسری طرف جنوبی ایشیا میں مجدّدین کے ارتکاز سے جو دینی جذبہ وجود میں آیا اس کا

ایک حصہ تحریک شہیدین کے وارثان کے نام سے علماء کی قیادت کام کرتا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے اس تحریک شہیدین کے کشمیر، کے پی کے (فاٹا) اور افغانستان سے تعلقات کی بنا پر اسی طبقہ علماء کے تربیت یافتہ افغان طالبان کے ذریعے 1996ء میں افغانستان میں ایک اسلامی ریاست کے قیام کو ممکن بنا دیا اور اس نے علماء کے خلوص و اخلاص کی بے پناہ طاقت کی بنیاد پر ایک مثالی اسلامی قبائلی ریاست کا روپ دھار لیا۔ جب تک یہ ریاست قائم رہی افغان طالبان نے اسلام کی درویشی کی قیادت کا عصر حاضر میں زندہ نمونہ پیش کیا اور امر ہو گئے۔ ان کے خلاف مغرب اُمڈ آیا اور نائن الیون کے بعد کے واقعات سب کے سامنے ہیں۔ یہ اس طبقۂ افغان طالبان کے خلوص و اخلاص کا ہی نتیجہ ہے کہ وہ نہ صرف اب تک دشمنوں کے گھیراؤ کے باوجود زندہ ہیں اور مؤثر ہیں بلکہ NATO کو دندان شکن شکست سے دوچار کر کے گھر بھجوا چکے ہیں۔

O 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد جدید تعلیم یافتہ مخلص مسلمان طبقہ جو مسلم لیگ کے ساتھ آیا تھا اور جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی اکثریت کی نمائندگی بھی کرتا تھا اور حالاتِ حاضرہ سے واقف بھی تھا ــــ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس طبقے ــــ کے افراد (علامہ اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح اور ان کے ساتھی) کے ذریعے 1947ء میں پاکستان جیسی عظیم الشان سلطنت عطا کر دی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا احسان تھا یہ لوگ جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے تھے اور مغربی علوم سے واقف حال، دینی جذبہ سے سرشار مسلمان تھے۔ علامہ اقبال کو اللہ تعالیٰ زندگی دیتا یا ان کی زندگی میں پاکستان بن جاتا تو حالات مختلف ہوتے یا قائداعظم کو اللہ تعالیٰ مزید مہلت عمر دیتا تو کیا ہوتا ــــ بہرحال مَا شَاءَ اللّٰهُ كَانَ وَ مَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُن اس ملک کو اس جدید تعلیم یافتہ طبقے نے تحریک پاکستان میں شامل علماء کرام کے ساتھ مل کر جیسے چلایا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ نصب العین سے دُوری میں اس طبقہ میں مجموعی طور پر مغرب سے مرعوبیّت بھی ایک عنصر ہو سکتا ہے یا ــــ مغرب کے مقتدر طبقہ اور ایجنسیوں کا اپنی جگہ یہ خوف کہ اصلی خطرہ کی جگہ تو یہ ملک پاکستان ہے کہ یہ جمہوریّت کے ذریعے وجود میں آیا ہے یہاں علامہ اقبال کے افکار کے مطابق ریاست کا نقشہ بن گیا تو وہ مغرب کے نظامِ سرمایہ داری اور نظامِ جمہوریت کے لئے موت کا پیغام ہوگا لہٰذا مغرب نے اس پاکستان کو دبایا بھی ہے اور اس پاکستان کو ذریعہ بنا کر برادر ملک افغانستان پر بھی چڑھائی کی ہے اور تا حال یہ

ملک اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکا یعنی اپنے مقصد وجود اور علامہ اقبال کے افکار و نظریات اور حکمت کی روشنی میں ایک جدید اسلامی فلاحی عوامی ریاست بن سکنے کے مقصد کو نہیں پہنچ سکا۔

مستقبل کی خبر تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے مگر عقل اور منطق کا اس دنیا کے معاملات کے فہم میں جتنا کچھ دخل ہے اگر وہ لائق اعتناء ہے تو یہ بات غیر منطقی ہوگی کہ 1940ء سے 1947ء تک جدید تعلیم یافتہ حضرات کی ایک بڑی تعداد اپنا مستقبل اور مشاغل کو چھوڑ کر آئی لوگوں نے اپنی جوانیاں داؤ پر لگا دیں، خوشنما کیریئر چھوڑ دیے، گھر بار چھوڑ دیے، عزت و آبرو کا بھی خیال نہ رکھا اور لاکھوں لوگ اس ملک خداداد پاکستان کی خاطر بے گھر ہو گئے، آباؤ اجداد کی پونجی لٹوادی، عورتوں، بچوں، بوڑھوں، جوانوں نے لاکھوں کی تعداد میں جانوں کی قربانی دے دی جبکہ نعرہ تھا تو ربّ کائنات کے نام کا ــــ پاکستان کا مطلب کیا لا اِلٰہ اِلا اللہ ــــ اور یہ سارا عمل ضائع ہو جائے اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ مغرب نے مفکّر پاکستان کے افکار کو پاکستان میں پنپنے نہیں دیا جیسے دودھ پیتے بچے کو ماں سے جدا کر دیتے ہیں، اسی طرح اس ملک کے مخلص طبقے کو نظریۂ پاکستان اور فکر اقبال یا حکمت اقبال سے بالارادہ دور رکھا گیا تاکہ یہ فکر مر جائے۔ مگر نظریات مرا نہیں کرتے اور فکر میں جان ہو تو دبائی تو جا سکتی ہے ختم نہیں کی جا سکتی۔ حالات و واقعاتِ عالم کا تقاضا بھی یہی ہے اور تاریخ عالم کا سبق بھی ــــ کہ ہر عروج کے بعد زوال ہے لہٰذا ــــ آج کی مؤثر طاقت امریکا کو بھی زوال تو آنا ہے جیسے 1990ء میں روس کو آیا تھا، یہ زوال کب آئے یہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں اتنا معلوم ہے کہ آئے گا ضرور۔ جب بھی امریکہ زوال پذیر ہوگا ــــ وہ موقع ہوگا کہ پاکستان مغربی PRESSURE سے آزاد ہو اور اپنے مقصدِ وجود ــــ نظریۂ پاکستان یعنی فکرِ اقبال اور حکمت اقبال کی طرف رجوع کرے اور یہاں بالآخر دورِ حاضر کی جدید اسلامی فلاحی عوامی درویشانہ ریاست قائم ہو جو مثالی ہوگی اور اپنے نظریے کی صداقت اور سیّدنا حضرت محمد ﷺ کی ختم نبوت کے تقاضے کے طور پر وسعت پذیر ہو کر واحد عالمی فلاحی نظریاتی ریاست کا روپ اختیار کرے گی۔ ان شاء اللہ

باب 10

☆ فکر اقبال یا حکمت اقبال کیا ہے؟ 221

☆ فکر و حکمت اقبال کیا ہے؟ درویش صفت حکمران 222

☆ ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی کتاب 'حکمت اقبال' 225

فکرِ اقبال یا حکمت اقبال
کیا ہے؟

پاکستان کی معروضی حالات میں یہ بات کسی لمبے چوڑے فلسفہ کی متقاضی نہیں ہے کہ اس ریاست کے داخلی حالات بھی حد درجہ اصلاح طلب ہیں اور مجموعی طور پر یہ ملک جس رُخ پر جا رہا ہے وہ رُخ بھی اس ملک کے اساسی نظریہ اور فکر سے متصادم ہی نہیں بلکہ متضاد ہے۔ اسی انتہائی ناپسندیدہ صورت حال کا تقاضا تھا کہ ملک میں کرپشن کے خلاف ایک ملک گیر آپریشن سختی سے جاری ہو، جو الحمدللہ جاری ہو چکا ہے اور آہنی ہاتھ سے نمٹے جانے کی وجہ سے ملک میں دہشت گردی کے واقعات میں حیرت انگیز حد تک کمی آ گئی ہے۔ تاہم اس مہم کی کامیابی کے لئے کرپشن کے خلاف عوام اور نئی نسل کی مستقلاً ذہن سازی کی سخت ضرورت ہے تاکہ آنے والی نسل کے افراد جو 15 سال بعد اس ملک کی باگ دوڑ سنبھالنے والے ہیں، ان کی ترجیحات ابھی سے درست ہو جائیں اور ہر سطح اور ہر شعبہ کے تربیتی اداروں کے نصاب میں بھی کرپشن کے خلاف باتیں شامل کی جانی ضروری ہیں تاکہ اس اپریشن کے پائیدار نتائج برآمد ہو سکیں۔

تاہم ـــــ ملک کی جو مجموعی، اخلاقی، فکری، نظریاتی اور سیاسی صورت حال ہے اس کے پیش نظر ریاست پاکستان کو اپنے قبلے کی درستگی اور اپنے ریاستی اہداف و نصب العین کو از سرِ نو تازہ کرنے (REVISIT) کرنے کی ضرورت ہے اور ہمارے نزدیک ریاست پاکستان کا نظریہ اور نصب العین مصوّر پاکستان علامہ اقبال کی فکر و حکمت اقبال ہے۔

ہمارے نزدیک یہ حقیقت بھی ناقابل تردید حد تک درست ہے کہ پاکستان کی ریاست کے نظریہ و نصب العین کی وضاحت کا حق بلا شرکت غیرے صرف اور صرف علامہ اقبال کو حاصل

ہے۔اس کے علاوہ انتشار ہی انتشار ہے اور کوئی دوسرا راستہ (OPTION) اس ریاست کے پاس موجود ہی نہیں ہے۔ یہ حقیقت اگر آزادی کے فوراً بعد مان لی جاتی تو آج ہم ایک ترقی یافتہ اور کامیاب ریاست کے طور پر دنیا کی رہنمائی کے منصب پر فائز ہوتے۔ چلئے! جو وقت گزر گیا سو گزر گیا۔اب بھی اس حقیقت کا ادراک کرلیں تو صبح کے بھولے کا شام کو گھر آجانے کے مترادف ہوگا۔ بصورت دیگر دشمنوں کے دانشور اور تھنک ٹینک تو دو عشروں سے پاکستان کو ایک ناکام ریاست اور ناد ہندہ ریاست کے طور پر ایک بند گلی میں پہنچانے کے لئے سرگرم ہیں۔

فکر وحکمت اقبال کیا ہے؟

فکر وعمل کا انقلاب ___ درویش صفت حکمران

علامہ اقبال جو مصوّر پاکستان اور مفکّر پاکستان کے القابات سے یاد کئے جاتے ہیں ان کا فکر اور ان کے فرمودات کی عام فہم ترجمانی کیا ہے، یہ ایک تفصیل طلب بلکہ ایک تصنیف کا متقاضی ہے۔تاہم چند بنیادی نکات درج ذیل ہیں۔

O تحریک پاکستان کے آغاز ہی سے مسلمانانِ جنوبی ایشیا کے لئے جو شخصیت کسی فرقہ وارانہ تعصّب سے پاک اور اپنے علم و مرتبت و جذبات کے لحاظ سے مسلمانوں کے ہر مسلک و مذہب کے لوگوں کے لئے قابل قبول ہے وہ علامہ اقبال ہی کی شخصیت ہے۔ یہ بات چونکہ ایک بدیہی حقیقت ہے اسی لئے دشمن اپنے کارندوں کے ذریعے اسی بات کو متنازعہ بنانے کی کوشش کرتا ہے اور اب بھی وہ اپنے کام میں مگن ہے کہ کسی طرح اس ملک کے مسلمانوں کا قبلہ درست نہ ہو سکے اور یہ قوم ایک کٹی ہوئی پتنگ کی طرح دشمنوں کی چالوں کے رحم وکرم پر رہے اور بالآخر ختم ہو جائے۔معاذ اللہ۔

O دوسری بات یہ اہم ہے کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ پاکستان کا نظریہ علامہ اقبال کا فکر ہے یا لا الہ الا اللہ کی تشریح وہی معتبر ہے جو مصوّر پاکستان نے کی ہے تو اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ علامہ اقبال عقل کل ہیں اور ملک وملت کے باقی زعماء حکمت ودانائی سے خالی ہیں۔ ہرگز نہیں۔۔ علامہ اقبال نے خود بھی اپنے انگریزی خطبات کے آغاز میں یہ بات کہی ہے کہ میرے یہ خیالات

حرفِ آخر نہیں ہیں۔ حالات کے بدلنے سے اور دوسروں کے آنے سے نئے نئے گوشے کھلیں گے اور مذاکرے سے نئی راہیں بھی نکلیں گی۔

اس دعویٰ سے مراد صرف اتنی ہے کہ اس ملک میں نظریہ کے طور پر فکر اقبال کو ایک دفعہ قبول کر لیا جائے اور اسی پر عمل درآمد شروع ہو جائے تو حالات کے تقاضوں سے جو نئی بات یا ترمیم سمجھ میں آئے وہ کر لی جائے۔ نفاذ سے پہلے اتفاق کی خاطر ہم ستر سال سے خاک چھان رہے ہیں۔ حالات کا تقاضا ہے اور دیانت داری کا حاصل کہ یہ قدم اسی طور پر اٹھا لیا جائے اور اس سے اختلاف یا بہتر آراء کے لئے کوئی کونسل یا کمیٹی بنائی جائے جو ہر پانچ سال بعد بیٹھے اور مختلف 'مخازن فکر' کی رپورٹوں کی روشنی میں اپنے طریق کار کی تفصیلات میں ناگزیر تبدیلی کا فیصلہ کرتی رہے۔

O تیسری بات یہ ہے کہ علامہ اقبال کے نزدیک انسانیّت کے اس اجتماعیّت کے سفر کا نقطۂ عروج ہے حضرت محمد ﷺ کی ذات اقدس کا ظہور اور ان کا اسوہ اور بعد ازاں عملی شکل خلافت راشدہ کے نظائر کے ساتھ خلفائے راشدین کی ذاتی زندگیاں۔ یہ فرشتہ صفت لوگ اخلاق و کردار کے تو اعلیٰ نمونے تھے ہی، اپنے رہن سہن میں بھی انتہائی سادہ اور عام آدمی کی سطح کی زندگی گزارتے تھے اور درویش بادشاہوں کی مثال تھے۔ علامہ اقبال نظم 'فقر' میں فرماتے ہیں کہ اس قوم پر افسوس ہے کہ اپنے اندر سے ارب پتی لوگ تو پیدا کرے مگر کوئی درویش حکمران پیدا نہ کر سکے۔ یہ قحط الرجال یقیناً قومی و ملی سطح پر ہماری اقدار کے زوال و افلاس کی نشانی ہے۔

آہ زاں قومے کہ از پا برفتاد
میر و سُلطان زاد و درویشے نزاد

ترجمہ: افسوس ہے اس قوم پر کہ جو آزاد ہے مگر ارب پتی سردار پیدا کرے اور ایک درویش صفت حکمران پیدا نہ کرے۔ (حکمرانوں کے ساتھ آسودہ حال طبقات میں بھی یہ مثالیں ضروری ہیں)

اور ایسے ہی حکمران اور ان سے ذہنی ہم آہنگی رکھنے والی ایک انقلابی جماعت موجود ہو تو فرمایا: رُوئے ارضی کے تمام شہزادوں اور بادشاہوں اور ارب پتی لیڈروں کو ہٹا کر اس زمین کو پاک کر دیا جائے تا کہ انسانیت سکون و عافیت سے زندگی گزار سکے۔

یہ حقیقت بڑی سادہ ہے کہ آج (2015ء) کے حکمرانوں کی ذاتی دولت اوران کے سرکاری محلات وآسائشوں اوران کی ٹیم (پارلیمنٹ) کے ارکان کی ذاتی دولت ومراعات کا اندازہ لگایا جائے تو تمام روئے ارضی کے ممالک کے بجٹ کے برابر بن جائے اس پر مزید اگر ایک عالمی حکومت کا قیام عمل میں آجائے اور دنیا بھر کے دوصد ممالک کا فوجی بجٹ ختم ہوجائے ـــــ یہ مجموعی رقم بھی دنیا کے تمام ممالک کے مجموعی ترقیاتی بجٹ سے زیادہ ہوگی۔ پھر یہ ساری رقم دیانت داری سے درویش حکمران عوامی بہبود پر خرچ کریں تو چند سالوں میں حقیقی انقلاب آسکتا ہے۔ اسلام کے درویش حکمرانوں کے فلسفہ کے پس پردہ یہی راز مضمر ہے اور یہی فطری انسانی خواہش بھی ہے۔

O علامہ اقبال کا فکر جمہوریت کی خرابیوں سے ناآشنا نہیں ہے لہٰذا ان کے نزدیک پاکستان میں جمہوریت پر نگرانی کرنا ہوگی کہ وہ اپنے اندر مضمر خرابیوں سے پاک رہے۔ مغرب میں کچھ عرصہ پہلے ایک کتاب سامنے آئی ہے:

"THR DARK SIDE OF DEMOCRACY" BY MICHEAL MANN

علامہ اقبال نوے سال ـــــ پہلے ان باتوں پر توجہ دلا چکے ہیں لہٰذا مغربی افکار کو دیکھ بھال کر قبول کرنا چاہئے۔

O علامہ اقبال کے نزدیک عصر حاضر میں ایک کامیاب مسلمان ریاست کے لئے صرف نماز کا اہتمام ہی ضروری نہیں بلکہ ـــــ توحید (لا الٰہ الا اللہ) کی بنیاد پر سماجی، اقتصادی اور سیاسی سطح پر عقیدہ توحید کے مضمرات کا احساس اوران کا سختی سے نفاذ شامل ہے (تفصیلات کے لیے دیکھئے ضمیمہ ـــــ نظامِ خلافت کے خدوخال) اس کے لیے ایک جملہ میں یہ بات یوں ہے کہ سماجی سطح پر کامل مساوات، اقتصادی سطح پر سود کا خاتمہ اور سیاسی سطح پر اللہ کی حاکمیّت کا تصور شامل کرنا لازمی ہے۔ یہی بات علامہ اقبال نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں زندگی کے تجربات کا نچوڑ ـــــ 'ابلیس کی مجلس شوریٰ' نامی فرضی نظم میں کہی ہے، جو لائق توجہ ہے۔ (دیکھئے ضمیمہ)

O فکر علامہ اقبال اور حکمت اقبال کا نقطۂ ماسکہ جہاں ان کا سارا فکر مرتکز ہے وہ ان کا تصورِ خودی ہے۔ قرآن وحدیث کی تعلیمات میں 'روحِ انسانی' جسد انسانی کے ساتھ ایک علیحدہ تشخص رکھتی ہے اور اصل انسان یہی روح یا خودی ہے۔ پھر یہی خودی کا فلسفہ عملی زندگی کے ہر

شعبے میں سرایت کرے تو ایک اسلامی معاشرہ بنتا ہے۔

علامہ اقبال کا رجحان اسی لئے امام غزالی، ابن عربی اور مولانا روم کی طرف ہے اور ان کو اپنا معنوی مرشد سمجھتے ہیں۔

اس رجحان کا یہ مطلب نہیں کہ علامہ کے نزدیک امام غزالی، ابن عربی اور مولانا رومی نے جو کچھ فرمایا ہے وہ حرفِ آخر ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ روح کے علیحدہ تشخص کے اقرار سے ایک نقطۂ نظر بنتا ہے جو اسلامی معاشرے کی جان ٹھہرتا ہے اور حکمرانوں کی درویشی اور مقتدر طبقات کا اسلامی رجحان اسی اجتماعی سوچ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ خلافت راشدہ کے حکمرانوں کی سادگی بھی اسی (خودی کے) فلسفہ کے مضمرات کے ادراک کا نتیجہ تھی۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں:

؎ چوں بہ کمال می رسد فقر دلیل خسروی است
مسند کیقباد را در تہِ بوریا طلب

ترجمہ: جب فقر درجہ کمال کو پہنچتا ہے تو کیقباد جیسے بادشاہوں کے تخت فقیر کے بوریا کے نیچے ہوتے ہیں۔

O حکمت اقبال کا ایک نقطہ حضرت محمد ﷺ کی ذاتِ گرامی سے ان کے انسانیت پر، مسلمانوں پر اور ہر انسان پر احسانات کی نسبت سے قدر و منزلت کا احساس، ان کی اطاعت، ان سے وفا کیشی کا جذبہ اور ان کے فرامین کے سامنے بچھ جانے کی خواہش کے ساتھ کامل محبت کا ہونا ہے۔ ہر مسلمان کا یہ ذاتی احساس کہ حضرت محمد ﷺ اس کے بڑے مُحسن بن کے آئے ہیں علامہ اقبال اس احساس کو عشق مصطفیٰ ﷺ سے تعبیر کرتے ہیں، یہ احساس بھی خودی کے مضمرات کے ادراک سے منسلک ہے۔

'حکمت اقبال'

فکر اقبال اور حکمت اقبال کوئی علیحدہ دو چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ علامہ اقبال کے عقیدت مندوں، نیازمندوں، خوشہ چینوں اور قدر دانوں کی ایک طویل فہرست ہے ان میں سے جو اہل قلم و قرطاس ہیں انہوں نے اپنی بساط کے مطابق علامہ اقبال کے فکر اور کلام پر اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا ہے اور تصانیف کی ایک طویل فہرست ہے جو مختلف

زاویہ ہائے نگاہ اور جہتوں سے فکر اقبال پر روشنی ڈالتی ہیں۔

کسی واقعاتی چیز کا بیان اور افسانہ و ناول نگاری کا معاملہ مختلف ہے مگر عظیم مذہبی شخصیات اور آسمانی ہدایت کے حوالے سے کوئی تحریر دراصل اس بات کی غماز ہوتی ہے کہ یہ عنوان ایک بڑی حقیقت ہے اور ہر شخص اس بڑی حقیقت کو اپنے اپنے ظرف، ماحول، تربیت، ذہنی سطح اور دینی و ایمانی کیفیت کے پیمانہ سے اس موضوع پر اظہار خیال کرتا ہے۔ مثلاً سیرت النبی ﷺ پر کوئی تحریر یا کتاب لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ کی شخصیت تو اپنے محاسن و اخلاق کے اعتبار سے ایک بحر ناپیدا کنار ہے۔ اس کتاب کی تحریر کا مطلب ہے کہ مصنف اس بارے میں جو کچھ سمجھ پایا ہے وہ یہ ہے۔ کسی تفسیرِ قرآن کا مطلب بھی اتنا ہی ہے کہ قرآن مجید کے فلسفہ و حکمت میں سے اس تفسیر کا لکھنے والا جو کچھ اپنے ظرف کے مطابق سمجھا ہے وہ یہ ہے۔

اسی طرح علامہ اقبال کا کلام اور فکر چونکہ قرآنی ہے اور انہوں خود فرمایا ہے:

گر دلم آئینہ بے جوہر است ور بحرفم غیر قرآں مضمر است
پردۂ ناموس فکرم چاک کن ایں خیاباں را ز خارم پاک کن

لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ کلام اقبال پر قلم اٹھانے والے حضرات بھی اپنے اپنے ظرف کے مطابق اس چشمہ صافی سے پاکیزہ افکار کا پانی بھر کر لائے ہیں اور بس۔ یہ مطلب نہیں کہ جو کچھ کسی 'اقبالی' نے بیان کر دیا ہے وہ کلامِ اقبال کی تشریح میں حرف آخر ہے اور اس میں جو صاحب قلم علامہ اقبال سے ذاتی قرب اور زمانی قرب رکھتا ہو وہ اور زیادہ معتبر اور لائق احترام ہے۔

حکمت اقبال پر گفتگو کرتے ہوئے ہمارے لئے آسانی یہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے ابتدائی سالوں میں حکمت اقبال کو اُجاگر کرنے اور پاکستانی معاشرہ میں اس کو صحیح مقام دینے کے لیے اقبال اکیڈمی پاکستان کا ادارہ قائم کیا گیا تھا اور اس ادارہ کے تأسیسی ڈائریکٹر ڈاکٹر محمد رفیع الدین تھے جو علامہ اقبال سے اپنی نظریاتی وابستگی کی بنیاد پر اس ادارے کے لیے منتخب کیے گئے تھے۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے IDEOLOGY OF THE FUTURE نامی کتاب 1946ء میں لکھ کر پنجاب یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ مزید برآں FIRST MENIFESTO OF ISLAM، PRINCIPLES OF EDUCATION اور

'اسلام اور سائنس' نامی کتابیں لکھیں اور عالمی شہرت پائی۔ انہوں نے 1969ء میں وفات پائی ان کی آخری کتاب 'حکمت اقبال' تھی کہ اقبال کے فکر و فلسفہ کے مختلف پہلو اور خودی کے فلسفہ کا اطلاق انفرادی اور اجتماعی زندگی کے کن کن پہلوؤں پر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین کے مطابق علامہ اقبال کا کلام ایک منظّم فکر ہے اور اسلامی تعلیمات کا ایسا بیان کہ جو دور حاضر کے انسان کو مطمئن و قائل کر سکے۔ یہ کتاب پہلے لاہور سے چھپی تھی اب اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے ذیلی ادارہ تحقیقات اسلامی (فیصل مسجد) نے شائع کی ہے۔ ہم ذیل میں اس کتاب کے ابواب کے عنوانات نقل کر رہے ہیں جس سے فکر اقبال کی ہمہ گیریّت اور اس کی عالمگیر سطح پر پذیرائی کی وجہ سمجھ میں آئے گی۔

کتاب 'حکمت اقبال' کے ابواب کے عنوانات یہ ہیں:

1۔حکمت اقبال پر ایک عمومی نظر	2۔خودی کی حقیقت
3۔خودی اور تخلیق	4۔خودی اور فلسفہ تاریخ
5۔خودی اور رحمۃ للعالمین	6۔خودی اور عقل
7۔خودی اور مشاہدات قدرت	8۔خودی اور سائنس
9۔خودی اور ذکر	10۔خودی اور فلسفۂ اخلاق
11۔خودی اور آرٹ	12۔خودی کا انقلاب
13۔خودی اور نشر توحید	14۔خودی اور فلسفہ سیاست
15۔خودی اور سوشلزم	16۔خودی اور علوم مروّجہ

اشاریہ

☆ ڈاکٹر رفیع الدین نے اپنی کتاب 'حکمت اقبال' کو ان نوجوانوں سے منسوب کیا ہے جو اقبال کے شاہین، قرآن مجید کے مرد مؤمن، جدید اصطلاح میں اسلامی انقلاب کا مریڈ، درویش صفت حکمرانوں کے دست و بازو ہوں گے۔

حکمت اقبال کا انتساب

ان عاشقان جمالِ ذات کے نام
جو مستقبل کی اس ناگزیر عالمی ریاست
کا آغاز کریں گے
جو اسلام کی اس حکیمانہ توجیہ پر قائم ہوگی
جس کا نام
فلسفہ خودی ہے

☆ حاصل کلام یہ ہے کہ پاکستان ایک نظریاتی ریاست ہے۔ اس نظریاتی ریاست کے مفکر و مصور علامہ اقبال ہیں، علامہ اقبال کا کلام اس نظریہ پاکستان کی تشریح ہے (جو قرآن و حدیث اور تعلیماتِ اسلامی پر مبنی ہے) اس میں اسلامی تعلیمات کو عصر حاضر کے پس منظر (PARA DISHM) اور لہجہ میں واضح کیا گیا۔ اور علامہ اقبال کے نظریات کو یکجا فلسفیانہ انداز میں بیان کیا ہے ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے اپنی گرانمایہ تصنیف 'حکمت اقبال' جو ان کی حیاتِ مستعار کی آخری تصنیف ہے۔ اس کتاب کا انتساب قیامِ پاکستان کے مخلص کارکنوں اور اس ریاست کو نظریاتی اور عالمی ریاست بنانے والے خوش نصیب لوگوں کے نام ہے جو خداشناس ہوں، ان کی زندگیاں 'عشق مصطفیٰ ﷺ' میں ڈوبی ہوئی ہوں اور عملی زندگی دنیاوی کرّ وفر سے بے نیاز درویشی کا نمونہ ہوں، فھو المطلوب۔

شوکت سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقر جنیدؒ و بایزیدؒ تیرا جمال بے نقاب

ضمیمہ جات

- ☆ پاکستان میں نظامِ خلافت
- ☆ عالمی درویش حکمرانی کا بابرکت دور آ کر رہے گا
- ☆ اُمت مسلمہ کی عمر میں نصف دن کا اضافہ
- ☆ درویش حکمرانوں کی سیرت کا عکس (من ھو محمّد ﷺ؟)
- ☆ مثالی حکمرانی
- ☆ تقسیم ہند کا سبب کون؟ ٹائم میگزین
- ☆ ڈاکٹر محمد رفیع الدین، سوانحی خاکہ
- ☆ ابلیس کی مجلس شوریٰ، منتخب اشعار
- ☆ علامہ اقبال کا پیغام

بیسویں صدی کے آغاز سے جنوبی ایشیا میں مسلم بیداری کا منطقی تقاضا

پاکستان میں نظامِ خلافت

ڈاکٹر اسرار احمد

اس نظامِ خلافت کے لیے ظاہر ہے کہ صرف عنوان یا لیبل بدلنے کی نہیں، مکمل انقلاب کی ضرورت ہے جو صرف جانی اور مالی قربانی ہی کے ذریعے رونما ہوسکتا ہے اور جس کے لیے زبردست عوامی تحریک اور انقلابی جدوجہد کی ضرورت ہے ـــــ تاہم جب یہ انقلاب آ جائے گا اور نظامِ خلافت قائم ہو جائے گا تو اس کے نمایاں خدوخال حسب ذیل ہوں گے:

نظامِ خلافت کے خدوخال

(1) اللہ تعالیٰ کی حاکمیّت مطلقہ کا جو اِقرار ''قراردادِ مقاصد'' میں موجود ہے اس کے عملی نفاذ کے لیے قرآن اور سنت رسولؐ کی غیر مشروط اور بلا استثناء بالادستی جو نظام اور قانون دونوں پر حاوی ہوا اور اس کے ضمن میں یہ غیر مشروط اور غیر مبہم صراحت کہ جہاں قانونِ اسلامی کی تدوین نو اور اجتہاد کا عمل پارلیمنٹ یا مجلس ملّی کے ذریعے ہوگا وہاں ملک کی اعلیٰ عدالتوں کو اختیار ہوگا کہ جس قانون کو کلی یا جزوی طور پر قرآن اور سنت کی حدود سے متجاوز سمجھیں اسے کالعدم قرار دے سکیں۔

(2) مخلوط قومیّت کی نفی ـــــ جس کے نتیجے میں خلیفہ کے انتخاب اور قانون سازی کے عمل میں صرف مسلمان شریک ہوں گے۔ اور اس کے لیے ووٹ کا حق تو اگرچہ ہر بالغ مسلمان مرد اور عورت کو حاصل ہوگا لیکن انتخاب میں حصہ صرف ایسے مسلمان مرد لے سکیں گے جن کا کردار مشتبہ نہ ہو ـــــ جبکہ غیر مسلموں کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی پوری ذِمہ داری قبول کی جائے گی اور انہیں عقیدہ و عبادت کے ساتھ ساتھ پرسنل لاء میں مکمل آزادی کی ضمانت دی جائے گی۔

(3) خلیفہ کا انتخاب بلاواسطہ پورے ملک کے مسلمان کریں گے۔ اور اسے پارلیمنٹ یا مجلس ملّی یا مجلس شوریٰ کی اکثریت کا محتاج نہیں بنایا جائے گا۔ بلکہ موجودہ دنیا کے معروف صدارتی نظام کے مانند ایک متعین مدت کے لیے وسیع انتظامی اختیارات دیے جائیں گے۔

(4) صوبائی عصبیت کی لعنت کے خاتمے اور عوام کی انتظامی سہولت کے لیے صوبے چھوٹے چھوٹے بنائے جائیں گے اور انہیں زیادہ سے زیادہ سے حقوق و اختیارات دیے جائیں گے۔ اس مقصد کے لیے موجودہ کمشنریوں کو بھی صوبوں کا درجہ دیا جاسکتا ہے اور یہ بھی طے کیا جاسکتا ہے کہ دوسرے جغرافیائی، لسانی اور ثقافتی عوامل کو پیش نظر رکھتے ہوئے صوبے اس طرح تشکیل دیے جائیں کہ کسی بھی صوبے کی آبادی ایک کروڑ سے زائد نہ ہو!

(5) سود اور جوئے کے کامل انسداد کے ذریعے معیشت کی تطہیر ـــــ اور اس کی بجائے شراکت اور مضاربت کے اصولوں پر نئے تجارتی اور صنعتی ڈھانچے کی تشکیل۔

(6) حضرت عمرؓ کے اس اجتہاد کی بنیاد پر ایک بالکل نیا بندوبست اراضی کہ جو علاقے مسلمانوں نے کسی بھی وقت بزورِ شمشیر فتح کیے ان کی اراضی ''عشری'' یعنی انفرادی ملکیت نہیں، بلکہ ''خراجی'' یعنی اجتماعی ملکیت ہیں جن کے کاشتکار خواہ مسلمان ہوں خواہ غیر مسلم اسلامی حکومت کو براہ راست خراج ادا کریں گے ـــــ جس سے جاگیرداری اور غیر حاضر زمینداری کا بھی مکمل خاتمہ ہوجائے گا، اور اتنا ریونیو حاصل ہوگا کہ بہت سے ٹیکسوں سے نجات حاصل ہوجائے گی۔

(7) زکوٰۃ کی کامل تنفیذ ـــــ یعنی کل اموالِ تجارت کی مجموعی مالیت کے ڈھائی فیصد کی وصولی جس سے کفالت عامہ (SOCIAL SECURITY) کا پورا نظام ـــــ اور ہر شہری کے لیے روٹی، کپڑا اور مکان ایسی بنیادی ضروریات، اور تعلیم اور علاج کی یکساں سہولتوں کی فراہمی کی ضمانت دی جاسکے گی۔

(8) مکمل قانونی مساوات ـــــ جس میں خلیفۃ المسلمین اور مجلس ملّی یا مجلس شوریٰ کے ارکان سمیت کسی کو بھی نہ قانونی تحفظات حاصل ہوں گے نہ ترجیحی حقوق (PRIVILIGES)، اگرچہ مفاسد کے سدباب کے لیے غلط اور جھوٹے الزامات لگانے والوں کے لیے حدقذف پر قیاس کرتے ہوئے سخت تعزیری قوانین بنائے جاسکیں گے۔

(9) شراب اور دوسری نشہ آور چیزوں کے مکمل استیصال کے لیے سخت تعزیری قوانین کا نفاذ!

(10) مخلوط معاشرت کا سدباب ـــــ چنانچہ اصولی طور پر مردوں اور عورتوں کے جداگانہ دائرہ ہائے کار کی تعیین ـــــ اور عملی اعتبار سے تعلیم تربیت اور علاج معالجے کے لیے کلیتہً جداگانہ ادارے، اور ضرورت داعی ہونے پر گھریلو صنعتوں کی ترویج حتیٰ کہ ایسے صنعتی اداروں کا قیام جس میں خواتین ہی کام کریں اور خواتین ہی نگرانی کریں۔ اور ان کے اوقاتِ کار بھی مردوں کے مقابلے میں کم ہوں ـــــ مزید برآں عصمت وعفت کی حفاظت اور قلب ونظر کی پاکیزگی کے لیے ستر اور حجاب کے شرعی احکام کی سختی سے تنفیذ!

سیاست

اس کھیل میں تعیین مراتب ہے ضروری
شاطر کی عنایت سے تو فرزیں میں پیادہ
بیچارہ پیادہ تو ہے اک مہرۂ ناچیز
فرزیں سے بھی پوشیدہ ہے شاطر کا ارادہ!

علامہ اقبال

عالمی درویش حکمرانی کا بابرکت دور آ کر رہے گا

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ:

تَکُوْنُ النُّبُوَّۃُ فِیْکُمْ مَا شَاءَ اللّٰہُ اَنْ تَکُوْنَ، ثُمَّ یَرْفَعُھَا اللّٰہُ اِذَا شَاءَ اَنْ یَّرْفَعَھَا، ثُمَّ تَکُوْنُ خِلَافَۃ عَلٰی مِنْھَاجِ النُّبُوَّۃِ، فَتَکُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰہُ اَنْ تَکُوْنَ، ثُمَّ یَرْفَعُھَا اِذَا شَاءَ اَنْ یَّرْفَعَھَا، ثُمَّ تَکُوْنُ مُلْکًا عَاضًّا فَتَکُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰہُ اَنْ تَکُوْنَ، ثُمَّ یَرْفَعُھَا اِذَا شَاءَ اَنْ یَّرْفَعَھَا، ثُمَّ تَکُوْنُ مُلْکًا جَبْرِیًّا فَتَکُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰہُ اَنْ تَکُوْنَ، ثُمَّ یَرْفَعُھَا اِذَا شَاءَ اَنْ یَّرْفَعَھَا، ثُمَّ تَکُوْنُ خِلَافَۃ عَلٰی مِنْھَاجِ النُّبُوَّۃِ، ثُمَّ سَکَتَ

(رواہ احمد: عن النعمان بشیر)

’’تمہارے اندر عہد نبوت جب تک اللہ چاہے گا موجود رہے گا۔ پھر جب اللہ اسے ختم کرنا چاہے گا تو اس (عہد نبوت) کو ختم کر دے گا۔ (اس کے بعد) خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم ہوگی، جو قائم رہے گی جب تک اللہ (اسے قائم رکھنا) چاہے گا، پھر جب اللہ اسے ختم کرنا چاہے گا تو اسے ختم کر دے گا۔ پھر (اس کی جگہ) کاٹ کھانے والی بادشاہت قائم ہو جائے گی، جو جب تک اللہ چاہے گا برقرار رہے گی۔ پھر جب اسے بھی اللہ ختم کرنا چاہے گا تو ختم کر دے گا۔ پھر جابرانہ ملوکیت کا دور ہوگا، جو جب تک اللہ چاہے گا باقی رہے گا۔ پھر اللہ جب اسے بھی ختم کرنا چاہے گا تو ختم کر دے گا۔ پھر (قربِ قیامت میں درویشی کا نمونہ)

خلافت علیٰ منہاج النبوۃ

(دوبارہ) قائم ہو جائے گی۔ پھر آپؐ خاموش ہو گئے۔‘‘

اُمت مسلمہ کی عمر میں
نصف دن کا اضافہ

عَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِی وَقَّاصٍ،
أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ:

اِنِّی لَأَرْجُو أَنْ لَا تَعْجِزَ أُمَّتِی عِنْدَ رَبِّهَا أَنْ يُؤَخِّرَهُمْ نِصْفَ يَوْمٍ، قِيلَ لِسَعْدٍ: وَكَمْ نِصْفُ ذَالِكَ الْيَوْمِ؟

قَالَ: خَمْسُ مِائَةِ سَنَةٍ

(سنن ابی داود)

''حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: مجھے امید ہے کہ میری اُمت اپنے ربّ کے سامنے اتنی عاجز نہیں ہوگی کہ وہ اسے آدھے دن کی مہلت دے دے۔ حضرت سعدؓ سے پوچھا گیا یہ آدھا دن کتنا ہوگا؟ آپ نے فرمایا 500 برس۔''

درویش حکمرانوں کی سیرت کا عکس

سیّدنا محمد ﷺ کے فرمودات کی روشنی میں

من هو **محمّد** ﷺ

Who is Muhammad, peace be upon him Pray?

He is the one who defended the rights
of all humanity 1400 years ago.
هو الذى دافع عن حقوق كل البشر منذ ١٤٠٠ عام۔
He defended men's, women's and children rights
حفظ حقوق الرجال وحقوق النساء وحقوق الصغار
He commanded and fostered the
love between relatives and neighbors
أمر بالحبّ والود بين الأقارب والجيران
He established a coexistence relationship
between Muslims and Non-Muslims
وأسّس علاقة تعايش بين المسلمين وغير المسلمين
He organized the relationship between
the members of the family putting duties
on sons and daughters towards the parents
ونظم العلاقات الأسرية التى تضمن للأب
وللأم حقوق كبيرة وعظيمة على أبنائهم
He fought injustice, called for justice,
love, unity and cooperation for the good.

منع الظلم ودعا للعدل و المحبة والتكاتف والتعاون للخير

He called for helping the needy, visiting the patients,
love and exchanging advises between people.

دعا لمساعدة المحتاج وزيارة المريض
والمحبة والتناصح بين الناس

He prohibited (by orders from God) bad manners
such as stealing, lying, torturing and murdering.

منع على المسلمين المعاملات السيئة
مثل السرقة والغش والقتل والظلم

He is the one who changed our
lives and manners to be better.

انه من غير حياتنا وطباعنا السيئة الى حسنة

A Muslim doesn't steal
المسلم لا يسرق

A Muslim doesn't lie
المسلم لا يكذب

A Muslim doesn't drink alcohol.
المسلم لا يشرب الخمر

A Muslim doesn't commit adultery
المسلم لا يزنى

A Muslim doesn't cheat
المسلم لا يغش

A Muslim doesn't kill innocent people
المسلم لا يقتل الأبرياء

A Muslim doesn't harm his neighbors
المسلم لا يؤذى جارة

A Muslim obeys his parents and helps them
المسلم يبر بوالديه و يخدمهما

A Muslim is kind to young and elderly people, to women and to weak people.

المسلم يعطف على الصغار وعلى النساء وعلى الضعفاء وكبار السن

A Muslim doesn't torture humans or even animals, and does not harm trees

المسلم لا يعذب البشر ولا الحيوانات ولا يؤذى الأشجار

A Muslim loves his wife and takes care of his children and show mercy towards them until the last day of his life.

المسلم يرحم ويحب زوجته ويهتم و يعطف
على أبنائه حتى آخر يوم من عمره

A Muslim's relationship towards his children never stops even when they become adults

المسلم لا تنتهى علاقته بأولاده بعد سن الرشد أبدا

He is Muhammad (PBUH)

انه محمد رسول الله ﷺ

Did you know why all Muslims love Muhammad (PBUH)?

هل عرفتم لماذا يحب كل المسلمون محمد صلى الله عليه وسلم؟

Did you know what does Muhammad mean for Muslims?

هل عرفتم ماذا يعنى محمد ﷺ للمسلمين؟

Every Muslim loves Muhammad (peace be upon him) more than himself and more than everything in his life.

كل مسلم يحب محمد صلى الله عليه وسلم أكثر من كل شئ

ماخوذ

نیو ورلڈ آرڈر کے نیٹو ممالک کے عوام کے نام
حکمران ایسے بھی ہوتے ہیں

مثالی حکمران

امیر المؤمنین سیّدنا عمر بن خطابؓ میں شجاعت، عدل، تقویٰ اور استقامت یہ چار خوبیاں بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں۔ جن کی بنا پر آپ ایک کامیاب حکمران تھے، آپ کا نام سن کر بڑے بڑے جری بہادر بھی کانپ جاتے تھے۔ آپ کے کھانے، لباس اور رہائش میں انتہا درجہ کی سادگی تھی، سلطنت کے معاملات کو نپٹانے کے لیے کوئی تخت یا خاص مسند نہیں بنائی تھی۔ رات کو گشت اور دن کو رعایا کے حالات کا جائزہ لینا آپ کے معمول میں شامل تھا۔

ایک دفعہ کہیں تشریف لے جا رہے تھے، دیکھا کہ ایک بوڑھی عورت اپنا سامان سر پر اُٹھائے بڑی مشکل سے قدم اُٹھا رہی ہے، آپؓ نے آگے بڑھ کر اس بڑھیا کا سامان خود اُٹھا لیا اور اسے اس کے گھر تک چھوڑ آئے۔ اس نے یہ حسن سلوک دیکھ کر دعا کی کہ اللہ تمہیں عمر بن خطاب کی جگہ خلیفۃ المسلمین بنائے۔ ایک دفعہ امیر المؤمنین سیدنا عمر بن خطابؓ اپنے معمول کے مطابق گشت کر رہے تھے، ایک جھونپڑی کے پاس سے گزرتے دیکھا کہ ایک مرد جھونپڑی کے باہر بیٹھا ہے اور اندر سے ایک عورت کے کراہنے کی آواز آ رہی ہے۔ آپ صورت حال کو سمجھ گئے۔ جلدی سے اپنے گھر گئے۔ خاتون اوّل سیّدنا اُم کلثوم رضی اللہ عنہا کو صورت حال سے آگاہ کیا، وہ فوراً تیار ہو گئیں۔ کچھ کھانے پینے کا سامان ہمراہ لے لیا۔ وہاں آ کر خود اس شخص کے پاس بیٹھ گئے اور سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کو جھونپڑی کے اندر بھیج دیا۔ اس نے پہلے ہی مرحلے میں کھانا تیار کیا، تھوڑی دیر بعد بچے کے رونے کی آواز آئی تو ام کلثوم رضی اللہ عنہا نے باہر آ کر فرمایا: امیر المؤمنین اللہ نے اس خاتون کو بیٹا عطا کیا ہے، جھونپڑی والے شخص نے جب امیر المؤمنین کا نام سنا تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، اور والہانہ انداز میں پکار اُٹھا: واہ سبحان اللہ! امیر المؤمنین مجھ غریب کی کٹیا پر۔

(محمود حسن)

(بشکریہ ہفت روزہ ندائے خلافت، لاہور 20 تا 26 اکتوبر 2015ء)

تقسیم ہند کا اصل سبب کون؟

اقبال نے ہمارا متحدہ ہندوستان کا خواب چکنا چور کر دیا

جیمز رامزے میکڈونلڈ پرائم منسٹر برطانیہ

کیا اسلام کو جدیدیت کو اپنا لینا چاہیے یا اپنے بنیادی اصولوں کی طرف رجوع کرنا چاہئے؟ دو ایسے مدارس کے درمیان جو اپنے قیام کے وقت جغرافیائی لحاظ سے چند میل کے فاصلہ پر تھے، دینی نظریات کی اس چپقلش کو اس دَور میں قابل اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ لیکن اگلے 100 برس میں یہ معمولی دراڑ اسلام کو دو باہم برسر پیکار نظریات میں تقسیم کرنے والی ایسی صدا تھی جس کی بازگشت آج تک دنیا میں گونج رہی ہے۔ اس معمولی چپقلش کے ایک بحران کی صورت میں ظاہر ہونے سے پہلے مدرسہ دیوبند اور علی گڑھ یونیورسٹی کے بانی آزادیٔ ہندوستان کے مشترکہ مقصد میں شریک تھے اور تعلیمی رجحانات کے اختلاف کو نظر انداز کرتے ہوئے دونوں اداروں کے طلبہ اور عملہ بیسویں صدی کے ابتدائی دہائیوں میں برصغیر میں سامراجی حکومت کے خاتمہ کے لیے ہندوؤں کے ساتھ شامل تھے۔ لیکن قومیتی رجحانات اس کمزور اتحاد کی راہ میں حائل ہوگئے۔ ہندوستان جو مختلف ریاستوں کا ایک مجموعہ تھا اور مغل حکمرانوں کے تحت متحد ہوگیا تھا، برطانوی سامراج کے تحت تہذیبی اور مذہبی بنیادوں پر پارہ پارہ ہونے لگا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ایک ہردلعزیز مسلمان شاعر اور مفکر نے جس کا نام محمد اقبال تھا، مستقبل کے آزاد ہندوستان میں مسلم اقلیت کی حیثیت کا سوال اٹھاتے ہوئے ایک اسلامی قومیتی نظریہ کی بنیاد رکھنا شروع کی۔

اقبال جنہیں کسی دور میں اپنی نظموں کی وجہ سے ہندو مسلم اتحاد کا پیامبر سمجھا جاتا تھا، یورپ میں وقوع پذیر ہونے والے یہودی انتشار عظیم (DIASPORA) کے انجام کے بارے میں اب انتہائی متفکر نظر آنے لگے، کیونکہ ''اقبال نے عیسائی یورپ کی ثقافتی اکثریت میں یہودی وحدانیت کو پارہ پارہ ہوتے دیکھا تھا اور انہیں یہ پریشانی لاحق تھی کہ مسلمانوں کا بھی یہی انجام ہوگا ان کا خیال تھا کہ اگر

مسلمانوں نے اپنی تہذیب کو ہندی قومیّت کی بھینٹ چڑھا دیا تو آہستہ آہستہ وہ اس میں جذب ہوتے ہوئے معدوم ہو جائیں گے۔'' یہ بات پاکستان کے ادارہ مقتدرہ قومی زبان کے چیئرمین اور اقبال کی سیاسی فکر پر لکھی گئی ایک کتاب کے ایڈیٹر فتح محمد صاحب نے بیان کی۔

اقبال نے آل انڈیا مسلم لیگ کے ایک حواس باختہ اجتماع کے سامنے 29 دسمبر 1930ء کو اس صورت حال کا یہ حل رکھا کہ شمال مغربی ہندوستان میں مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل ایک آزاد ریاست ہو، ایک علیحدہ وطن جہاں مسلمانوں کا اپنا اقتدار ہو۔ اس تجویز کا ردعمل دھماکہ خیز تھا۔ اس وقت کا برطانوی وزیراعظم JAMES RAMSAY MacDONALD پکار اٹھا کہ متحدہ ہندوستان کے لیے 'ہماری تمام کاوشوں پر اقبال شاعر نے پانی پھیر دیا ہے' اگلے ہی روز TIMES OF LONDON کے اداریہ نے مشرق وسطیٰ، ایران، افغانستان اور روسی سلطنت کے سرحدی علاقوں پر مشتمل ایک متحدہ اسلامی ریاست کے منصوبہ کا چرچا کیا۔ (ٹائم میگزین 13 اگست 2007ء) (ترجمہ شہرام اقبال)

Extract from The Time Magazine dated 02 August 2007

This fracture in religious doctrine - whether Islam should embrace the modern or revert to its fundamental origins - between two schools less than a day's donkey ride apart when they were founded, was barely remarked upon at the time. But over the course of the next 100 years, that tiny crack would split Islam into two warring ideologies with repercussions that reverberate around the world to this day. Before the split manifested into crisis, however, the founders of both the Deoband and Aligarh universities shared the common goal of an independent India. Pedagogical leanings were overlooked as students and staff of both institutions joined with Hindus across the subcontinent to remove the yoke of colonial rule in the early decades of the 20th century. But nationalistic trends were pulling at the fragile alliance, and India, an unruly collection of rival states coerced into unity under Mughal rule, then again under the

British, began to splinter along ethnic and religious lines. Following World War I, a populist Muslim poet-philosopher by the name of Muhammad Iqbal began to frame the Islamic zeitgeist when he questioned the position of minority Muslims in a future, independent India.

Once called the prophet of Hindu and Muslim unity for poems espousing intercommunal unity, Iqbal became increasingly concerned with the fate of the Jewish diaspora in Europe. "Iqbal saw the solidarity of Jews crumble under the cultural majority of Christian Europe," says Fateh Mohammad Malik, chairman of Pakistan's National Language Authority and editor of a book on Iqbal's political thought. "He was worried that the same fate would befall the Muslims. He thought that if they sacrificed their culture at the altar of Indian nationhood, slowly they would be absorbed and made extinct."

The solution, Iqbal proposed to a stunned congregation of the All India Muslim League on Dec. 29, 1930, was an independent state for Muslim-majority provinces in northwestern India, a separate country where Muslims would rule themselves. The response was explosive. The then British Prime Minister, James Ramsay MacDonald, declared that "the poet Iqbal has spoiled all our efforts," to keep a united India. The next day, an editorial in the Times of London trumpeted a pan-Islamic plot to create a contiguous Muslim empire spanning the Middle East, Iran, Afghanistan and now the sensitive regions bordering the Russian empire.

حکمت بالغہ کے صفحات میں اپریل 2011ء کے شمارے میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے سوانحی خاکہ پر ایک مضمون شائع ہوا تھا جس کا تعارف مدیر حکمت بالغہ نے یوں رقم کیا تھا:

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

قارئین 'حکمت بالغہ' ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم کے نام سے نا آشنا نہیں ہیں۔ علامہ اقبال کے افکار کو جس شخص نے سب سے زیادہ سمجھا اس کے لیے زندگی وقف کر دی، اس پر لکھا اور اسے عام کیا.....وہ آپ ہی کی ذات رفیع الصفات ہے۔

قیامِ پاکستان سے پہلے دور غلامی میں جبکہ ایک طرف مغربی نظریات کا سیلاب بھی تھا اور تہذیب مغرب کا سورج نصف النہار پر تھا آپ نے نہ صرف سارے مغربی افکار کا ابطال کیا بلکہ کرۂ ارض کے لیے اسلام کے غلبے کی فکری راہ ہموار کی۔ آپ کی کتاب "IDEOLOGY OF THE FUTURE" ایک معرکہ آرا کتاب ہے۔ آپ نے تعلیم کے شعبے میں بھی کام کیا اور اسلام یعنی وحی اور قرآن سے استفادے کے لیے حقیقی انسان بننے کی ضرورت پر زور دیا جو 'خلیفة اللّٰه فی الارض' کا مصداق بن سکے۔ لہٰذا آپ کے افکار میں حقیقت انسان (WHAT IS MAN?) اور حقیقی تعلیم یعنی ISLAMIC EDUCATION کو ایک CORNER STONE کی حیثیت حاصل ہے۔ آپ کی آخری کتاب 'حکمت اقبال' ہے جو اقبال فہمی کے ساتھ ساتھ آپ کے اپنے ذہن رسا کی جولانیوں اور بلند پروازی کا ثبوت ہے۔ آپ طویل عرصہ اقبال اکیڈمی کے ڈائریکٹر رہے اور 'اسلامی تعلیم' کے نام سے رسالہ جاری فرمایا۔ آپ کے حالات زندگی پر ایک وقیع مضمون معاصر جریدہ 'اقبال' میں شائع ہوا ہے۔ ہم اسے قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لیے شائع کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

علامہ اقبال کی نظم

ابلیس کی مجلس شوریٰ

(1930ء)

منتخب اشعار

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس اُمت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشک سحرگاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے، جس پہ روشن باطن ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے!

جانتا ہوں میں یہ اُمت حامل قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندہ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے ید بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

الحذر! آئین پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے
نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیر رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف
مُنعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں!
چشم عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئین تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں
ہے یہی بہتر الٰہیات میں اُلجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں اُلجھا رہے

ہر نفس ڈرتا ہوں اس اُمت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات
مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

علامہ اقبال کا پیغام

قیامِ پاکستان سے پہلے کانگریس کا ساتھ دینے والے مسلمانوں کے نام

''مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے۔ لیکن آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں بلکہ ہمارا اوّل مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائیں۔ اس لیے میں کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہوسکتا جس کی بنیادیں انہی اصولوں پر ہوں جن پر انگریز حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتاً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے..... لیکن اگر آزادیٔ ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بھی بدتر بن جائے تو مسلمان ایسی آزادی پر ہزار لعنت بھیجتا ہے۔ ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا، بولنا، روپیہ خرچ کرنا، لاٹھیاں کھانا، جیل جانا، گولیوں کا نشانہ بننا سب کچھ حرام اور قطعی حرام سمجھتا ہوں۔''

(بشکریہ: ماہنامہ کوثر۔ اگست 2015ء، صف 44)

السلام علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم

سلام اس پر کہ جس نے بے کسوں کی دستگیری کی
سلام اس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی

سلام اس پر کہ جس کے گھر میں چاندی تھی نہ سونا تھا
سلام اس پر کہ ٹوٹا بوریا جس کا بچھونا تھا

سلام اس پر کہ جو سچائی کی خاطر دُکھ اُٹھاتا تھا
سلام اس پر کہ جو بھوکا رہ کر اوروں کو کھلاتا تھا

سلام اس پر جو اُمت کے لیے راتوں کو روتا تھا
سلام اس پر جو فرشِ خاک پر جاڑوں میں سوتا تھا

سلام اس پر جو دنیا کے لیے رحمت ہی رحمت ہے
سلام اس پر کہ جس کی ذات فخر آدمیّت ہے

سلام اس ذات پر جس کے پریشاں حال دیوانے
سنا سکتے ہیں اب بھی خالدؓ و حیدرؓ کے افسانے

درود اس پر کہ جو تھا صدرِ محفل پاکبازوں میں
درود اس پر کہ جس کا نام لیتے ہیں نمازوں میں

(ماہرالقادری)

فرمانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

أَنَا

خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ

لَا نَبِيَّ بَعْدِی

میں

آخری نبی ہوں

میرے بعد

کوئی نبی نہیں ہوگا

(ترمذی)

درویشی کی حکمرانی

سیّدنا حضرت محمد ﷺ کی سیرت کا وہ سنہرا باب۔
جس کی دھول کو بھی ایران، یونان اور روم کے حکمران نہ پہنچ سکے

قدموں میں ڈھیر اشرفیوں کا لگا ہوا
اور تین دن سے پیٹ پر پتھر بندھا ہوا
ہیں دوسروں کے واسطے سیم و زر و گہر
اپنا یہ حال ہے کہ چولہا بجھا ہوا
کسریٰ کا تاج روندنے کو پاؤں کے تلے
اور بوریا کھجور کا گھر میں بچھا ہوا
دست دعا انہی کے لیے عرش تک بلند
ہے جن کی آستین میں خنجر چھپا ہوا
بوتے رہے جو رستے میں کانٹے تمام عمر
پھولوں میں ایک ایک ہے آ کر تلا ہوا
احسان کی نوید سپید و سیاہ کو
سب کے لیے ہے دریچۂ رحمت کھلا ہوا
جن کے یہ سارے کام ہیں اللہ کے لیے
پھر کیوں نہ سب سے رُتبہ ہو ان کا بڑھا ہوا

مولانا ظفر علی خان